

چونکاوے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈاکٹر ڈائجسٹ  
کراچی

نیا سال مبارک

جنوری 2013



# نیا سال مبارک

عمران قریشی

لگام

16

نفسیاتی لوگ دوسروں کی باتیں نہ کر  
ذمہ دہور ہو جاتے ہیں۔ ایک حقیقی کہانی

ایس امتیاز احمد

جنات کا مہبان

37

اچھی کہانیوں کے حاشا ہاؤن لوگوں کے  
لئے بہت ہی اچھی اور دلچسپ کہانی

ساجدہ راجہ

انجام

45

ایک حیرت انگیز دل کھلا ہر بہت کرتی حقیقی  
کہانی ہے پڑھنے والے میں کشش کے

اقصیٰ رباب

خودی کا قاتل

53

جاہت ظلم اور دل کی ایک دلچسپ کہانی  
مؤلفی داستان اہل دل کے لئے سوغات

اسے وحید

رولوکا

58

وہ اچھی ہمارے دل کا ایک تھا اس کی حیرت انگیز  
کہانی ہے پڑھنے والے میں کشش کے

شائستہ نحر

بھینک سزا

81

حس و معش کے حاشا لوگ اکثر عبرت کا  
نشان بن جاتے ہیں۔ ایک سبق آموز کہانی

ایس حبیب خان

خونی جوکر

85

کیا یہ ممکن ہے؟ ایک دل کھلا حقیقت  
پڑھنے والے نگہ نہ جا سکیں گے

محمد وارث آصف

آسیبی معمر

93

خوف و ہراس پھیلائی جسم و جاں پر کھلی  
طاری کرتی ناقابل فراموش دلچسپ کہانی

صفدر شاہین

روح بیتی

100

دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی رات کے  
پہلوں میں اچھی حیرت انگیز کہانی

فرید شہزاد

بدروح بیکر

125

نفسیاتی خلیات کے خداوند لکھا کہانی  
عبرت بن جاتے ہیں کہانی میں موجود ہے

ایم اے راحت

سنہری تابوت

130

شاہکار کہانیوں کے حاشا لوگوں کے لئے  
اچھی ہے ذاتی حیرت انگیز اور حیرت انگیز کہانی

محمد عثمان علی

مغرور

153

کیا یہ حقیقت ہے کہ بلندیوں پر صرف خدا  
کی ذات پہنچاتی ہے۔ ایک سبق آموز کہانی

شہاب شح

تابوت

159

ایک نادرہ قوت کی عبرت کا داستان، جسے  
پڑھنے والے خوشی سے میں کشش کے

نظارت لھر

نقشہ

169

کلام الہی بہت زیادہ پرتا ہوتا ہے جس  
کا حقیقی مشاہدہ اس کہانی میں موجود ہے

علی کاشف آفاقی

برندرامورتی

176

کالی دنیا کی ناقابل یقین خونی ڈرامائی کہانی  
بہت کئی لڑکیاں لڑکھڑکھتے حیرت انگیز کہانی

اسرارہ نوشین

ڈر

189

ذہن پر سکوت اور اچھے میں ڈالنی ہوئی  
ناقابل یقین حیرت انگیز اور حیرت انگیز کہانی

ایم الیاس

بلیک ٹائیگر

192

تجسس اور سسٹمز سے ہمراہ واقعات جو  
پڑھنے والوں کو دلچسپت میں ڈال دیں گے

ادارہ

قوس قزح

218

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین  
بڑے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔۔۔

عالم ملک

ذرا سی بات

225

لفظ لفظ سطر سطر دماغ کو ماؤف کرتی اور لڑکا  
پر اندام کرتی انوکھی اور حقیقی کہانی۔۔۔

شہزادہ چاند زیب عباسی

پہاڑی کے جن

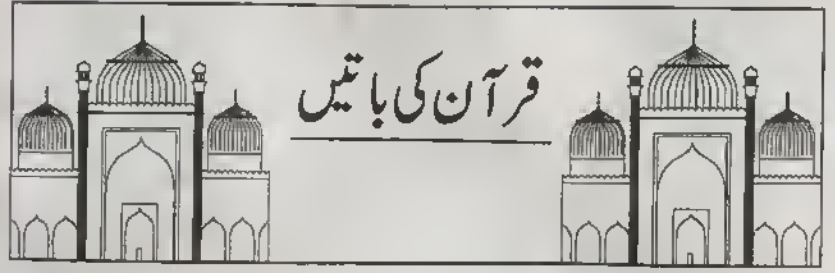
232

خود غرضی کے لباس میں لپٹی ہوئی ایک  
انوکھی خراش کا دردناک اور بے پناہ انجام

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو وارڈ بازار کراچی: 32744391

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس ٹاپو رور وڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

## قرآن کی باتیں



☆ اے نبی کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں، جو تمہاری اس بستی (یعنی مکہ) سے بہت زیادہ زور آور تھیں، جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا۔ (سورۃ فتح 48 آیت 13)

☆ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے کیا سلوک کیا اونچے ستونوں والے عاوارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور شمو کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ اور خیموں اور یمنوں والے فرعون کے ساتھ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ بے شک تمہارا رب ناک میں ہے۔ (سورۃ فجر 89 آیت 6 سے 14)

☆ اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کی نعمتوں کا کفران کرنے والی یعنی ناشکرا ہے۔ اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت یعنی فراخ وقتی کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو ان کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے فری سے بات کہہ دیا کرو اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گروں ہی بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو کہ کسی کو کچھ دینی نہیں اور نہ بالکل کھول ہی دو کہ کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ ملامت زدہ اور در ماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 26 سے 29)

☆ اور جب کوئی چیز ماپ کر دینے لگے تو پیانہ پورا بھرا کر وادار جب تول کر دو تو تراز و سیدھی رکھ کر تول کر دو۔ یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 35)

☆ رات کی قسم جب (دن کو) چھپا لے۔ اور دن کی قسم جب چمک اٹھے۔ اور اس (ذات) کی قسم جس نے نر اور مادہ پیدا کئے۔ کہ تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔ (سورۃ لیل 92 آیت 1 سے 4)

☆ آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات (کی تاریکی) کی جب چھا جائے۔ (اے محمد) تمہارے رب نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ (سورۃ غیٰ 93 آیت 1 سے 3)

☆ انجیر کی قسم اور زیتون کی۔ اور طور سینین کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ تین 95 آیت 1 سے 4)

☆ ان سریت دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں پھر پتھروں پر نعل مار کر آگ نکالتے ہیں پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔ پھر اس میں گرد اٹھاتے ہیں پھر اس وقت (دشمن کی) فوج میں جا گھستے ہیں۔

☆ کہ انسان اپنے رب کا احسان ناشکرا ہے (سورۃ عادیات 100-1 سے 6)

☆ عصر کی قسم۔ کہ انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ (سورۃ عصر 103 آیت 1 سے 3)

☆ اور اگر سفر پر ہو اور (دستاویز) لکھنے والا نڈل سکے تو کوئی چیز رہن باقی نہ رکھ کر قرض لے لو اور اگر کوئی کسی کو امانت سمجھے یعنی رہن کے بغیر قرض دے دے تو امانت دار کو چاہئے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کر دے۔ اور اللہ ہے جو اس کا رب ہے، ڈرے اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا جو اس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 283)

☆ اور اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے۔ کہ اگر تم اس کے پاس (روپوں کا) ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو فوراً واپس دے دے اور کوئی اس طرح کا ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیدوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ اللہ پر محض جھوٹ بولتے ہیں اور اس بات کو جانتے بھی ہیں۔

☆ (سورۃ آل عمران 3 آیت 75)

☆ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ مستن (اور) دیکھتا ہے۔

☆ (سورۃ نساء 4 آیت 58)

☆ اے اہل ایمان! کفار کے مقابلے میں ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور مورچوں پر جتے رہو۔ اور اللہ سے ڈرو تاکہ مراد حاصل کرو۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 200)

☆ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔ یہی اہل جنت ہیں کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔ (سورۃ احقاف 46 آیت 13 سے 14)

☆ (کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بشکریہ شیخ بک ابجینی کراچی)



**ایس حبیب خان** کراچی سے، امید ہے کہ سب اللہ کے حکم سے خیریت سے ہوں گے، دسمبر 2012ء کا شمار گذرے سال کو اوداع کہتے ہوئے اپنے اوداع میں تارکین کی دلچسپیوں کے تمام انداز سونے ہوئے ملا۔ ٹاکل کافی اچھا لگا۔ خطوط کی محفل میں تعریف و تہنید سے بھرپور خطوط پڑھے۔ کہانیوں میں انشاء رمضان کی "حلو" لا جواب تحریر تھی، جس نے آخر تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھا، ناصر محمود ہادی "سپرائز" کا "منشی خیر تھی، احسان عمر کی "خواب" بھی اچھی لگی، "ساوی کا بھوت" ایس امتیاز احمد کی بیسٹ کی طرح شاندار تحریر تھی، "محافظ" بہت خوب صورت تحریر تھی، "تاہوت کہانی" میں تبس آفری لائن تک برقرار تھا۔ "موت کا راز" معمول سے بہت کرا لگ انداز لئے بہترین تحریر تھی۔ کہانی کے علاوہ ڈراما بجٹ اور اس کے پڑنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے "نیا سال مبارک!" دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ارض اور اس کے رہنے والوں پر رحم کرے، اللہ تعالیٰ میرے ملک کو اندرونی و بیرونی دشمنوں سے بچائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، تمام راسخ اور ڈر کے پڑھنے والوں کی اللہ تعالیٰ ہر جائز حاجت پوری کرے اور ڈراما بجٹ کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔ (آمین)

☆ ایس صاحب: دل کی گہرائی اور قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور ڈر سے واسطہ تمام تارکین کے لئے دعا یہ کلمات کے لئے بہت بہت شکریہ آپ کو بھی نیا عید سال مبارک ہوا، اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

**بلقیس خان** پشاور سے، السلام علیکم، امید ہے کہ آپ خیر خیریت سے ہوں گے، اس ماہ دسمبر کا ڈراما بجٹ 23 نومبر کو ملا۔ ٹاکل بہت اچھا تھا، کہانیوں میں تینوں قسط وادریروں نے زبردست مقابلہ کیا۔ میرا خط شامل اشاعت تھا۔ دیکھ کر خوش ہوئی اور اپنے کالج کی فرینڈز کو بھی دکھایا۔ کالج میں، میں نے ڈراما کو نوڈس کرایا اور فرینڈز سے وعدہ لیا کہ وہ ضرور ڈراما کو اسٹیج کریں اور باقاعدگی سے ڈرامہ خریدیں گی۔ اس ماہ مکمل طور پر زبردست تھا۔ اس خط کے سوا اپنی کہانی دیوٹی بھیج رہی ہو۔ دن رات کی محنت سے لکھی ہے اور موضوع کے لحاظ سے ڈراما کا موضوع چنا ہے۔ پلیز اگر کہانی میااری اور اچھی لگے تو ضرور قریبی شمارے میں جگہ دے کر منظر فرمائیے گا۔

☆ بلقیس صاحبہ: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف خط لکھنے کے ساتھ ہی کہانی بھیجنے کے لئے دیری دیری نہیں۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو آئندہ شمارے میں شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی تجویز میرا خط ارسال کر کے شکریہ کا موقع دیں گی۔

**فائزہ رحمتی** سالارنگ سے، السلام علیکم، کافی عرصہ سے ہم ڈراما بجٹ کے تارکین میں سے ہیں، لیکن کچھ لکھنے کی جرات پہلی بار کی ہے، میں بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں، اگر آپ نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی لکھتی رہوں گی۔ اکتوبر کے شمارے میں چھپنے والی کہانی "بھول بھلیاں" ایک اچھی تحریر تھی اس کہانی میں رائٹر کی محنت نظر آ رہی تھی۔ ردو کا اے دن جاری ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ڈراما بجٹ ون گئی رات آجھی مٹی ترقی کرے۔ ہماری طرف سے ڈر کے تمام اشاف اور تمام تارکین کو سلام۔

☆ فائزہ صاحبہ: ڈراما بجٹ میں موسٹ ویکم، چلتے حوصلہ افزائی ہوگی اور تو فی امید ہے کہ آپ حسب وعدہ آئندہ بھی خط میں اپنی رائے کا اظہار برائے ڈراما بجٹ کرتی رہیں گی۔

**شگفتہ حسین** کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں کہ ڈراما پورا اشاف بخیر وعافیت ہوگا اور ڈر کے سارے پڑھنے اور لکھنے والے اچھے خیریت سے ہوں گے دسمبر کا شمارے دیکھ کر ڈری مئے کیونکہ ٹاکل واقعی ڈراما پورا تھا اور کہانیوں کا تو کیا کہنا، لا جواب ہے مثال دہاں ہے۔ ایک بات تو میں بھول گئی تھی، تمام لوگوں کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ اور اللہ سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ہمارے ملک اور ہمارے لئے بہت سی خوشیاں لے کر آئے اور آخر میں ڈر کے لئے ڈھیروں دعا میں۔ اللہ حافظ۔

☆ شگفتہ صاحبہ: آپ کو بھی نیا عید سال مبارک ہو، خلوص بھر اخط پڑھ کر دی خوشی ہوئی، آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

**کائنات بلوچ** کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈراما پورا اشاف خیریت سے ہوگا، سب سے پہلے تو میری طرف سے ڈر کے پورے اشاف، رائٹر اور تمام پڑھنے والوں کو Happy New Year اس ماہ کا ٹاکل پہلے کی نسبت اچھا تھا۔ سب سے پہلے

قرآنی باتیں پڑھیں جنہیں پڑھ کر دل کو سکون ملا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف بنا اور خطوط میں اسماہ نوشین کا خط پڑھا جس میں سب کے لئے دعا میں بہت خوشی ہوئی کہ آج بھی اسماہ نوشین جیسے لوگوں کو دوسروں کو خوش دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے تو میں نے اپنی پسندیدہ کہانی "سنہری تاہوت" پڑھی جو کہ اچھی لگی۔ بقیہ کہانیوں میں مجھے اقصیٰ رباب کی "موت کے رنگ" اور بارمضان کی "محافظ" بہت بہت پسند آئیں، میں اقصیٰ رباب اور بارمضان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں میں نے انہیں دیکھا تو انہیں ہے پڑھنے ان سے ایک اچھی طرح کا لگاؤ ہو گیا ہے۔ اب باتیں بہت ہو گئیں۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی آخر میں سب کے لئے ڈھیروں دعا میں۔ اللہ حافظ۔

☆ کائنات صاحبہ: آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو، اچھے دل کے مالک لوگ ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھتے ہیں اور دوسروں کی خیر خواہی میں رہتے ہیں۔ لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط ارسال کریں گی اس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

**عائشہ ارما** پشاور سے، السلام علیکم، دسمبر کا ڈراما بجٹ 20 تاریخ کو سکینل سے خرید، دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کہانیوں میں سنہری تاہوت اور بلیک ناگلر ہمیشہ کی طرح ٹھیک لگیں۔ ردو کا بھی اچھی تھی۔ "محافظ" بارمضان کی واقعی سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔ "خونی روح" شہزادہ اعجاز کی بہت زبردست تھی۔ مجھے زبانی بھی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ساجدہ راجہ انشاء رمضان، اقصیٰ رباب، شریلا تصور کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ناصر محمود ہادی عصمت پر دین و عاصم ملک، صفدر شاہین، ایس امتیاز احمد، عبدالحمید ساگر، راجندر سنگھ بیدی، احسان عمر اور عدنان علی کی بھی بہت پسند آئیں۔ تمام کہانیوں کو پڑھ کر بہت حراہ ایک طویل عرصہ سے میں بارمضان کی تلاش میں تھی اور مجھے وہ ڈر کی صورت میں مل گئیں۔ "ہار" میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے اور حوصلہ افزائی کی امید بھی ہے۔ خیر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈراما بجٹ کو دل گئی اور رات چوٹی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ عائشہ صاحبہ: ڈراما بجٹ میں خوش آمدید، قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی باندی سے خط لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کیجئے، آپ کی بہن کا بھی شکریہ کہ انہیں بھی ڈر کی کہانیاں پسند آتی ہیں۔ Thanks۔

**زاهدہ عطا محمد** کراچی سے، امید کرتی ہوں ڈراما پورا اشاف بخیر وعافیت سے ہوگا۔ میری طرف سے تمام تارکین کو نیا سال بہت بہت مبارک ہوں۔ اللہ تعالیٰ اشاف سیت تمام پڑھنے اور لکھنے والوں کو خوش و خرم رکھے۔ اس ماہ کا ٹاکل بہت اچھا لگا۔ قسط وار کہانیوں میں سب سے پہلے "سنہری تاہوت" پڑھی اس سرجہ کی قسط کچھ کام نہیں تھی اور بقیہ کہانیوں میں جو مجھے پسند آئیں ردو کا موت کے رنگ، خونی روح، حلو، ہولناک رات، محافظ، لا حاصل تنہا اور خواب بہت ہی زبردست کہانیاں تھیں اور میں نے بھی ایک غزل لکھی جو بھیج رہی ہوں، اگر اشاعت کے قابل ہوئی تو اسے تھوڑی سی جگہ دے دینا۔ آخر میں ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ زاہدہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آپ کو اور آپ کے تمام قلبی رشتوں کو بھی نیا سال مبارک ہو۔

**فاریہ تبسم** ٹھیکہ موڈ تصور سے، ڈر کے تمام تارکین کو میری طرف سے بہت بہت سلام اور نئے سال 2013ء کی بے شمار خوشیاں مبارک ہو، دسمبر کا شمارے دیکھ کر دلچسپی اور زبردست تھا۔ قرآن کی باتیں ایمان افروز تھیں۔ خطوط میں اسماہ نوشین کا بہت بہت شکریہ یاد رکھئے کہ اس کے بعد دیگر دوستوں کے خط پڑھے نئے دوستوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ غلام نبی نوری، بلقیس خان، کائنات بلوچ، ساجدہ راجہ، زاہدہ عطا محمد، آستہ صاحبہ اور اسلم جاوید کا خط دیکھ کر اچھا لگا۔ اپنی دوستوں انشاء رمضان، اقصیٰ رباب اور انوری رمضان کا خط نہ دیکھ کر دکھ ہوا، پلیز کم یک کم ڈر، کہانیاں تمام میں زبردست تھیں۔

☆ فاریہ صاحبہ: تجریریا لگ لگ کاغذ پر سال کیا کریں، اس وجہ سے آپ کی غزل شائع ہونے سے رہ گئی، امید ہے آئندہ خیال رکھیں گی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

**صدف حسین** کراچی سے، امید کرتی ہوں ڈراما پورا اشاف خیریت سے ہوگا۔ ایک ماہ کی غیر حاضری کے لئے V.sorry اس کی وجہ یہ رہی کہ ڈر بہت لیٹ ملا، جلدی پڑھ نہ سکی، کہانیوں پر تبصرہ بھی رہ گیا۔ اسی خط بھی نہ لکھ سکی، اس ماہ کا ٹاکل بہت Attractive تھا، پورے اشاف پر نظر میں صرف ڈر پر ہی آکر ٹھہر گئیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف "خونی روح" بہت زبردست تھی، رائٹر کو میری طرف سے مبارکباد سا دیکھی کا بھوت، محافظ، موت کا راز، تاہوت کہانی، احسان فراموش، یہ کہانیاں مجھے

اچھی لکھ، اشعار کی محفل میں غلام نبی نوری، محمود الحسن، پروفیسر واجد گنگوئی، احسان رحمان و شرف الدین کی شاعری بھی اچھی لگی۔ آخر میں ڈر کے لئے ڈیروں دعا کریں۔

☆ صدف صاحبہ: سوری کے بعد اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ سے پابندی وقت کا ضرور خیال رکھیں گی، اور دلی تجزیہ کے ساتھ خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔

محسن علی: جنت ساہیوال سے، امید کرتا ہوں ڈرڈائجسٹ کا پورا اشاف باخیریت ہوگا۔ ڈرڈائجسٹ میں اس ماہ اپنا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئی، سب کو دکھایا، دل کر رہا تھا کہ تمام رسالہ اس ماہ کا خود ہی خرید لوں، لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ اس لئے چند رسالے خرید لئے اور اپنے دوستوں کو دینے تاکہ پڑھیں، میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا کہ اگر میں اپنی کہانی ارسال کروں تو کیا اس کو آپ شامل اشاعت کریں گے یا نہیں مگر آپ نے جواب نہیں دیا۔ پہلے کوئی بات نہیں مگر میں ایک کہانی جو میری خود نوشت ہے ارسال کر رہا ہوں، اس کی اصلاح آپ کے ذمے دراصل میرا امتحان 23 فروری کو ہے۔ کامیابی کی دعا کے لئے درخواست ہے۔ کسی بھی رسالے میں میری پہلی کہانی اور پہلا خط ہے، امید ہے شائع کر کے حاصل افزائی کریں گے۔ اب بات کرتے ہیں ماہ دسمبر 2012ء کے شمارے کی توبہ سے بیسٹ روڈ کا سیکڑ موت کا راز، قمر ڈیما قلمی باقی رسالہ بھی اچھا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ڈرڈائجسٹ کو دن رات چوٹی ترقی عطا فرمائے اور اس طرح ہمیشہ شاد رہے۔

☆ محسن صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ اپنی کہانی بعد شوق ارسال کریں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

راجہ باسط مظہر: حادہ تھکی سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں ہر بار کی طرح اس بار بھی ڈرڈائجسٹ کا پورا اشاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ پچھلے ماہ نومبر کا شمارہ کچھ مصروفیات میں اضافے کی وجہ سے نہ پڑھ سکا۔ اور پھر میرے فائل امتحانات شروع ہو گئے جو کہ ماہ دسمبر کی 5 تاریخ کو ختم ہوئے جن کی وجہ سے میں اپنا پیسہ شمارہ ڈرڈائجسٹ پڑھنے سے محروم ہو گیا۔ اس بار وقت کی کمی کی وجہ سے ایک عدد کہانی شمر، غزل، پیچیز، رہا ہوں، امید کرتا ہوں شائع کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے اور آخر میں ڈرڈائجسٹ پوری ٹیم کو ڈیروں دعا کریں۔

☆ باسط صاحب: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی عطا کرے اور خوشیوں سے نوازے، کہانی اچھی پڑی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد: کراچی سے، امید ہے حراج کرامی بخیر ہوگا، ماہ دسمبر 2012ء کا شمارہ سامنے ہے۔ خوب صورت ناسل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا۔ آرٹیکل لگانے کا شکریہ۔ آپ کے پاس مزید تحریروں موجود ہیں۔ ”پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں آپ کو اور دیگر اشاف اور ”ڈرڈائجسٹ“ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دیورڈو کا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆ امتیاز صاحب: کہانی شامل اشاعت ہے، آپ کی دیگر تحریروں بھی موصول ہو چکی ہیں جو کہ آئندہ شمارے میں منسلک ہوگی، غلوں نامہ کا شدت سے انتظار ہے۔

سید عبادت علی: ذریعہ اسامیل خان سے، پہلی مرتبہ ڈرڈائجسٹ کی محفل میں شریک محفل ہوں، امید ہے کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ 2012ء کے شروع میں ڈرڈائجسٹ شروع کیا اور بہت اچھا لگا۔ ”سنہری تابوت“ نے دل سوا لیا باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں، خواب، موت کے رنگ، گمشدہ مسافر، خون آشام بھی بہترین کہانیاں تھیں، پہلے بھی آپ کو ایک خط ارسال کیا لیکن شائع نہیں کیا اور کیا میں بھی کہانیاں لکھ سکتا ہوں۔ مجھے شاعری سے بہت لگاؤ ہے کیسا میں اپنی شاعری ارسال کر سکتا ہوں۔

☆ عبادت صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، اس سے پہلے آپ کا خط موصول نہیں ہوا، آپ اپنی کہانی اور شاعری بعد شوق ارسال کر سکتے ہیں۔ امید ہے آئندہ ماہ آپ اپنی تحریروں ضرور بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد وارث آصف: واں پھر اس سے، السلام علیکم، ڈرڈائجسٹ سے میرا لگاؤ 2008ء سے ہے۔ میری پہلی کہانی اگست 2011ء میں پراسرار دیوتا کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے لکھنے کا بہت کم تاثر ملا۔ مگر پھر بھی تاثر نکال کر اب میں دوبارہ آپ کی خدمت میں دو عدد کہانیاں بنام ”مشت زائے اور آسبی معرہ“ کے نام سے لے کر حاضر ہوں۔ مذکورہ کہانیاں میری کافی محنت کا

شریں، امید ہے کہ جلد از جلد شائع کر کے شکریہ کا موقع دوبارہ بھی عنایت کریں گے۔ کہانیاں میں شاید کئی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اب ان غلطیوں کی اصلاح کرنا ادارے کا حق بنتا ہے۔ امید ہے کہ ادارہ فوٹو اڈا کرے گا۔ امید ہے کہ آپ لوگ دیکھ کریں گے۔ مزید ادارے کی ترقی کے لئے دن رات دعا گو ہوں۔

☆ وارث صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانی شامل اشاعت ہے، خوش ہو جائیے، اب قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی وقت نکال کر ڈرڈائجسٹ میں اپنی تحریروں ضرور ارسال کرتے رہیں گے۔ شکریہ۔

عثمان غنی: پشاور سے، السلام علیکم، ڈرڈائجسٹ نومبر کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا، ناسل بہت شاندار تھا۔ اس ماہ روڈ کا اچھی رہی۔ بلیک ٹائیگر زبردست انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ سنہری تابوت، زبردست موڈ پر آگئی ہے۔ خونی روح، شہزادہ چاند زیب کی کہانی نے ابتدائی صفحات کی کہانی کا قاف ادا کر دیا۔ سپر مارکیٹ، ناصر محمود و فرہادی کی کہانی بہت خوب صورت رہی۔ لا حاصل تمنا، ساجدہ راجا زبردست سادگی کا بیعت، ایس اتیاز احمد کی اسٹوری بہت اثر انگیز تھی، ہولناک رات کی کہانی اچھی اور معیاری رہی۔ تابوت کہانی، حاصر ملک کی خوب صورتی سے لکھی ہوئی کہانی تھی۔ احسان فراموش، بس گزارے لائق تھی۔ موت کا راز کی سمجھ نہیں آئی، خطوط انشائیں رمضان کی مصر کے تاریخی کہانی متاثر کن رہی۔ خواب احسان صحر زبردست، یہ بھی مصر کے سر زمین کی زبردست کہانی تھی۔ محافظ صبا رمضان کی کہانی نے واقعی اللہ تعالیٰ کی یاد دلا دی۔ حیرت انگیز عدنان علی کی کہانی اثر عبرت رہی۔ گمشدہ مسافر سیر و تقریر کے لحاظ سے زبردست اور خوب صورت کہانی تھی، جبر کا شمارہ ہر لحاظ سے زبردست، نفاست اور خوب صورت تھا۔

☆ عثمان صاحب: لکھنے اور کہانوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے آپ کی کہانی اگلے ماہ شائع ہو، اور قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خط ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

قدیر وانا: راولپنڈی سے، دسمبر کا ڈرڈائجسٹ دیکھ کر خوشی ہوئی، تمام تحریروں زبردست ہیں، ایک عدد غزل ارسال ہے۔ اگر معیاری ہو تو اگلی اشاعت میں جگہ دے کر شکور فرمائیں۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ قدیر صاحب: خط کے ساتھ غزل بھیجے گا شکریہ، آئندہ ماہ بھی غلوں نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

احسان سحر: سیالکوٹی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں ڈرڈائجسٹ کا تمام اشاف اور اس کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے۔ سال کا آخری خط جلد ہی مل گیا ناسل اچھا لگا، سب سے پہلے بات کی جائے قرآن مجید کی باتیں پہلے ہی پڑھتا ہوں اور من روشن کرتا ہوں پھر خطوط میں کئے سب اچھے لگے۔ اشارت میں سب سے پہلے ڈرڈائجسٹ کے تمام ممبروں کو نئے سال کی مبارکباد۔ پہلی اسٹوری کا آغاز ہوا خونی روح اچھی تحریر تھی پلاٹ بھی اچھا اور لفظوں کا چناؤ بھی مناسب تھا۔ لا حاصل تمنا اچھی لگی۔ روڈ کا اور روشنی کا اختتام اور غزل ڈگر پر گامزن ویلڈن، ہولناک رات، موت کا راز، گزارہ رہی، ایس امتیاز احمد صاحب آپ کا تاریخی کرتے ہیں ہر ماہ اس ماہ بھی آپ بیسٹ رہے۔ خط مصر کے حوالے سے اچھی کاوش تھی۔ سنہری تابوت میں راحت صاحب واقعات کو صحیح طرح واضح نہیں کر رہے۔ محافظ اس ماہ کی بیسٹ تحریر رہی دوسروں کی مدد کو دس دیتی ہے چاہے وہ خیر ہو یا فقر گز۔ بلیک ٹائیگر کو ایسے ہی ربڑ کی طرح کھینچے جا رہے ہیں اور اپنے ڈگر سے ہٹ چکی ہے۔

☆ احسان صاحب: قبل لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانوں پر تہرہ کے لئے شکریہ اور آپ کی بار بار کہانی کا شدت سے انتظار ہے، امید ہے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

منیسو احمد: ساغور میاں جنوں سے، امید ہے کہ سارا اشاف خیریت سے ہوگا، اس ماہ کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ ناسل پہلے کی طرح لا جواب ہے۔ قرآن کی باتیں بھی بہت اچھی تھیں۔ تاریخی کہانی نہ دیکھ کر افسوس ہوا۔ امید ہے کہ آپ ہماری دلی تسکین کے لئے ضرور سوچیں گے۔ بقیہ کہانیاں پہلے کی طرح بیسٹ ہیں۔ روڈ کا حسب توقع نمبروں۔ ٹائیگر کی نئی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ خطوط کی محفل میں غیر حاضری ہوئی۔ جس کے لئے معذرت۔ آئندہ کوشش ہوگی کہ وقت سے پہلے خطوط کی محفل میں حاضری دے دیا کروں اور لانا قوس و قزح میں سب دوستوں کی شاعری اچھی تھی۔ جن کے کلام زیادہ پسند آئے۔ حکیم خان حکیم، ایس امتیاز احمد، سنیل ماین ط، نوری رمضان اور انتخاب میں راجہ باسط مظہر، قادیہ تبسم کے کلام اچھے تھے، جن دوستوں نے یاد رکھا اور میری شاعری پسند کی ان کا بے حد شکریہ، آصف شہزاد الہ آبادی، بشیر احمد پرویز جنڈاوالہ، ظفر اقبال کا بھی مشکور جو ہر بار مجھے یاد رکھتے ہیں۔ جن



دوستوں نے یادیں کیا ان کا بھی شکریہ۔ میری نئی شاعری حاضر ہے۔ امید ہے کہ شائع کر کے شکر یہ کا موقع دیں گے۔ اگلے شمارے میں پھر اوقات ہوگی۔

☆ ☆ منیر صاحب: ڈرڈا انجسٹ کو یاد کرنے پر شکریہ، امید ہے اب حسب وعدہ ہر ماہ ضرور خطوط کی محفل میں شامل ہوتے رہیں گے۔ اس کے لئے شکریہ۔

**محمد مشتاق ساغر** : نکاح صاحب سے، السلام علیکم و السلام الفتح کے بعد تم کو خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت کے متعلق ہیں اور ہم دعا گو ہیں کہ ڈر کے تمام اسٹاف اور قارئین کرام خیریت سے ہوں گے، ہماری طرف سے تمام اہل دل بہن بھائیوں کو دینی سلام قبول ہو اور پورے ڈر کے اسٹاف کو بھائیوں بھرا سلام قبول ہو، بڑی لمبی غیر حاضری کے بعد ڈر کے خطوط کی محفل میں حاضر خدمت ہوں ہمارا رابطہ صرف خطوط سے نہیں تھا یہ تو ڈر ہماری جان ہے، 2000ء سے لے کر اب تک کوئی ایسا شمارہ نہیں جوس کیا ہو ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو کامیابی عطا فرمائے۔ ہر سال کی طرح اس سنے سال کو یکم جنوری 2013ء کو مجھے ڈر کی خوشی ملے گی کیونکہ میری اور میری بیٹی کی سالگرہ ایک ہی دن ہے۔ یہ دن اب میرے لئے خوشیوں سے بھرا ہوتا ہے جس طرح ہم لوگ خوش ہیں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پاکستانی کو خوشی عطا کرے اور ہمارے ملک پاکستان میں آرام و سکون عطا فرمائے۔ میری تمام مسلمان بہن بھائیوں سے اپیل ہے کہ اگر پاکستان ہے تو ہم ہیں اگر ہم زندہ ہیں تو پاکستان زندہ ہے پاکستان ہماری آن ہے پاکستان ہماری شان ہے اب شمارے پر ایک ٹکڑا دسمبر 2012ء کا تازہ شمارہ ملا، پڑھا بڑی خوش ہوئی، ناقابل بڑا جان دار لگا، تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ ہماری دعا ہے تمام راسخ حضرات اور قارئین کرام اس طرح ڈر کے لئے محنت کرتے رہیں جس طرح ہر آئی اپنے گھر کو جاتا ہے۔

☆ ☆ مشتاق صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، امید ہے آپ آئندہ ڈر سے غیر حاضر نہیں رہیں گے اور ہر ماہ خط ارسال کر کے شکر یہ کا موقع ضرور دیں گے۔

**محمد علی چغتائی** : بھلا پور سے، السلام علیکم و ڈرڈا انجسٹ میں یہ میرا پہلا خط ہے اور ڈر بھی لگ رہا ہے کہ یہ نہیں جگہ ملے گی بھی یا نہیں۔ میں فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں اور انجمن ہی سے ہمارا اسٹوریز کا شوق ہوں، پہلے میں اپنا شوق عام ایسٹوری بکس پڑھ کر پورا کیا کرتا تھا۔ مگر ایک دن جب میں اکیڈمی سے واپسی پر بکسٹال پر ہمارا کہانی خریدنے کے لئے گیا تو ڈرڈا انجسٹ کے شمارے پر نظر پڑی تو سرورق دیکھتے ہی خرید لیا اور ایک ہی دن میں پورے کا پورا پڑھ لیا۔ بہت زبردست اسٹوری تھیں۔ راج سے لے کر اب تک خط لکھ رہا ہوں مگر پوسٹ نہ کر سکا کہ شاید میرا خط شائع نہ ہو لیکن اب رہا نہیں گیا اور لکھ دیا کمال ہمت سے پوسٹ بھی کر دیا میں جیروڈی بھی کرتا ہوں اور انشاء اللہ اپنے خط میں اگلی دفعہ کسی غزل کی جیروڈی بھی بھجوا دوں گا بشرطیکہ میرا یہ خط شائع ہوا تب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو اور اس کے تمام اسٹاف کو خیریت سے رکھے اور ترقی دے۔ آمین۔

☆ ☆ محمد علی صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں دیکھم۔ آپ اپنی تحریر جلد از جلد ارسال کر دیں۔ آپ کی مہربانی اب آپ کو ڈرڈا انجسٹ اچھا لگتا ہے۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

**محمد رضوان قیوم** : راولپنڈی سے، میں خیریت سے ہوں، امید کرتا ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا، دیگر احوال یہ ہے کہ جیسا کہ آپ سے ٹیلی فون پر میں نے اپنے کلمے سنے ناولت سدرو کا ذکر کیا تھا۔ لیکن آپ کی خدمت میں آج ارسال کر رہا ہوں، یہ بڑا دلچسپ مافوق الفطرت موڈ کی اچھی مچی طویل کہانی ہے۔ اسے میں نے 3 ماہ میں بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اسے قارئین لازماً پسند کریں گے۔ یہ ایک مچی آپ جتنی پڑھیں طویل کہانی ہے۔

☆ ☆ رضوان صاحب: ناولت پیچھے کا شکر ہے، آپ کی چھوٹی کہانی آئندہ ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے ناول بھی اچھا ہی ہوگا۔ آئندہ ماہ تہرے کا انتظار رہے گا۔

**بشیر احمد بھٹی** : فوجی ہسپتال بھلا پور سے، دسمبر 2012ء سال کا آخری شمارہ خرید لیا، بہت اچھا لگا، اب تو ڈر صرف باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی خوب کھڑ گیا ہے۔ خطوط کے آخر میں آپ نے ایک مختصر اشتہار میں لکھا ہے کہ کہانی بھیجے والے اپنا موبائل فون نمبر ضرور ارسال کریں تاکہ ان سے رابطہ رہے۔ یعنی کہانی کی اشاعت یا ناقابل اشاعت کی اطلاع فوری دے دی جائے یہ ایک اچھی بات ہے۔ اس طرح کہانی کے مصنف کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی کہانی آنے والے شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ آپ سے یہ معلوم

کرتا ہے کہ اگر کسی مصنف کے پاس اپنا موبائل فون نہ ہو تو کیا وہ اپنے کسی دوست کا نمبر کہانی کے مسودے کے ہمراہ ارسال کر سکتا ہے۔ دوست کے توسط سے اسے اطلاع مل سکتی ہے۔ رد و کا اب کتابی صورت میں چھپ چکی ہے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے۔ جن قارئین نے سہ ماہی قسطیں نہیں پڑھیں وہ پڑھ سکتے ہیں۔ ایک عدولتفہد پیش خدمت ہے۔ اسے نئے سال کے پہلے شمارے میں شائع کر دیں۔ نیا سال آپ کو اور تمام اہل وطن کو مبارک ہو۔ خدا حافظ۔

☆ ☆ بشیر صاحب: آپ اور آپ کے تمام قلمی رشتوں کو نیا سال مبارک ہو، اگر کسی کے پاس موبائل نہ ہو تو وہ کسی کا بھی نمبر دے سکتا ہے۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

**غلام نبی فوری** : کھنڈیاں خاص سے، السلام علیکم، امید ہے کہ ڈر کے تمام قارئین، راسخ اور اسٹاف بخیریت ہوں گے، دسمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق شائع تھا۔ اس کے بعد قرآن کی باتیں پڑھیں، دل کو خوشی ہوئی، اسامہ خوشن آپ کا تہمرہ بہت اچھا تھا آپ کے لئے بھی بہت سی دعائیں، سفیان، ساغر و حکیم، ملک، ساجد، بشیر اور بلقیس خان آپ کو بھی ڈر کی فلی میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ڈاکٹر واجد گینگو کو سلام، دیگر نئے دوستوں کی آمد پر بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں، تمام دوستوں اور دیگر اسٹاف کو نئے سال کی بے شمار خوشیاں مبارک ہوں، کہانیوں میں رد و کا قطعاً نمبر 91 بیسٹ آف دسمبر رہی، اس کے بعد سنہری تابوت ٹھیک تھی، بلیک ونگر ایک لا جواب کہانی ہے۔ دوسری کہانیوں میں حلوہ، ہولناک رات، خون آشام، موت کے رنگ، محافظ، عبرت انگیز، خواب، موت کا راز، لا حاصل تھا اور تابوت کہانی زبردست تھیں۔ سب کی غزلیں بھی ٹھیک تھیں۔

☆ ☆ غلام نبی صاحب: قلمی نگار کے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجا جو ہمیں ملے نہیں۔

**محمد اسلم جاوید فیصل آباد** : ماہ دسمبر 2012ء کا تازہ ڈرڈا انجسٹ جس کا مطالعہ کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ایسا دلچسپ پڑھا کہ لے پڑی مبارکباد قبول کریں یہ ایک معیاری پڑ ہے جس کا میں بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے جو کہ قارئین میں بے حد مقبول ہے سرورق بہت ہی خوب صورت تھا خطوط میں یاد آوری کا شکر یہ، غزلیں شائع کرنے پر میں بے حد محسوس ہوں آپ جس خلوص اور محبت سے مجھے یاد فرماتے ہیں میں آپ کا بے حد مشکور ہوں، امید کرتا ہوں کہ آنے والے نئے سال میں آپ کا دوسرا حصہ پہلے سے زیادہ ہوگا۔ بشرط آپ کا میرے ساتھ تھا اور رہے۔ ماہ دسمبر کی ہر تحریر لا جواب تھی جس سے میں بے حد متاثر ہوا، غزلیں بھی بہت خوب تھیں، آئندہ شمارہ ماہ جنوری 2013ء کا ہوگا جس کا میں بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔ اس جاتے ہوئے سال میں ہم نے کیا کیا کچھ بھی نہیں ہر لحاظ سے یہ ایک بہترین سال تھا۔ ہر نظر پریشان ہر دل اداس تھا۔ آنے والا سال 2013ء امید ہے کہ بہتر ثابت ہوگا۔ آخر میں شب و روز دعا گو ہوں ڈرڈا انجسٹ کی ترقی کے لئے۔

☆ ☆ اسلم صاحب: خط لکھنے اور قلمی نگار کے کہانیوں کی تعریف اور اہل وطن کے لئے دل میں نرم گوشہ کے لئے شکریہ اللہ آپ کی زبان قبول کرے اور 2013ء ہم لوگوں کے لئے خوشیوں کا سال ثابت ہو۔

**ربحان خان** : میرا شمارہ، ڈرڈا انجسٹ سے منسلک تمام قارئین اور اسٹاف کو میرا سلام۔ میں ایک سینئر راسخ ہوں، میں خوفناک ڈرڈا کی سلسلے دار کہانیاں لکھتا ہوں۔ میری بہت سی کہانیاں کئی ڈرڈا انجسٹوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے ایک ایسے ڈرڈا انجسٹ کی تلاش تھی۔ جو کسی کی بھی محنت کو ضائع نہ کرے اور میری یہ تلاش ڈرڈا انجسٹ پر ختم ہوئی، اس لئے میں ڈرڈا انجسٹ کے ایڈیٹر صاحب سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر یہ خط آپ تک پہنچ جائے تو میرا یہ خط ضرور شائع کریں تاکہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ میرا خط ڈرڈا انجسٹ میں پہنچ چکا ہے تو اس کے بعد میں اپنی کہانی آپ کو ارسال کر دوں گا، پہلے میں خط اس لئے بھیج رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ میری محنت ضائع ہو جائے اور کہانی آپ تک پہنچ نہ پائے، مگر جیسے ہی میرا خط شائع ہوگا۔ مجھے پتہ چل جائے گا کہ میرا خط آپ تک پہنچ چکا ہے تو میں اپنی کہانی بھی رد و کر دوں گا۔

☆ ☆ ربحان صاحب: ڈرڈا انجسٹ میں موصوت و حکیم، چلے آئے خط ہم تک پہنچا اور شائع بھی ہو گیا، آپ پہلے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں اس کے بعد پھر قطعہ دار کہانی کے لئے قلم اٹھائیے گا۔ امید ہے آپ اس بات پر غور فرمائیں گے۔

☆☆☆

نوجوان کو اپنے دماغ میں غصے کی شدت سے آتش فشاں پھٹتا ہوا محسوس ہوا کہ ایک معمولی روح نے اسے ایک بے وقوف بچے کی طرح اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا، اور پھر ایک دلخراش منظر رونما ہوا۔

نفسیاتی لوگ دوسروں کی باتیں نہ مان کر زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ ایک حقیقی کہانی

رکھی کو بھی پالیسی کے متعلق علم نہیں تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہاشم صاحب کی بیوی جوانی میں ہی وفات پا چکی تھیں۔ اس لئے بچے بھی نہیں تھے۔ نہ جانے انہوں نے اتنی بڑی ہمسہ پالیسی خریدنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ ڈیڑھ کروڑ کی پالیسی کے مطلق من کر سونیا کے کان کھڑے ہو گئے اور اس کے دماغ میں نہایت اہم منصوبے نے جنم لیا۔ سونیا نے تمام منصوبہ جونی کو بتایا اور پھر منصوبے کے مطابق ہاشم صاحب کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے۔ حیرت انگیز طور پر ہاشم صاحب نے سونیا کی پیش رفت کا اقرار میں جواب دیا۔ اور دونوں نہایت دھوم دھام کے ساتھ شادی کر لی۔

شادی کے ایک سال بعد ہاشم صاحب کی موت واقع ہو گئی۔ ان کی گاڑی کا گیس سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ اور لاش جل کر کوئلہ بن گئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ ہاشم صاحب نے گاڑی کے شیشے اوپر کئے ہوئے تھے۔ جونی نے سی این جی گیس کے سلنڈر کے وال کو کھول دیا تھا۔ ہاشم صاحب چین اسموکرتھے۔ ایک سگریٹ ابھی مکمل ختم نہیں ہونے پاتا تھا کہ وہ دوسرا سلاگ لیتے تھے۔ بند گاڑی میں گیس کے بھر جانے کے بعد جب انہوں نے سگریٹ

**ہیرو** کا نام جنید عالم..... جسے عرف عام میں اس کے ساتھی جونی کے نام سے پکارتے تھے۔ فلوں کے بہت سے ہیرو سے خوب صورت اور دلنوں سے زیادہ سفاک اور عیاش فطرت تھا۔ لیکن سوچنا سمجھنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ صرف عمل کرنا جانتا تھا۔ سوچنے کا کام ہیروئن یعنی سونیا کے سپرد تھا۔ سونیا حسین و جمیل لاکھوں ہیروئنوں سے خوب صورت اور چالاک و عیار ہونے کے علاوہ مفاد پرست بھی تھی۔ جونی اور سونیا، ہاشم صاحب کی بہت بڑی پرزہ جات کی فرم میں کام کرتے تھے۔ جونی کی پوسٹ اکاؤنٹس کی تھی جبکہ سونیا، ہاشم صاحب کی سیکرٹری کے طور پر کام کرتی تھی۔ کام کے دوران دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے اور پھر انہوں نے نہایت خفیہ طریقے سے شادی کر لی۔ سونیا کے دماغ میں نہایت منافع بخش منصوبہ موجود تھا۔ منصوبے کا نہایت اہم کردار یعنی ہاشم صاحب جو کہ پرزہ جات پر مشتمل فرم کے ایم ڈی تھے۔ انہوں نے حیرت انگیز طور پر ڈیڑھ کروڑ روپے کی خطیر بیمہ پالیسی خرید کر انشورنس کمپنی والوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔ پالیسی کو نہایت خفیہ رکھا گیا تھا۔ ہاشم صاحب کی کمپنی میں سوائے سونیا کے او



سگھانے کی کوشش کی۔ تب گاڑی کا سلسلہ رچکا کے ساتھ پیٹ گیا۔ اور ہاشم صاحب کی موت واقع ہو گئی۔ ایک بات جو جونی کو کھنگ رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ یہ حادثہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر درمیان ہوا۔ یعنی اس دن واقعہ سے پہلے ہاشم صاحب نے سگریٹ سگھانے میں دیر کی۔ ایسا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ایسا ہوا؟ بہر حال قانونی طور پر پالیسی کی رقم ان کی بیوی کو ملنی چاہئے تھی۔ پالیسی کی خطیر رقم کو مد نظر رکھتے ہوئے انشورنس کمپنی والوں کے جاسوس نے لاش کے متعلق سوئیا سے پوچھ چکھ کا آغاز کیا۔ تحقیق مکمل ہوئی۔ لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سارے کام معمول کے مطابق تھے۔ حتیٰ کہ بیمہ پالیسی کی رقم دینے سے پہلے جاسوس نے لاش کا ڈی این اے کروانے کی بھی ہدایات دیں۔ لاش کے ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ ملنے کے فوراً بعد اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ لاش واقعی ہاشم صاحب کی ہے۔ جاسوس نے تحقیق کردہ فائل پر اوکے کے دستخط کر دیئے۔ یوں مختصر تحریری کارروائیوں کے بعد ڈیڑھ کروڑ کی رقم سوئیا کو مل گئی۔ اس نے رقم کو اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروانے کے بجائے بڑے نوٹوں میں منتقل کرنے کے بعد سیاہ رنگ کے ایک دائرہ پروف بیک میں ڈالنے کے بعد گھر کے سیف میں منتقل کر دیا، وہ انشورنس کمپنی کے جاسوس سے اب بھی خوفزدہ تھی۔ اور جلد از جلد ہاشم صاحب کے مکان کو بیچ کر دور دراز کے کسی علاقے میں منتقل ہو جانا چاہتی تھی۔

خوفزدہ ہونے کی کچھ وجوہ پر اسرار واقعات بھی تھے۔ جو ہاشم صاحب کی موت کے بعد رونما ہونے لگے تھے۔ مثلاً سوئیا کو اکثر اوقات ہاشم صاحب کی روح گھر کے ارد گرد گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ڈرائنگ روم میں اسی برائڈ کے سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے۔ جو ہاشم صاحب پیتے تھے۔ چند ایسی اور نشانیاں جو ہاشم صاحب کی موجودگی کا اظہار کرتی تھیں ان کی بدولت سوئیا نے گھر میں اکیلے رہنا مناسب نہیں جانا اور نہ چاہئے کہ باوجود بھی جونی

کو رہائش گاہ پر بلا لیا۔

مختصر منصوبہ بندی..... تھوڑی سی پوچھ چکھ..... اور ڈیڑھ کروڑ کی رقم کا باآسانی مل جانا..... کیا ایسا ہونا ممکن تھا۔ بالکل بھی نہیں..... لیکن بات کچھ اور سی۔ اس منصوبہ بندی کے پیچھے ایک اور منصوبہ بھی کارفرما تھا۔ ہاشم صاحب کی پرزہ جات کی کمپنی دیوالیہ ہو چکی تھی۔ انہیں کمپنی کے استحکام کے لئے ہنگری رقم کی ضرورت تھی۔ دیوالیہ کمپنی کے بل بوتے پر کوئی بھی بینک یا ادارہ قرضہ دینے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ تب ہاشم صاحب نے اپنے تانیا زاد بھائی ایم ایم حشمت کی مالی ساکھ سہارا لیا۔ حشمت صاحب..... ایم ایم گروپ آف کمپنی کے مالک تھے۔ مالی بحران کی بدولت ان کی کمپنی میں بھی کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ دونوں بھائیوں نے صلاح و مشورے کے بعد جو منصوبہ بندی کی۔ وہ کچھ یوں تھی۔ ہاشم صاحب کی نگاہوں میں سوئیا کا عہد پرست و جھوٹا فائلوں سے کھنگ رہا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر سوئیا کے ہمراہ ڈیڑھ کروڑ کی پالیسی خریدنے کے لئے انشورنس کمپنی والوں کو اپنے آفس میں مدعو کیا۔ پالیسی خریدنے کے بعد جب سوئیا نے ہاشم صاحب کی جانب راغب ہونے کی کوشش کی۔ تب یہ جانے ہوئے بھی کہ سوئیا خفیہ طور پر جونی کے ساتھ شادی کر چکی ہے۔ اسے مثبت جواب دیا۔ پھر اس کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ شادی کے فوراً بعد جونی کے فلیٹ میں رد و بدل کر کے ایسے آلات نصب کر دیئے گئے جس کے ذریعے فلیٹ میں موجود ایک ایک آواز کو ریکارڈ کیا جانے لگا۔ اور وہ منصوبہ بندی جو ہاشم صاحب کو قتل کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اس کے متعلق ہاشم صاحب اور حشمت صاحب کو آگاہی حاصل ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصے کے بعد جب جونی نے گاڑی کے گیس کے سلسلہ رچے وال کو کھول کر قتل کرنے کے منصوبے کی ابتداء کی۔ تب ہاشم صاحب نے گاڑی میں بیٹھنے کے فوراً بعد گھر کے قریب واقع کیراج کارخ کیا۔ کیراج کار کا مالک ان کا جاننے والا تھا۔ بلکہ منصوبے کا ایک اہم رکن بھی تھا۔ ہاشم صاحب نے گاڑی کیراج کے

نوکر کے حوالے کی اور اسے شہر سے باہر لے جا کر بریکیں چیک کرنے کے لئے کہا۔ نوکر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ تب ہاشم صاحب نے سگریٹوں سے بھری ہوئی ذلی اسے تھامتے ہوئے کہا۔ لاگت ڈرائیو کے دوران تمہارے کام آئے گی۔ اس کے بعد اگلی اور بار اپنے گھٹے سے اتار کر اس کے ہاتھ اور گلے میں پہنا دیئے۔ اس نے پریشان نگاہوں سے ہاشم صاحب کی جانب دیکھا۔ تب وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”جب ڈرائیو کے بعد اپنے مالک کے پاس جاؤ۔ تب بار اور اگلی اسے دے دیتا۔ اس وقت تک تم ہی پہنہ رکھو۔“

شام تک گاڑی کے حادثے کی خبر شام کے اخباروں میں لگنے لگی۔ اور ہاشم صاحب منظر عام سے روپوش ہوتے چلے گئے۔ اس حادثے کے اگلے دن ہاشم صاحب نے کیراج کے مالک کو بھی قتل کر دیا۔ ظاہری طور پر وہ مریچکے تھے۔ اس لئے اگر وہ بول بھی کر لیتے۔ تب انہیں گرفتار کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال ان کے منصوبے کا نہایت اہم پہلو یہ تھا کہ ظاہری موت سے پہلے ہاشم صاحب نے بیمہ پالیسی کی تمام رقم ایم ایم حشمت صاحب کے نام کر دی تھی۔ یعنی ان کی موت کے بعد رقم بیوی کے ذریعہ حشمت صاحب کو مل جاتی۔ انہوں نے حافیہ بیان تحریر کیا۔ حج صاحب کے دستخط اور مہر لگانے کے بعد ان کے پاس ایٹار رکھوا دیا تاکہ رقم ملنے کے فوراً بعد قانونی کارروائی کر کے رقم حاصل کر لی جائے۔ یہ وہ منصوبہ تھا۔ جو ڈیڑھ کروڑ کی رقم کے لئے سرگرم عمل رہا۔ اس وقت رقم سوئیا کے پاس تھی۔ حشمت صاحب نے پولیس کے ہمراہ ہاشم صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ گھر کے پاس پہنچنے کے بعد انہوں نے پولیس والوں کو باہر رہنے کا حکم دیا اور خود دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گئے۔ ان کے پاس گھر کی دوسری چابی موجود تھی۔ جو انہیں ہاشم صاحب کے توسط سے دستیاب ہوئی تھی۔

دوسری جانب سوئیا کے بلانے پر جب جونی نے ہاشم صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ تب باہر کھڑے پولیس کو

دیکھنے کے بعد اپنا چہرہ رومال میں چھپا لیا۔ وہ وقت سے پہلے اپنے اوروئیا کے تعلقات کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا، ہوا تھا۔ اس نے سوچا شاید کہ سوئیا نے جان کر اس کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہوگا۔ اس لئے پرواہ کئے بغیر اندر گھسٹا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ آوازیں مردوں کی تھیں۔ ان میں ہاشم صاحب کی آواز نمایاں تھی۔ جونی کو اپنے جسم کے روٹنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ہاشم صاحب کی جلی ہوئی لاش دستیاب ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی لاش کا ڈی این اے ٹیسٹ بھی کیا گیا تھا۔ جس کی رپورٹ کے مطابق لاش ہاشم صاحب کی ہی تھی۔ پھر بھلا کمرے میں کون موجود ہو سکتا تھا؟ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بھاگ جانا مناسب جانا۔ لیکن ابھی وہ بھاگنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ اسے ہاشم صاحب کی کرخت آواز سنائی دی۔

”بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ خاموشی کے ساتھ اندر آ جاؤ۔“ جونی نے پریشان نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ لیکن وہاں کسی کو بھی موجود نہیں پایا۔ اس لئے مجبوراً کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرے کے درمیان میں ہاشم صاحب اور حشمت صاحب موجود تھے۔ ان کے درمیان میں میز پر بیمہ پالیسی کی رقم سے بھرا ایک رکھا ہوا تھا۔ لیکن سوئیا کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ جونی نے بھگتے ہوئے ہاشم صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ ہاشم صاحب تو مریچکے ہیں۔“ ہاشم صاحب نے قہقہہ لگایا۔ پھر یکفخت لگا ہوں کے سامنے سے اوشیل ہو گئے۔ جونی نے تعجبی نگاہوں سے حشمت صاحب کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ثبت تھے۔

”میں نے اسے رقم کے حصول کے لئے قتل کر دیا ہے۔“ وہ پریشان لہجے میں بولے۔ ”لیکن اس کی روح میرا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ منصوبہ تم دونوں میاں بیوی تیار کر چکے تھے۔ اسے عملی صورت میں



نے دے دی۔ حالانکہ اسے تم دونوں کے منصوبے کے ایک ایک پہلو کے متعلق خبر تھی۔ اور اس نے منصوبے میں رد و بدل بھی کر دی تھی۔ لیکن میں نے رقم حاصل کرنے کے لئے اسے بے ہوش کیا اور شہر سے باہر لے جا کر گاڑی میں ڈال کر گاڑی کو آگ لگا دی۔ موت کے دوسرے دن ہی اس کی روح نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ میں سونیا کو قتل کر دوں۔ وہ سونیا سے نفرت کرتا ہے۔ وجہ اس کی بے وفائی ہے۔ میں نے جب انکار کرنے کی کوشش کی تب اس نے پولیس کو سب کچھ بتانے کی دھمکی دی۔ میں نے مجبور ہو کر سونیا کو قتل کر دیا۔ اس کی لاش اور پرکمرے میں موجود ہے۔“

جونی کو اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے اور اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ حشمت صاحب بولے چلے جا رہے تھے۔

”ہاشم صاحب کی روح کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ تمہیں سونیا کا قاتل قرار دے کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ لاش گھر میں موجود ہے۔ صرف بے ہوش کر کے تمہیں سونیا کی لاش کے قریب ڈالنا باقی ہے۔ بے ہوشی کے بعد اگر تمہارے ہاتھوں کے نشان اس چاقو پر ثبت کر دیے جائیں۔ جن کے ذریعے اس کا قتل ہوا ہے۔ تب پولیس تمہیں ہی قاتل گردانے گی۔“ انہوں نے بات ختم کرنے سے پہلے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موبائل باہر نکال کر پولیس والوں کو کس کال دینے لگے۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ربوہ اور بھی موجود تھا۔ جونی کو اچانک ہی اپنے پیچھے سونیا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”جونی رقم کا بیگ اٹھاؤ اور مکان کے پیچھے موجود کھڑکیوں کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرو۔“ جونی کو یقیناً ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آنا پڑا۔ اس نے دھکا دے کر حشمت صاحب کو صوفوں کی جانب دھکیلا اور میز پر رکھے ہوئے بیگ کو اٹھا کر کمرے کی دوسری جانب موجود کھڑکیوں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں حشمت صاحب بھی

سنجیدگی سے چکے تھے۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ربوہ اور کوسیدھا کیا اور بے دریغ فائر کر دیا۔ کمرہ ربوہ اور کے دھماکے سے گونج اٹھا۔ لیکن نشانہ چوک گیا۔ گولی جونی کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی کھڑکی کے شیشے کو توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جونی نے چھلانگ لگائی اور کھڑکی سے باہر کودنا چلا گیا۔ اس نے زمین پر قدم رکھتے ہی اندھا دھند گھر سے کچھ دور نظر آتی مختصر روشنیوں کی جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہاں ایک مختصر ریلوے اسٹیشن موجود ہے۔

موسم خوشگوار تھا اور چاند کی چاندنی کی بدولت ماحول روشن تھا۔ اسے اسٹیشن کی عمارت تک پہنچنے میں تقریباً دس پندرہ منٹ لگے۔ اسٹیشن کی پٹریوں پر ٹرین کھڑی تھی۔ لیکن ردا بھی گئی کچھ وقت باقی تھا۔ جونی ٹکٹ لئے بغیر پچھلی جانب موجود اکا نوبی کے ڈبے میں چڑھ گیا۔ رٹن ہونے کے برابر تھا۔ اس نے ٹوائٹ کے پاس موجود اکیلی سیٹ کو منتخب کیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے اسٹیشن کا دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ٹرین نے ردا بھی کی وکیل دی اور پلیٹ فارم سے آگے نکلنے لگی۔ بھی چار پولیس والے اسٹیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے متلاشی نگاہوں سے اسٹیشن کے مختصر پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ پھر نہایت بھرتی کے ساتھ پلیٹ فارم چھوڑتی ہوئی ٹرین کے آخری ڈبے میں چڑھ گئے۔

اب کچھ تعارف پولیس کے چاروں اہلکاروں کا بھی ہو جائے۔ انسپکٹر کا نام ناصر تھا جبکہ اس کے ہاتھوں کے نام تو قیر، جبار اور شاہد تھے۔ انسپکٹر ناصر کا موبائل فون کے ذریعے حشمت صاحب کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ اور وہ وقتاً فوقتاً انیس رپورٹ دے رہے تھے۔ حشمت صاحب کے انفارم کرنے پر جب انسپکٹر ناصر نے ہاشم صاحب کے گھر کے پچھواڑے کا رخ کیا۔ تب اس نے جونی کو اسٹیشن کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انسپکٹر اور اس کے ماتحت جونی کا پچھا کرتے ہوئے اسٹیشن کی عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور آخری ڈبے میں چڑھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جونی کی تصویر موجود تھی۔ اور

وہ تمام ڈبوں میں اسے تلاش کرنے لگے۔ ٹرین میں مسافر کم تھے۔ اس لئے انہیں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن تمام ڈبوں میں تلاش کرنے کے باوجود وہ جونی کو تلاش نہیں کر پائے۔ انسپکٹر ناصر نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم تینوں نے ٹرین کا کونا کونا چھان مارا ہے؟“ ہاتھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تب پھر بھلا وہ کہاں جاسکتا ہے؟ یقیناً تم تینوں نے کونا سے کام لیا ہوگا۔ ورنہ بھلا وہ چلتی ہوئی ٹرین میں سے کہاں جاسکتا ہے؟“ اچانک انسپکٹر ناصر کے دماغ میں کچھ خیال آیا اور اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم تینوں نے ٹرین کے ٹوائٹ بھی چیک کئے ہیں؟“ اس نے انہوں نے انکار میں سر ہلادیا۔ انسپکٹر ناصر نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ پھر بولا۔

”وہ یقیناً ٹوائٹ میں ہی چھپا ہوگا۔ تلاش کا کام انجن کے پاس والے ڈبے سے دوبارہ شروع کرو۔ اس مرتبہ ٹرین کے ٹی ٹی کو بھی ہمراہ لے جانا۔“ تینوں ہاتھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹی ٹی کے ہمراہ دوبارہ کام شروع کر دیا۔ دوبارہ تلاش کرتے ہوئے وہ آخری ڈبے تک آپہنچے۔ لیکن جونی کو تلاش نہیں کر پائے۔ اب صرف آخری ڈبے کا کچھ حصہ باقی بچا تھا۔ اس بات کے سو فیصد چانسز موجود تھے کہ جونی آخری ڈبے میں ہی کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ انسپکٹر ناصر نے اپنے ہاتھوں اور ٹی ٹی کے ہمراہ آخری ڈبے میں قدم رکھ دیا۔

جونی آخری ڈبے میں ہی موجود تھا۔ اور وہ انسپکٹر ناصر کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانب آتا بخوبی دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹرین کے ڈبوں میں موجود مسافروں کے علاوہ ٹوائٹ بھی کھول کر چیک کر رہے تھے۔ اب جونی کے لئے ٹوائٹ میں چھپنا بھی ناممکن تھا۔ ٹرین مکمل رفتار کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ وہ چوہے دان میں پھنس چکا تھا۔ اسے شدت سے سونیا یاد آنے لگی۔ وہ ایسے موقع پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی تدبیر سوچنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ ابھی اس کے دماغ کی سوچ مکمل

بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اسے اپنے پیچھے سونیا کی مدھر آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔ جونی نے بڑبڑا کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ جونی نے کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ لیکن سونیا نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر بولی۔

”تمہارے پاس وقت کم ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ تمہاری تلاش میں آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ٹرین سے فرار کا صرف ایک ہی راستہ میرے دماغ میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ فوراً ٹرین کو روکنے کے لئے زنجیر کو کھینچ دو۔ جیسے ہی ٹرین رکے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرو۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور زنجیر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ اس کے قریب ہی موجود تھی۔ جونی نے آگے بڑھ کر جھپٹنے کے ساتھ زنجیر کو کھینچ دیا۔ یکدم ٹرین کی رفتار میں کمی واقع ہونے لگی۔ جونی نے ممنونانہ نگاہوں سے سونیا کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہوا پر مشتمل روح ہو۔ یا پھر گوشت پوست سے مزین انسان..... اگر روح ہو تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں عالم اوداع میں ہونا چاہیے۔“ سونیا نے افسردہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”عالم ارواح میں وہ روحیں جاپاتی ہیں۔ جن کی موت قدرتی طریقے سے واقع ہوئی ہو۔ حادثاتی موت والی روحیں اور خاص کردہ روحیں جن کے ساتھ ظلم ہوا ہو۔ وہ دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ شاید انتقام کے لئے..... ہاشم صاحب کی روح نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے حشمت صاحب کا سہارا لیا۔ ہوا پر مشتمل روح کسی بھی ٹھوس اجسام کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے میں ہاشم صاحب اور حشمت صاحب کو قصہ میں ناکام کرنے کے لئے نہیں استعمال کر رہی ہوں۔“ گاڑی کی رفتار بالکل سست ہونے لگی تھی۔ جونی نے باہر نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک سیاہ اندھیرے اور دیرانگی کا عالم تھا۔

دوسری جانب جب انسپکٹر ناصر نے ٹرین کو روکے ہوئے محسوس کیا۔ تب اس نے کھڑکی سے باہر بھاگ کر

دیکھنے کی کوشش کی۔ اسٹیشن کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا۔ اس نے ٹی ٹی کو گاڑی روکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے انجن ڈرائیور کی جانب بھجوا دیا۔ ٹی ٹی نے جیب میں سے موبائل باہر نکالا اور انجن ڈرائیور سے رابطہ ملنے کے بعد جب وجہ معلوم کی تب انجن ڈرائیور نے بتایا کہ۔۔۔

ٹرین کے مسافروں میں سے کسی نے زنجیر کو کھینچ کر ایمر جنسی بریکوں کو کھینچ دیا ہے۔ انسپکٹر ناصر نے فوراً چلائے ہوئے ٹی ٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ڈرائیور کو اچھی طرح بتا دو کہ اس کے بعد اگر کوئی زنجیر کھینچ کر ٹرین کو روکنے کی کوشش کرے۔ تب ٹرین کو رکتا نہیں چاہئے۔ یہ میرا یعنی انسپکٹر ناصر کا حکم ہے۔“ ٹی ٹی نے حکم لفظ بہ لفظ ڈرائیور کے کان تک پہنچانے کے بعد موبائل کو بند کر دیا۔ انسپکٹر ناصر نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھتے ہوئے پرنسپلر لہجے میں ہدایت دیں۔

”ٹرین کے رکتے ہی تم تینوں نے ٹی ٹی کے ہمراہ ٹرین کو دونوں جانب سے کو کرنا ہے۔ مجرم نے زنجیر صرف اس لئے کھینچی ہے تاکہ وہ ٹرین سے اتر کر فرار ہو سکے۔ یقیناً وہ ٹرین کے آخری ڈبے میں ہی موجود ہے۔ کیونکہ پچھلے ڈبوں کی سلاخی ہم لے چکے ہیں۔ وہاں اس کا وجود موجود نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے ہمیں آخری ڈبے کی جانب جاتے ہوئے دیکھا اور فرار کے تمام راستوں کو مفقود پایا۔ تب آخری کوشش کے طور پر زنجیر کو کھینچ دیا۔ تاکہ گاڑی کے رکتے ہی وہ فرار ہونے کی کوشش کرے۔ ہمیں اسے اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ اس لئے گاڑی کے رکتے ہی آخری ڈبے کو دونوں جانب سے گھیرے میں لینے کے علاوہ اور باقی ڈبوں پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کرنی ہے۔“ اس کے ہاتھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کے رکتے کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ انسپکٹر ناصر اور اس کے ہاتھوں کے علاوہ ٹی ٹی نے بھی نیچے اتر کر آخری ڈبے کو دونوں جانب سے گھیر لیا۔ ان کی نگاہیں انجن کے آخر تک گردش کر رہی تھیں تاکہ کوئی بھی

مسافر ان کی نگاہوں سے بچ کر نیچے نہ اترنے پائے۔ ایک دو مسافروں نے ہوا خوری کے لئے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹی ٹی نے انہیں سیٹی بجا کر گاڑی میں واپس چڑھنے کا حکم دیا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے ٹی ٹی کی جانب دیکھتے ہوئے واپس ٹرین پر چڑھ گئے۔ چاروں جانب دیرانہ تھا اور دیرانے میں گھب اندھیرا طاری تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دے رہا تھا۔ انسپکٹر ناصر اور اس کے اہلکار بعد ٹی ٹی سانس روکے اس انتظار میں ٹرین سے نیچے کھڑے تھے کہ شاید مجرم نیچے اترنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور انجن نے روانگی کی دھم دے دی۔ ٹی ٹی نے جوابی سیٹی بجا کر اور ٹرین نے حرکت شروع کر دی۔ انسپکٹر ناصر نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ پھر پھرتی کے ساتھ ڈبے پر چڑھتا چلا گیا۔ ٹرین نے رفتار بگڑتی شروع کر دی۔

جونی آخری ڈبے کی کھڑکی کے پاس کھڑا حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس نے انسپکٹر اور اس کے ہاتھوں کو ٹرین سے نیچے اتر کر منور چہ بند ہوتے ہوئے بخوبی دیکھ لیا تھا۔ اب ٹرین سے نیچے اترنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سونیا کی روح اس کے ہمراہ موجود تھی۔ اس نے بھی نیچے اترنے سے منع کیا۔ اور حالات کے مطابق اگلا قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے کی نصیحت کی۔ کچھ دیر گھبرائے رہنے کے بعد ٹرین نے روانگی کی دھم دی۔ تب جونی نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور پھرتی کے ساتھ بھاگتا ہوا درمیانی ڈبے میں داخل ہو گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے پر اس نے پولیس کے چاروں اہلکاروں کو ٹی ٹی سمیت ٹرین کے آخری ڈبے میں کھستے ہوئے دیکھا۔ ٹرین نے رفتار بگڑتی شروع کی۔ جونی ڈبے کے دروازے کے پاس کھڑا تیزی سے گزرتی ہوئی جھٹکی جھڑیوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

آخری ڈبے کے دروازے میں پولیس کا سپاہی بھی دروازے کے پاس کھڑا باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی چلی جارہی تھی۔ پھر اچانک ہی دوسرے ایک بڑی نہر کے بند کھائی دینے لگے۔ اس کے کناروں پر بٹیاں روشن تھیں۔ جونی کو اپنے پیچھے سونیا کی

سرکوشی سنائی دی۔ ”یہ تمہارے لئے بہترین موقع ہے۔ تم تیرا بخوبی جانتے ہو۔ آٹھ گھنٹیں بند کر کے نہر میں چھلانگ لگا دو۔“ انہوں نے دوبارہ ڈبوں کی چٹنگ شروع کر دی۔ تب تمہارے پاس فرار کے لئے مزید راستہ موجود نہیں ہوگا۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے میں تیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ نہر کا بندزدیک آتا چلا جا رہا تھا۔ ٹرین کے دروازے میں کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی اب بھی ٹرین کے ڈبوں کے دروازے اور کھڑکیوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ یکدم نہر نزدیک آ گئی۔ نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور نہر پانی سے ممل طور پر لبریز تھی۔ جونی نے اللہ کا نام لیا اور ڈبے کے دروازے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ٹرین کی رفتار طوفانی انداز اختیار کر چکی تھی۔ تیز ہوا کے زبردست ریلے نے اسے مخالف سمت دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن جونی نے سمت کا تعین کر کے چھلانگ لگائی تھی۔ اس لئے اس نے جسم کی سمت پر مکمل قابو رکھا۔ اور دھماکے کے ساتھ ٹھنڈے پانی کے درمیان میں جا گرا۔ اس کے جسم کو زبردست جھٹکا لگا۔ اور اس کا جسم پانی کے اندر ڈوبتا چلا گیا۔ اچھالی کی قوت نے اسے فوراً ہی باہر کی جانب اگل دیا۔ جونی نے لمبا سانس لیا۔ اور نہر کے کنارے کی جانب تیرنا شروع کر دیا۔ اس کی کمر پر موجود بیک اگرچہ واٹر پروف تھا۔ لیکن پھر بھی جونی کی کوشش یہی تھی کہ بیک پانی کے اندر نہ جانے پائے۔ اسے کنارے تک پہنچنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نہر کا کنارہ رختا تھا۔ وہ کنارے کے قریب ریت پر اوندھا گر گیا۔ اور لمبے سانس لے کر مزید کھال کرنے لگا۔ سونیا کی روح اس کے پاس کھڑی قمریلی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

جونی کو ڈبے سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے پولیس کے اہلکار نے بخوبی دیکھ لیا۔ اس نے فوراً سے چیئر انسپکٹر ناصر کو جونی کے فرار کے متعلق بتا دیا۔ انسپکٹر ناصر نے ہڑبڑا کر سپاہی کی جانب دیکھا۔ پھر اسے زنجیر کھینچنے کا حکم دیا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر زنجیر کو جھٹکے کے ساتھ کھینچا۔ لیکن ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ انسپکٹر

ناصر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹرین کے دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ٹرین اس وقت گئے کے کھیت کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اور اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ پھر نہ جانے ایسا کیا ہوا کہ ٹرین نے جھٹکا لے کر رفتار کو دوبارہ بڑھانا شروع کر دیا۔ انسپکٹر ناصر نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔ پھر چلائے ہوئے ٹی ٹی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”ٹرین رک کیوں نہیں رہی۔ زنجیر کھینچنے کے باوجود اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ ڈرائیور پاگل تو نہیں ہو گیا۔“ ٹی ٹی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”جناب وہ تو آپ کے حکم پر ہی عمل کر رہا ہے۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ کہ زنجیر کھینچنے پر بھی ٹرین کو دوبارہ نہیں رکتا چاہئے۔“ انسپکٹر ناصر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر بال ہوتے ہوئے بولا۔

”اس گدھے کے نیچے کون کر کے کہو کہ ٹرین کو فوراً روکنے۔ نہ جانے مجرم کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔“ ٹی ٹی نے فوراً بھاگ کر موبائل کو جیب سے باہر نکالا اور انجن ڈرائیور کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ ساتھ میں انسپکٹر ناصر سے مختصر بات چیت بھی کرادی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر وہ جھٹکا کھا کر رک گئی۔ لیکن اتنی دیر میں ٹرین کافی سے زیادہ فاصلہ طے کر چکی تھی۔ بہر حال گاڑی کے رکتے ہی انسپکٹر ناصر اور اس کے ساتھیوں نے گاڑی سے نیچے چھلانگ لگائی اور نہر کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگتے ہوئے انسپکٹر ناصر نے ماتحت سے پوچھا۔

”کیا یہاں سے مرکز قریب ہے؟“ سپاہی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہاتھ سے سیدھے ہاتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اس جانب کچھ فاصلے پر مرکز ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ انسپکٹر ناصر بولا۔ ”نہر میں چھلانگ لگانے کے



بعد اس نے یقیناً سڑک کا رخ کرنا ہے۔ یہاں ارد گرد آبادی موجود نہیں ہے۔ وہ لفٹ کے ذریعے قریبی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ نہر کی جانب جانا فضول ہے۔ اس لئے ہمیں سڑک کا رخ کرنا چاہئے۔“ پھر کچھ سوچ کر وہ بولا۔

”لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہر کے بند سے نکلنے کی بدولت اس کی موت واقع ہو چکی ہو۔ اگر ایسا ہوا۔ تب ہمارا سڑک کی جانب جانا فضول ثابت ہو گا۔“ میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ رہے گا کہ ہم میں سے دو سڑک کی جانب جائیں اور دو نہر کی جانب۔ میں اور تو قیر سڑک کی طرف جاتے ہیں جبکہ تم دونوں نہر کی صورت حال معلوم کرنے کے بعد موبائل پر ہمیں انقار کرو۔“ دونوں سپاہیوں نے اثبات میں سر ہلایا اور نہر کی جانب چل دیے۔

سڑک وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ پندرہ منٹ تیز قدموں کے ساتھ چلنے کے بعد وہ دونوں سڑک پر پہنچ گئے۔ اب ان دونوں نے دوبارہ نہر کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ پندرہ منٹ نہیں گزرے تھے کہ انہیں اپنے مخالف جانب سے ایک گھوڑا گاڑی آتی دکھائی دی۔ انہوں نے حیرت بھری نگاہوں سے پیچھے مڑ کر گھوڑا گاڑی کی جانب دیکھا۔ جورات کے اس پھر سڑک پر خراماں خراماں رواں دواں تھی۔ اس کے علاوہ وہ سڑک مکمل طور پر سنسان تھی۔ جب گھوڑا گاڑی قریب آئی۔ تب انسپکٹر ناصر نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کوچوان نے بائیں کھینچ لیں اور گھوڑا گاڑی سڑک کے درمیان رک گئی۔ انسپکٹر ناصر نے جونی کا حلیہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اس کی بات پوچھا۔ تب کوچوان نے زور سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”صاحب ابھی کچھ دیر پہلے میں اس نو جوان کو یہاں سے اٹھا کر قریبی آسب زدہ کھنڈرات تک چھوڑ کر آیا ہوں۔ پانی سے شرب اور وہ نو جوان قریبی نہر میں نہا کر باہر نکلا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے مناسب جواب نہیں دیا۔“ انسپکٹر ناصر نے بات کو درمیان میں کاٹ کر اسے

خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر تانگے میں بیٹھتے ہوئے اسے کھنڈرات کی جانب چلنے کا حکم دیا۔ کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا اور تانگے کو موڑنے کے بعد دوبارہ کھنڈرات کی جانب چل دیا۔ تانگے میں خاموش طاری تھی۔ صرف گھوڑے کی ناپوں کی آواز سے ماحول گونج رہا تھا۔ کوچوان نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”حضور۔۔۔۔۔ وہ کھنڈرات آسب زدہ ہے۔ کتنی مرتبہ لوگوں نے وہاں چڑیل کو سفید کپڑوں میں لپیٹ کر پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے نو جوان کو کھنڈرات میں جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ خدا کا پکا نکلا۔ تانگے سے اتر کر کھنڈرات کے اندر چلا گیا۔“ انسپکٹر ناصر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم نے بھی اس چڑیل کو کھنڈرات میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یا پھر یونہی لوگوں کی سی ان سنی باتوں کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہے ہو۔“

کوچوان پر جوش لگے میں بولا۔ ”حضور میں قسم کھا کر بتاتا ہوں۔ کہ میں نے پچھلے ہفتے کی رات کو کھنڈرات کے پاس اسے سفید کپڑوں میں لپیٹ کر گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ اس کے بال بھرے ہوئے تھے اور سرخ ہونٹوں سے سفید دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔“

انسپکٹر ناصر نے زور اور قہقہہ لگاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ جو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ کپڑے کاٹن کے تھے یا پھر مکمل کے تھے۔ اس کے علاوہ کیا تم نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کپڑے کس درزی سے سلوائی ہے۔“

کوچوان شرمندہ لہجے میں بولا۔ ”جناب میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں نے واقعی اسے دیکھا تھا۔ وہ نہایت بد صورت تھی۔“ انسپکٹر ناصر نے اس دفعہ کوئی جواب نہیں دیا۔ اور لا پرواہی سے باہر موجود کھیتوں کی جانب دیکھنے لگا۔ ٹھوڑی دیر بعد گھوڑا گاڑی کھنڈرات تک پہنچ گئی۔ کھنڈرات کیا تھے۔ بس مٹی اور پتھروں کا ڈھیر تھا۔ چند مختصر دیواروں کی بدولت شاید اسے کھنڈرات کا نام دے دیا گیا تھا۔ لیکن جو بھی تھا۔ چاندنی رات میں

پتھروں کا وہ ڈھیر بہت خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے انسپکٹر ناصر کو کیوں اپنے جسم میں سرد لرہ درڑتی محسوس ہوئی اور اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ اس نے حلق میں بیدار ہوتے ہوئے تھوک کو نگلا۔ پھر اپنے سانجھی تو قیر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال میں مجرم خطرناک ہے۔ اس لئے ہم تینوں کھنڈرات کی جانب اکٹھے جانا چاہئے۔ میرے پیچھے آؤ۔“ تو قیر اور کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر انسپکٹر کے پیچھے کھنڈرات کی جانب چل دیے۔ کھنڈرات میں کھینکروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

کوچوان سرگوشی کے عالم میں بولا۔ ”حضور میں نے سنا ہے کہ کھینکروں میں چکا ڈروں کی روح حلول کر جاتی ہے اس لئے یہ راتوں کو شور مچاتے ہیں۔“ انسپکٹر کچھ دبا بکاٹے ہوئے بولا۔ ”تم دو حلوں کے علاوہ بھی کسی موضوع پر بات کر سکتے ہو۔۔۔۔۔ یا نہیں۔۔۔۔۔ بھائی میرے رات کو جو بھی جائداد چل خوار ہوتا ہے۔ اس میں یقیناً چکا ڈروں کی روح ٹھہری ہوتی ہے۔ پولیس کا حکم اس سے منسکی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم بھی یقیناً رات کو حذروری کرتے رہے۔ تب میرے بھائی ہم سب کا جو دردوں پر مشتمل ہوا۔۔۔۔۔“

کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا اور سرود آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”جناب پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ رات ڈھائی بجے والی ٹرین سے مجھے اچھی ٹکڑی سواری مل جاتی ہے۔ اس لئے رات کے اس پہر اسٹیشن کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔“

اچانک ماحول گھوڑے کے نہانے کی آواز سے گونج اٹھا۔ تینوں نے ہڑ بڑا کر سڑک کی جانب دیکھا۔ جونی کوچوان کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لگام ڈھیلی چھوڑی اور گھوڑے نے نہانے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ کوچوان کا پیشاب خطا ہو گیا۔ اور وہ ہٹکاتے ہوئے بولا۔

”سفید کپڑوں میں لپیٹ چڑیل انسان کے

روپ میں میرا تانگہ لے کر فرار ہو رہی ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ انسپکٹر ناصر نے اسے ڈانٹ کر چپ کرادیا اور تو قیر کے ہمراہ تانگے کے پیچھے سڑک کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

جونی نے تانگے پر بیٹھے ہی گھوڑے کی لگام کو ڈھیلنا چھوڑ دیا۔ گھوڑے نے نہانے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسے اپنے پیچھے پولیس والوں کے پیچھے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن جونی نے پرواہ نہیں کی اور سنسان سڑک پر گھوڑا بھاگنا چلا گیا۔ سونیا کی روح اس کے ہمراہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نقش کر رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی اچھی گھوڑا گاڑی چلا سکتے ہو۔“

”دنیا میں کوئی بھی کام مشکل نہیں۔“ جونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا تم اب تمام زندگی یوں ہی میرے ہمراہ در بدر پھرتی روگو۔“

”نہیں سونیا بولی۔۔۔۔۔“ لیکن تم سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا۔

دوے اگر حقیقت جانا چاہتے ہو۔ تو بات صرف اتنی سی ہے کہ انتقام لئے بغیر میں اس دنیا سے واپس جانے کو تیار نہیں ہوں۔“

جونی نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔ ”لیکن ہاشم صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تم بھلا کس سے انتقام کی بات کر رہی ہو۔ اگر تمہارے انتقام کا ہدف حشمت صاحب ہیں تو ہوا پر مشتمل روح ہونے کی بدولت تم بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتی ہو۔“

سونیا سر دھام بھر کر بولی۔ ”میرے انتقام کا ہدف ہاشم صاحب ہی ہیں اور تم یقیناً جانو کہ اگر میں تمہارے ہمراہ نہیں ہوتی۔ تب اب تک تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے حسرت بھری نگاہوں سے دنیا کی آزاد فضاؤں کے متعلق سوچ رہے ہوتے۔ جس طرح میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اسی طرح ہاشم صاحب حشمت صاحب کے

ہمراہ ہیں۔ وہ ہوا پر مشتعل روح ہونے کے بعد تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھنے پر قادر ہیں۔ لیکن میری وجہ سے انہیں مقصد میں ناکامی ہو رہی ہے۔ جب تک میں تمہارے ساتھ موجود ہوں۔ تم ہاشم صاحب کی روح کی دسترس سے دور ہو۔ ہاشم صاحب شہت صاحب کو کھٹ پتلی کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اگر میں نہ ہوں۔ تب وہ تمہاری ہر حرکت کی خبر شہت صاحب کو دے دیتا۔ یوں تم پر کئے پرنڈے کی مانند ان دونوں کے ارد گرد پیڑ پھڑاتے رہتے اور وہ تمہیں با آسانی گرفتار کر لیتے۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ ہوتے ہوئے کھوڑے کو چابک رسید کر دیا۔ کھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

”اب تمہارا آگے کا کیا پروگرام ہے؟“ سونیانے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔۔۔ میرے پاس توقع سے زیادہ رقم موجود ہے۔ میں اچھی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔“

”لیکن اس رقم کو فوراً استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ سونیانے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔ پولیس والوں نے نوٹوں کے نمبر چیک کرنے کے بعد تلاش کرنے کے لئے لکٹھوں کی صورت میں پولیس والوں کو بھجوا دیے ہوں۔ ایسی صورت میں تمہاری تلاش میں یہ نمبر دگارتا بہت ہو سکتے ہیں۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

”واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔“

میرے خیال میں۔۔۔ میں کچھ عرصہ اپنی ذاتی رقم سے گزارا کر سکتا ہوں۔ پالیسی کی رقم استعمال کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔“

”دور بہت دور چند روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا گاؤں تھا۔ جوتیزی کے ساتھ قریب آتا چلا جا رہا تھا۔ جونی نے تانگے کی باگیں کھینچ کر اسے ردک دیا۔ پھر نیچے اترتے ہوئے بولا۔

”پولیس والوں کو میری موجودگی کے متعلق بتانے میں یہ تانگہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسے گاؤں سے دور چھوڑ کر ہم گاؤں جا سکیں گے۔“ سونیانے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں یہ خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ تم تانگے کو سڑک سے ہٹا کر ان پہاڑوں کے درمیان لے جاؤ اور ویرانے میں کھڑا کرنے کے بعد کھوڑے کو تانگے سے آزاد کرنے کے بعد کھلا چھوڑ دو۔ یہ خود ہی اپنے مالک کو تلاش کرتا ہوا گھر چلا جائے گا۔ اگر سڑک پر تانگہ گاڑی کو چھوڑ دو گے۔ تب پولیس والے ارد گرد کے تمام گاؤں میں تمہاری تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیں گے اور تمہیں دوبارہ در بدر ہونا پڑے گا۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور تانگے میں بیٹھ کر اسے سڑک سے اتارنے کے بعد کچھ دور واقع پہاڑی ٹیلے کی جانب چل دیا۔ صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پہاڑی ٹیلوں کے درمیان دروہ نما طویل سلسلہ تھا۔ جونی نے درے کے درمیان تانگے کو روکا اور کھوڑے کو آزاد کرنے کے بعد چابک مار کر اسے سڑک کی جانب بھگا دیا۔ پھر خود سونیا کی روح کے ہمراہ سڑک سے کافی دور واقع گاؤں کی جانب چل دیا۔

تھکاوٹ کی بدولت اسے اپنا جسم ٹوٹا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے کسی آرام و بہتر کی اشد ضرورت تھی۔

گاؤں کے قریب اور سڑک سے ہٹ کر پہاڑی ٹیلے کو صاف کر کے ایک خوب صورت اور جدید ہوٹل تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کا نام ”ماؤنٹ ہوٹل“ تھا۔ کمرہ حاصل کرنے کے بعد جونی نے جب کمرے میں قدم رکھا۔

جب اسے ہر لحاظ سے آرام دہ اور پرسکون پایا۔ جونی نے رقم کے تحیلے کو احتیاط کے ساتھ بیڈ کے نیچے چھپایا۔

پھر کمرے کے دروازے کو لاک کرنے کے بعد غسل کرنے کے لئے ہاتھ روم کی جانب چل دیا۔ اچھی طرح فریش ہونے کے بعد وہ بستر پر آ لیٹا۔ سونیا کی روح آرام دہ کرسی پر بیٹھی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جونی کچھ دیر میں گہری نیند سو گیا۔ وہ پھر کے ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ سونیانے یہی آرام دہ کرسی پر بیٹھی۔ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”تم سوئی نہیں۔۔۔“ جونی نے لاشعوری طور پر پوچھا۔ سونیانے سر دھڑکاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں ایک روح ہوں۔ احساسات سے محروم۔۔۔ خوشی و غم سے مستثنیٰ۔۔۔ ایک ایسی روح جس کا مقصد صرف اپنے محبوب کی حفاظت کرنا ہے۔ وہ بھلا کونکر سو سکتی ہے۔“ جونی نے حرم انگیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ پھر کھانے کے لئے نیچے چال کمرے کی جانب چل دیا۔ گاؤں پر کھڑے ہو کر اس نے منجھوڑ کھانے کا آرڈر دیا اور حال احوال کے لئے منجھوڑ سے کسی تازہ ترین خبر کے متعلق دریافت کیا۔ منجھوڑ کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ منجھوڑ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”کوئی خاص خبر تو نہیں ہے۔ لیکن پچھلے دنوں بہت افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ہوٹل کے پچھواڑے میں کچھ دور ایک پہاڑی گاؤں محض آباد واقع ہے۔ وہاں ایک معصوم اور بھولی لڑکی جھرتا اپنے باپ کے ہمراہ رہتی ہے۔ دونوں باپ بٹی گئے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش گاؤں والوں کی بھیڑ بکریاں چرانا ہے۔ یہ یقیناً کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ لڑکی بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے قریبی جنگل میں گئی۔ راستے میں اس کی ملاقات گاؤں کی ایک عورت زرمینہ سے ہوئی۔ وہ عورت پانی بھرنے کے لئے چشمے کی جانب جانا چاہتی تھی۔ لیکن

دودھ پیتے بچے کی موجودگی میں پہاڑ سے نیچے جانا دشوار تھا۔ اس نے بچے کو لڑکی کے حوالے کیا اور خود پانی بھرنے کے لئے پہاڑ سے نیچے کی جانب چل دی۔ چندہ میں منٹ کے بعد جب وہ پانی بھر کر واپس آئی۔ تب اس نے جھرتا کو زرمینہ پر گرے ہوئے پایا۔ وہ بے ہوش تھی۔ زرمینہ کے بچے کا نام وشنان موجود نہیں تھا۔ جھرتا کے

چہرے پر خاص طور پر ہونٹوں پر تازہ خون کے نشانات موجود تھے۔ اس کے ہاتھ بھی خون سے رنگے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ کہنڈوں پر بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ عورت نے گھبراہٹ کے عالم میں چیختے ہوئے جھرتا کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہوش میں نہیں آ سکی۔ تب عورت نے گاؤں کا رخ کیا۔ اور گاؤں والوں کو اپنے ہمراہ لے کر واپس پہاڑ پر چلی آئی۔

جھرتا کو ہوش میں لانے کے لئے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ جب وہ ہوش میں آ گئی۔ تب اس سے بچے کے متعلق دریافت کیا گیا۔ اس نے لاعلمی کے عالم میں انکار میں سر ہلایا۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلا چلا کر ان پہاڑوں پر جتنے بھی قبائل آباد ہیں۔ وہ سب آزاد قبائل ہیں۔ اس لئے یہاں ان کے اپنے طور طریقے اور قانون کے اصول اپنائے جاتے ہیں۔ اس لئے لڑکی کو پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے گاؤں کے بچوں کے سامنے کیا گیا۔ لڑکی چونکہ گولی بہری تھی۔ اس لئے ترجیح کے لئے ایسے آدمی کا انتخاب کیا گیا جو گولٹے بہروں کی زبان کے متعلق بخوبی آگاہی رکھتا تھا۔ سوال و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ترجمہ کرنے والے آدمی نے بتایا کہ لڑکی بچے کی عدم موجودگی کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے مندرجہ بالا ہاتھوں پر خون کیسے لگا۔

منجھوڑ سوالات کے جوابات اور تھوڑی سی تحقیق کے بعد بچوں نے فیصلہ سنایا۔ ان کے خیال کے مطابق لڑکی آدم خور بن چکی ہے اس لئے سزا کے طور پر اسے سنگسار کر کے ختم کر دینا چاہیے۔ ورنہ اس کا وجود تمام گاؤں والوں کے علاوہ ہر زندہ نفس کے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ ابھی فیصلے پر عملدرآمد نہیں ہو پایا تھا کہ حیرت انگیز طور پر گاؤں کا کھیا آگے بڑھا۔ اور اس نے بچوں سے درخواست کی کہ۔ ”لڑکی کو ختم کر دینا نہایت ظالمانہ عمل ہوگا۔ اس کے بجائے اگر لڑکی کو پاگل خانے میں بھجوا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ لڑکی کی دماغی حالت درست نہیں ہے۔ پاگل خانے میں یقیناً بہتر ہو جائے گی۔“

گاؤں کے زیادہ تر افراد کی ہمدردیاں لڑکی کے ساتھ تھیں۔ اس لئے انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور بچوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے بعد فیصلہ کھیا کے حق میں دے دیا۔ آج وہ پھر لڑکی کو پاگل خانے منتقل کر دیا جائے گا۔ ”منجھوڑ اپنا کھانسی خاموش ہو گیا۔

جونی کو ان باتوں میں کچھ خاصی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اتنا جانتا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات یا پھر

دار Digest 27 January 2013

دار Digest 26 January 2013



آج کے دن پولیس تو ہوٹل میں پوچھ گچھ کرنے نہیں آئی تھی۔ لیکن اس نے پولیس کے متعلق نہیں بتایا۔ جونی نے چند تاسف بھرے جملوں میں انفسوس کا اظہار کیا۔ پھر اپنی میز پر آ بیٹھا۔ سونیا دایاں سو جوتھی۔ لیکن ہوٹل والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ جونی نے اسے جھرتا کے متعلق بتایا۔ تب سونیا نے مکمل دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مکمل انہماک کے ساتھ کيس کے متعلق سنا۔ پھر ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے لڑکی بے گناہ دکھائی دیتی ہے۔ میں معاملے کی تفتیش کر کے کچھ ویرس واپس آتی ہوں۔ تم جب تک کھانا کھاؤ۔“

”میری بات سنو۔۔۔؟“ جونی بولا۔ ”پولیس میری تلاش میں ہے۔ اس لئے میں جلد از جلد یہاں سے آگے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ تم ان فضول چکروں میں کیوں الجھنا جا رہی ہو۔“

سونیا سکراتے ہوئے بولی۔ ”میں پانچ منٹ میں واپس آتی ہوں۔“ وہ اچانک ہی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ دیر نے کھانا لگانا شروع کیا اور جونی نے خاموشی کے ساتھ کھانا کھانا شروع کر دیا۔ ابھی پانچ منٹ مکمل نہیں گزر پائے تھے کہ سونیا دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر فکر انگیز تاثرات تھے۔

جونی نے پوچھا۔ ”خیر تو ہے۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ لڑکی تو خیر خیریت سے ہے نا۔۔۔؟“

سونیا نے انکار میں سر ہلایا۔ ”اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔ میں مکمل معلومات کر کے آتی ہوں۔ اسے سازش کی دلدل میں دھکیلنے والا گاؤں کا کھیا ہے۔ پہلے اس نے لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن گاؤں والوں کے بروقت آ جانے پر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد اس نے قانونی طور پر لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی کوشش کی۔ تب لڑکی کے باپ نے صاف انکار کر دیا۔ کھیا کی اتالڑکی کے حسن کے آگے چٹنا چور ہو گئی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن کچھ بھی کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ تب اسے یہ

تدبیر سوچی اور اس نے موقع واردات پر پہنچ کر لڑکی کو بے ہوش کیا۔ اور بچے کو چھپانے کے بعد لڑکی کے چہرے اور ہاتھوں پر خون لگا دیا۔ گاؤں کے سادہ لوح انسان اتنی عقل نہیں رکھتے تھے کہ بچے کا گوشت کھانے کے بعد بھلا لڑکی بے ہوش کیوں ہو گئی۔ انہوں نے اپنی عقل کے مطابق لڑکی کے خلاف کيس کا آغاز کیا۔ اور اسے سزا سنادی۔ جب کھیا نے غلظتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہلاک کرنے کے بجائے پاگل خانے بھجوانے کا مشورہ دیا۔ گاؤں والوں نے مشورہ قبول کیا۔ اور سزا میں تخفیف کرنے کے بعد کھیا سے درخواست کی کہ وہ لڑکی کو شہر لے جا کر پاگل خانے میں داخل کر دے۔“ سونیا بولی۔

”کھیا کا منصوبہ حسب خشا کامیابی کی جانب گامزن تھا۔ وہ لڑکی کے وجود کا حصول چاہتا تھا۔ جو اسے ملنے والا تھا۔ لڑکی کو پاگل خانے بھجوانے کے بجائے وہ اسے شہر میں موجود اپنے مکان میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ پھر کے چار بجے وہ لڑکی کو اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھا کر شہر لے جانے لگا۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ اس معصوم لڑکی کو انسان کی صورت میں موجود اس بیٹھریے سے بچانے کی کوشش کرو۔ ورنہ اس کے ساتھ ہونے والے انسانیت سوز سلوک کے بعد تمام انسانیت چلا اٹھے گی۔“

جونی پریشان لہجے میں بولا۔ ”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ پولیس مجھے کتے کی مانند ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ لڑکی کے ساتھ پولیس والوں سے کہاں تک بھاگ سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ ایسا بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ حشمت صاحب کا رویہ اور میرے پاس موجود ہے۔ اور میرے خیال میں لڑکی کو ان بھیڑیوں کے جنگل سے نکالنے کے بعد ہم دونوں دین سے آگے روانہ ہو جائیں گے۔“ سونیا نے مطمئن انداز میں اقرار میں سر ہلادیا۔

چار بجے کے قریب دونوں پہاڑوں کے پاس سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پیچھے بیٹھے تھے۔ جنگلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لیکن آوارہ بادل کے سفید نکلنے بھی ہوا کے دوش پر گھومتے پھر رہے تھے۔ نرم گرم دھوپ جسم کو بجلی محسوس ہو رہی تھی۔ سوا چار بجے کے قریب ماحول گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اٹھا۔ سڑک سسنان پڑی ہوئی تھی۔ یہاں ٹریفک ٹاہونے کے برابر تھا۔ پھر بھی احتیاطاً جونی نے سونیا کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ اگر درمیان آتی ہوئی کوئی گاڑی دکھائی دے تو وہ اسے انکار کر دے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور گھوڑا گاڑی سڑک کے موڑ کے پاس سے نمودار ہو کر ان دونوں کی جانب آنے لگی۔ اگلی سیٹ پر کوچوان کے علاوہ کھیا کا ایک آدمی راتقل تھا۔ بیٹھا تھا جبکہ کھیا کی سیٹ پر کھیا کے ہمراہ اٹھارہ سے بیس سالہ لڑکی بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن نفوس غیر واضح تھے۔ جونی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور یو لور کو باہر نکال لیا۔ پھر اسے چیک کرنے کے بعد اٹھ کر کپڑے بھاڑتا ہوا سڑک کی جانب چل دیا۔ گھوڑا گاڑی قریب آ چکی تھی۔ جونی سڑک کے درمیان میں ہاتھ اونچے کر کے کھڑا ہو گیا۔ کوچوان نے ٹانگے کی باگیں پھینچیں اور گھوڑا ہنہناتے ہوئے سڑک کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ کوچوان کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے استفہام نگاہوں سے جونی کی جانب دیکھا۔ لیکن جونی نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور پیچھے بیٹھے ہوئے کھیا کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کی سواری کو روکنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ میرا تعلق پولیس کے خفیہ محکمے سے ہے اور ہمیں یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ آج شام یہاں سے بہت بڑی مقدار میں ہیر دن اسٹگل

کر کے لے جانی جائے گی۔ تکلیف دی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن مختصر چیکنگ کے بعد آپ آگے جاسکتے ہیں۔“ کھیا کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھرے۔ لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی کے ساتھ ٹانگے سے نیچے آ آیا۔ لڑکی مکمل طور پر چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جونی نے جیب میں موجود یو لور کو پھر کر کے ساتھ باہر نکالا اور کھیا کے ماتھے پر رکھتے ہوئے بولا۔

”اب ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ میں بات دوبارہ کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنے آدمی سے کہو راتقل میرے حوالے کر دے۔ ورنہ تمہاری گھوڑی کو بجلی کر دوں گا۔“ اتنی دیر میں کوچوان اور راتقل تھا۔ ہوئے آدمی نیچے آئے۔ کھیا نے سر کے اشارے سے اپنے آدمی کو راتقل جونی کے حوالے کرنے کا حکم دیا اور اس نے خاموشی کے ساتھ راتقل جونی کو تھما دی۔ جونی نے کھیا اور اس کے ساتھی کے جسم کی تلاشی لی۔ وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ شاید وہ حقیقی طور پر جونی کو پولیس کا آدمی گردان چکے تھے۔ پھر جونی نے انہیں منہ دوسری جانب پھیر کر دس قدم دور جانے کا اشارہ کیا۔ اس مرتبہ بھی دونوں نے بلا جوں و جا حکم کی تعمیل کرتے ہوئے منہ سڑک کے مخالف جانب پھیرا اور سڑک سے نیچے اتر کر دس قدم آگے چلے گئے۔

جونی نے پھر کی کے ساتھ ٹانگے پر چڑھ کر کوچوان کی سیٹ سنبھالی اور باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ گھوڑے نے سڑک پر موڑ کاٹنے کے لئے چکر کاٹا۔ پھر شہر کے مخالف جانب بھاگنے لگا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر کھیا اور اس کے ساتھیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیکن اسلحہ پاس نہ ہونے کی بدولت کچھ بھی نہیں کر پائے۔ کچھ ہی دیر میں گھوڑا گاڑی موڑ مڑنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوئی چلی گئی۔

پہاڑی موڑ کے مڑتے ہی جونی نے گھوڑے کو چابک لگایا اور گھوڑا سر پٹ بھاگنے لگا۔ پیچھے بیٹھی گھوڑی لڑکی میں حرکت کے آثار بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پتھر کی مورت بن چکی ہو۔ سونیا

کی روح اگلی سیٹ پر براجمان تھی۔ جونی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”بہت آسانی سے ہمیں مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔“ سونیانے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔  
”کھیا کے دل میں چور تھا۔ وہ اس بات سے باخبر تھا کہ وہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں تم نے پولیس کے متعلق کہہ کر اس کی کھلی بند کر ڈالی۔ اور چونکہ ہم دونوں اچھا چائی کے راستے پر چل رہے تھے۔ ہماری نیت صاف تھی۔ اس لئے خدا کا ساتھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔“

جونی اقرار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔  
”واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے تمام زندگی بے کام کئے ہیں۔ مجھے یادیں کہ میں نے کبھی کوئی اچھا کام بھی کیا ہو؟ اور آج ایسا کرتے ہوئے مجھے عجیب قسم کا اطمینان محسوس ہوا ہے۔ لیکن اب اس لڑکی کا ہم کیا کریں۔ اسے ہمراہ لے کر بھٹکانا ممکن نہیں ہے۔“

سونیا بولی۔ ”وہ کسی اچھے اور بڑے شہر پہنچنے کے بعد کسی دارالالمان میں پہنچا دیں گے۔ اسے لاوارث چھوڑ دینا بہتر نہیں ہوگا۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ ہوتے ہوئے گھوڑے کو دوبارہ چابک رسید کر دیا۔ گھوڑے کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔ پہاڑی علاقے کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ پہاڑ نہایت سرسبز و شاداب تھے۔ جن پر چڑھ کے درختوں کا گھنا جنگل آباد تھا۔ آسمان پر بادل گھرتے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ وہ تینوں بارش کے چھینٹوں سے محفوظ تھے۔ لیکن ارد گرد در در تک آبادی کا نام و نشان نہ ہونے کی بدولت اب جونی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں سڑک پر ہونے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ گھوڑا بھی تھکن سے چور ہونے کی بدولت خراباں خراباں چل رہا تھا۔ جونی نے خاموش بیٹھی ہوئی سونیا کی جانب دیکھا۔ پھر جھنجھلا کر بولا۔

”تم بھلا کیسی روح ہو۔ ہم دونوں کے لئے کسی مناسب رہائش گاہ کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی ہو۔ ہم سڑک پر بادباراں کی بدولت آکر کمر جا سیں گے۔ کیا تمہیں

اچھا لگے گا۔“ سونیانے مسکراتے ہوئے جونی کی جانب دیکھا اور بولی۔

”یہاں سے کچھ دور سڑک سے ہٹ کر پہاڑی ٹیلوں سے پرے ایک خوب صوب وادی کے درمیان تائی ماں کا ککڑی کا مکان واقع ہے۔ وہ گرمیوں کے سیزن میں اوپر کا پورٹن کرائے پر دیتی ہے۔ یہی اس کی گزربس کا ذریعہ ہے۔“ جونی نے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے پہلے کی طرح گھوڑے کو تانگے سے علیحدہ کر کے آزاد چھوڑ دیا اور تانگے کو گھنے درختوں کے جھنڈ کے درمیان چھپانے کے بعد طوفانی انداز میں برسی بارش کے درمیان پہاڑ کے دوسری جانب وادی کی طرف چل دیئے۔ لگا تار بارش کی بدولت چٹانیں مٹی سے بنی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن جونی اور لڑکی کسی نہ کسی طرح انہیں پھلانگتے ہوئے سونیا کے ہمراہ اوپر چڑھتے چلے گئے۔ چوٹی پر پہنچنے پر سورج غروب ہو گیا اور چاروں جانب اندھیرے کی سیاہ چادر پھیلی چلی گئی۔ بارش اب بھی متواتر برس رہی تھی۔ جونی اور لڑکی کے کپڑے پانی کی بدولت شرابور ہو رہے تھے۔ اور شدید سردی کی وجہ سے ان دونوں کے دانت بچ رہے تھے۔ قدم اٹھانا مشکل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن رکنا موت کے مترادف تھا۔ ستم پر مزید ستم یہ کہ گھپ اندھیرے کی بدولت کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا سی غفلت کی بدولت وہ کسی گہری کھائی میں گر سکتے تھے۔ پہاڑ سے نیچے وسیع و عریض میدان کے درمیان انہیں ٹٹھانی ہوئی چند روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ ان دونوں کے قدم تیز ہونے لگے۔ پہاڑ سے نیچے اترنے کے بعد انہوں نے خود کو گھسیٹتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹٹھانی ہوئی روشنی لائین کی تھی۔ اور ککڑی کے دھنزل گھر سے باہر آ رہی تھی۔

میدان میں درختوں کی بہتات تھی۔ اندھیرے کی بدولت یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ درخت کون سے پھلوں کے تھے۔ مکان کے ارد گرد چار دیواری موجود نہیں تھی۔ ککڑی کے برآمدے کے آگے کمرے کے دو دروازے دکھائی دیتے تھے۔ برآمدے میں چند گیلے اور

ککڑی کی دو کرسیاں موجود تھیں۔ جونی نے آگے بڑھ کر دروازے کو کھٹکھٹایا اور انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ ایک ضعیف عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں لائین موجود تھی۔ چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ ہال اور کھنوس سفید تھیں اور کمرے کی بدولت چمکی ہوئی تھی۔ جونی اور لڑکی کی جانب بھڑکے ہوئے وہ بولی۔

”کیوں دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔؟“  
”ہمیں کمرہ چاہئے۔“ جونی ساجت بھرے لہجے میں بولا۔ سڑک کے پاس ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ آپ کمرہ کرائے پر دیتی ہیں۔ اس لئے پہاڑ کو عبور کر کے یہاں تک چلے آئے۔“

یورپی عورت نے ترحم بھری نگاہوں سے ان دونوں کے بارش کے پانی سے شرابور جسموں کی جانب دیکھا۔ پھر ایک جانب ہٹتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جونی اور لڑکی نے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرہ گیس کے ہیٹر کی بدولت گرم تھا۔ وہاں آرائش کا مزید سامان موجود نہیں تھا۔ سوائے گیس کے ہیٹر کے سامنے لگے ہوئے نرم نرم بستر کے۔ گیس کے ہیٹر کے ساتھ لوہے کا نیلے رنگ کا سلنڈر منسلک تھا۔ ایک سائینڈ سے میڑھیال چھت کی جانب جاری تھیں۔ مکان مختصر لیکن صاف ستھرا تھا۔ یورپی عورت نے دونوں کو گیس کے ہیٹر کے پاس بیٹھنے کے لئے کہا اور خود کمرے کے دوسری جانب موجود باورچی خانے کی جانب چل دی۔ کچھ دیر میں ہی وہ چائے بنا کر لے آئی۔ انہوں نے چائے پی۔ پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اوپر موجود کمرے کی جانب چل دیئے۔ اوپر کے کمرے میں مکمل فرنیچر موجود تھا۔ بیڈ۔۔۔ آرام دہ کرسی۔ الماری۔۔۔ سامنے والی دیوار میں بہت بڑی ککڑی بنی ہوئی تھی۔ جس کے آگے پھولدار پردے لگے ہوئے تھے۔

یورپی عورت نے انہیں کمرے میں چھوڑنے کے بعد دوسرے دن نیچے آنے کی نصیحت کی۔ پھر خاموشی کے ساتھ باہر چلی گئی۔ وہ دونوں دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔

اس لئے بستر پر گرتے ہی سو گئے۔ تھکن کی بدولت نیند خوب آئی۔ صبح سات بجے کے قریب جونی کی آنکھ جھٹکے کے ساتھ کھل گئی۔ گوئی لڑکی بستر میں موجود نہیں تھی۔

سونیا کی روح نہ جانے کہاں تھی۔ ککڑی کے پردوں سے چھن کر سورج کی روشنی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ جونی نے انگڑائی لی۔ پھر لحاف کو ہٹا کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ گزشتہ رات کی بھرپور نیند کی بدولت وہ اپنے جسم میں خوشگوار قسم کی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر جھٹکے کے ساتھ پردوں کو ہٹا دیا اور ککڑی کے پتے کھول دیئے۔ سامنے جو منظر موجود تھا۔ وہ شاید تعویذی دنیا میں موجود کسی جنت کا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کے عالم میں پھٹتی چلی گئیں۔

گزشتہ رات کی طرح موسلا دھار بارش کی بدولت دھلا ہوا وسیع میدان جس میں پھلوں سے لدے ہوئے درخت موجود تھے۔ ایک پہاڑی جھرا درمیان میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ جس کے پانی سفید و دوہ کی طرح صاف و شفاف تھے۔ چٹکیں دھوپ اور گہرا نیلا آسمان۔۔۔ گھاس کے درمیان میں کہیں کہیں سرخ نیلے پیلے پھولوں کے دستے یوں کھلے ہوئے تھے جیسے گھاس کے وسیع و عریض خطے میں جان بوجھ کر انہیں رکھ چھوڑا گیا ہو۔ اس خوب صورت جنت میں رنگ برنگی خوب صورت تھیلوں کی بہتات تھی۔ جونی سانس روکے اس خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ حیرت کے مارے اس کا منہ کھلا ہوا تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی خفیف آواز سنائی دی اور وہ چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکی جس کا نام شاید جھرا تھا۔ اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ بیڑی کی جانب چلی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دارسیاہ رنگ کے بال کھل کر چہرے پر بکھر رہے تھے۔ ناک ستوال اور ہونٹ سیب کی کاشوں کی مانند پتلے تھے۔ رنگ گندمی تھا۔ اور مجموعی طور پر وہ خوب صورت ہونے کے علاوہ کچھ کوشش بھی تھی۔ جسم کے نشیب و فراز تاجی چادریں والے تھے جبکہ شریقی آنکھیں رنگ برنگی تھیلوں کی مانند پھڑک رہی تھیں۔ جونی کو اپنے



ہوا کہ اتنی خوب صورت اور حسین لڑکی گوئی بھری تھی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر دوبارہ لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور  
 مہرا نئے ہوئے لہجے میں بولی۔  
 ”آج سے پندرہ میں سال قبل میری بھی ایک  
 لڑکی تھی۔ جس کا نام سعدیہ تھا۔ وہ بھی گنگوٹی تھی۔ بیمار  
 ہو کر مر گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جبرناکی  
 صورت میں زندہ ہو کر دوبارہ اس آگئی ہے۔ آج سے میں

اسے اپنی لڑکی مانتی ہوں۔ یہ میرے پاس نہیں رہے گی۔ میں اپنی منہ بولی لڑکی کو اپنی نگاہوں سے دور نہیں ہونے دینا چاہتی۔“ کچھ دیر رکنے کے بعد وہ طویل سانس لیتے ہوئے دوبارہ منکلام ہوئی۔

”اگر تم برائہ مانو..... تو میں تم دونوں کی شادی اپنے گھر میں دھوم دھام سے کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم دونوں کو اسی وادی میں میرے ہمراہ رہنا ہوگا۔“ جونی نے حیرت بھری نگاہوں سے تائی ماں کی جانب دیکھا۔ اس نے اتنے سارے فیصلے یکدم ہی کر ڈالے تھے۔ ان دونوں کی مرضی جانے بغیر..... جبراً تاکہ ساتھ شادی کے لئے دو دل کے ساتھ راضی تھا۔ لیکن شہر سے اتنی دور رہنا اس کے اختیار سے

باہر تھا۔ حالانکہ جگہ بہت خوب صورت تھی۔ لیکن کسی جگہ مستقل سکونت اختیار کرنا۔ اس لئے بھی اس کے اختیار سے باہر تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اور اس بات سے کچھ ہیڈ نہیں تھی۔ کہ کسی بھی وقت وہ اسے تلاش کرتی وہاں پہنچ جائے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس نے بحالت مجبوری اقرار میں سر ہلایا اور خاموشی کے ساتھ

ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے غسل کیا۔ پھر اس خوب صورت دادی کی سیر کے لئے باہر نکل گیا۔ مکان کے ایک جانب مرغیوں کا مختصر لیکن

نہایت صاف ستھرا پولٹری فارم ہوتا ہوا تھا۔ دوسری جانب بھڑکریوں اور کھینوں کا باڑہ تھا۔ یقیناً تانکی ماں کی گزر بسر کا ذریعہ یہی جانور اور پرندے تھے۔ درختوں میں سیب، آڑو، خوامی اور ناشانی کے درخت بھی موجود تھے۔

لئے تیار ہوں۔ تم نے جو کہا ہے کرلو۔ میں گلہ شکوہ نہیں کروں گا۔ لیکن جھڑپ کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم مجھے میرے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔“

سونیا پر ہنسی کا لہجہ میں ہوئی۔ ”ٹھیک ہے اگر تم بے وفائی کرنے پر بضد ہو۔ تو میں کچھ بھی نہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

”مثلاً..... تم کسا کر دے گی؟“ جونی نے طنز پر لہجہ

میں پوچھا۔ ”کیا میرا گلاب دادو گی۔ اگر ایسا کر سکتی ہو۔ تب میں بخوشی تیار ہوں۔ آؤ اور میرا گلاب دادو۔“

”میں شہمت صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔“

سو فیما سر دلچسپی میں بولی۔ ”وہ تم کے حصول کے لئے تمہاری تلاش میں سرگرواں ہیں۔ میں جب انہیں بتاؤں گی کہ تم شمالی علاقہ جات کے قریب پہاڑوں کے درمیان میں موجود خوب صورت وادی میں لکڑی کے ایک گھر میں چھپے بیٹھے ہو۔ تب وہ شکاری کتے کی طرح تمہاری ہوسو گھٹتا ہوا یہاں دوڑا چلا آئے گا اور ایک دھوا گرتم بولیس کے

مجھے چڑھ گئے تب تمہیں پھانسی چڑھنے سے کوئی بھی نہیں بچا پائے گا۔ تم رگم کے علاوہ میرے قتل کے الزام میں بھی ملوث ہو۔ ثبوت کے طور پر رگم قزاقی کے فوراً بعد پولیس تمہیں پھانسی پر چڑھا دے گی۔“ سوسنا خاموش ہوئی۔ اب کی دفعہ جب جونی بولا تب اس کے لہجے میں پریشانی کا غماص اُجھاتا تھا۔

”لیکن بھلا میری گرفتاری اور پھاسی سے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا۔“

سونیابولی۔ ”تمہارا کڑا وجود پھانسی چڑھنے کے بعد مٹی میں مل جائے گا۔ اور درج آزاد ہو جائے گی۔ اس دنیا میں رہ کر ہمارا ملن ناممکن ہے۔ لیکن روضوں کی دنیا میں ناممکن ہے۔ جیت بلا خرمیری ہی ہوگی۔“

جونے کے ہاتھ پر نگر انگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کلوڑی کے مکان کی جانب چل دیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا۔

کیڑے پہنانے کے بعد اس کے لمبے بالوں میں کنگھی







## جنات کا مہمان

ایس اقبال احمد - کراچی

رات کا گھنٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، نوجوان کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک باریش بزرگ اس کی چارپائی کے قریب کھڑے تھے انہوں نے نوجوان کا ہاتھ پکڑا تو نوجوان پر ایک عجیب سحر طاری ہو گیا۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی با ذوق لوگوں کے لئے بہت ہی اچھی اور دلچسپ کہانی

**شاہد** (پرچن کا سایہ ہو گیا..... شاید کے سر پرچن آنے لگا..... لوہاری گیٹ سے شای مسجد تک چاروں طرف اسی بات کا چرچا تھا۔ خصوصاً عورتوں اور بچوں کے لئے یہ خبر بہت زیادہ اہم تھی..... گھر کے کام و خندوں کے بعد جہاں دیکھو دو چار خاتون بیٹھی ہوئی اسی تذکرے میں مصروف رہتیں۔

شاہد! مسجد میں اپنے والد صاحب سے قرآن شریف حفظ کرتا تھا..... قرأت بھی اس کی بہت عمدہ لڑکا تھا..... اس کے والد شای مسجد میں ملازم تھے، یہ مسجد اس قدر وسیع ہے کہ ایک وقت میں ہزاروں آدمی یہاں نماز ادا کر سکتے ہیں اس کے ایک جانب قلعہ اور دوسری طرف یادگار اور مغربی سمت بازار سن اور جنوب کی طرف ایک میدان پڑتا اور پھر سڑک ملتی ہے۔

شاہد! ایک متوسط گھرانے کا سولہ سالہ

راستے سے ہٹا دو۔ تم نے ایسا ہی کیا۔ اب ہم دونوں کے درمیان کوئی بھی نہیں ہے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے محبوب ہیں۔“

جونی کو اپنے دماغ میں غصے کی شدت سے آتش فشاں پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک معمولی روح نے اسے بے وقوف بچے کی مانند اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ اور وہ کسی بے بس کھلونے کی مانند اس کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہا۔ اسے اپنے جسم کا فضا خون آسمان کی بلند یوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔

جونی نے چیختے ہوئے کمرے کے سامان کو ادھر ادھر پھینکا شروع کر دیا۔ سو نیا کی روح استہزائیہ انداز میں قہقہے لگنے لگی۔ ان قہقہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور جونی مکمل طور پر پاگل ہوتا چلا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی حس مفقود ہو گئی۔ اس نے پاگل باگھی کی مانند کمرے کے سامان کو درہم برہم کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بیٹہ کوالتے ہوئے وہ اس بات کو مکمل طور پر فراموش کر گیا کہ اس کے اوپر سو مہینوں کا اسٹینڈ بھی رکھا ہوا تھا۔ سو مہینے بچہ موجود لکڑی کے سامان پر گر گریں اور لکڑی کے سامان کے علاوہ کپڑوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ لیکن غصے کی شدت کی بدولت جونی کی آنکھوں پر پٹی بندھ چکی تھی۔ اس لئے اس نے توجہ دینے کے بجائے توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ دیر میں ہی آگ نے شدت اختیار کر لی۔ جونی کو ہوش اس وقت آیا جب آگ نے اس کے کپڑوں کو بھی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی۔

جونی نے حیرت بھری نگاہوں سے کمرے میں تیزی کے ساتھ پھلتی ہوئی آگ کی جانب دیکھا۔ پھر بدحواس قدموں کے ساتھ اپنے جسم پر پھینکی ہوئی آگ کو بجھاتا ہوا نیچے بال کرے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے سامنے کی جانب کپڑوں پر لگی ہوئی آگ تو ہاتھوں کی مدد سے بجھا لی۔ لیکن کمر پر لگی ہوئی آگ کو بجھنا نہیں پایا۔ پوکھلائے ہوئے قدموں کے ساتھ اس نے سیڑھیاں پھیلائی اور نیچے والے کمرے میں قدم رکھے



تھی..... اس کے والد گھر زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے عموماً مسجد میں ہی رہتے البتہ ہفتہ 15 دن میں گھر آ کر ضروریات گھر کی پوری کر دیا کرتے تھے۔ شاید ان کو روزانہ کھانا دینے جانا اور رات میں کبھی گھر واپس آ جانا کبھی والد صاحب کے پاس ہی رہ جاتا۔۔۔۔۔

شاید پرچن کا اثر کیسے ہو گیا؟

یہ کسی کو معلوم نہ تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو گھر والے اس بات کو پھیلانا نہیں چاہتے تھے یا پھر کچھ اور بات تھی جس کی وجہ سے اگر کوئی اس سے ملنے گھر جاتا تو انہیں ملنے نہیں دیا جاتا۔۔۔۔۔ والد کے لئے کھانا لے کر اب بھی جاتا تھا لیکن اب یادگار سے ہو کر جانے کے بجائے قلعہ اور میدان سے ہوتا ہوا شاہی مسجد پہنچتا۔۔۔۔۔

اس واقعہ کے بعد شاید اکثر راستے میں مجھ سے ملتا تھا۔۔۔۔۔ وہ چونکہ میرا دوست تھا، اس لئے حسب معمول میں نے پرانی بے تکلفی سے اس سے پتا کرنا چاہا لیکن اب اس کا یہ حال تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر کترانے لگا اور مجھے دیکھ کر راستہ بدل دیتا۔ آ منا سامنا ہونے کی صورت میں بھی آنکھیں پٹی کئے رہتا۔ اور بے تکلفی سے گزرنے کی کوشش کرتا۔۔۔۔۔ مجھے اس کے اس رویہ پر بڑی حیرت تھی مگر دن تک سوچنے کے بعد میں نے اصلیت کا پتہ لگانے کا ارادہ کیا۔ تاکہ معلوم ہو کر وجہ کیا ہے؟

ادھر میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مجھے شاید سے تہائی میں ملنے کا موقع ملے، ادھر شاید کے گھر میں ایک دھما چوڑی مچی ہوئی تھی، گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود عورتوں نے اس کے پاس پہنچنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ جس کو دیکھو کوئی نہ کوئی حاجت لئے اس کے پاس پہنچتی رہتی لیکن شاید کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی عورت گھر میں داخل ہوئی اس نے کہا شروع کیا۔۔۔۔۔

”ارے یہ کون غیر عورت گھر میں داخل ہوئی ہے۔ اسے روکو۔۔۔۔۔ اسے روکو۔۔۔۔۔“

اور پھر عورت کے داخل ہونے سے قبل ہی دوڑ کر کمرے میں چھپ جاتا۔ باہر لایا جاتا تو وہ یہی جواب دیتا۔ ”میں غیر عورتوں کے سامنے کیسے آؤں؟“

آخر بڑے اصرار کے بعد وہ باہر آتا اور آنے سے قبل وہ اپنے سر پر کوئی چادر یا دو پٹہ ڈال لیتا اور جب عورتوں میں آ کر بیٹھتا تو اس کی حالت ایسی ہوتی جیسے کوئی شرمیلی دلہن گھونگھٹ کے عورتوں میں بیٹھی ہو۔۔۔۔۔

اس کے بعد پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا۔۔۔۔۔ عورتیں جو کچھ پوچھتیں وہ گردن جھکائے بہت ہی آہستہ سے جواب دیتا۔ لیکن جب سوالوں کی بھرمار ہوتی تو وہ آہستگی سے جواب دیتے ہوئے کہتا۔

”آپ لوگ کیوں پریشان کر رہی ہیں؟ دو بارہ نمبرے پاس آنے کی کوشش نہ کریں۔۔۔۔۔ غیر مردوں کے سامنے عورتوں کو نہیں آنا چاہئے۔“

اس کے اس جواب کا یہ مطلب ہوتا کہ اب مجلس درخواست کر دی جائے۔

آنے والی عورتوں کو کیا ملتا اور کیا نہیں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن دیکھا یہ گیا کہ آنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی۔ بعض عقیدت مند عورتیں مٹھائی یا دوسرے تحفے لے کر آتیں لیکن نہ تو شاید ہی اور نہ گھر والے وہ لائے ہوئے تحفے قبول کرتے اور بڑے اخلاق اور معذرت کے ساتھ ان کو واپس کر دیتے۔۔۔۔۔

پھر رفتہ رفتہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان عورتوں کے گروہ ہو گئے۔ ان میں ایک مداحوں اور دوسرا مخالفوں کا تھا۔۔۔۔۔ مداح عورتیں شاید سے متعلق ہر ملنے جلنے والی سے سننے سننے قصے بیان کرتیں۔۔۔۔۔ ان کے اس قصہ گوئی میں کچھ ملاوٹی جاشیہ آرائی بھی ہوتی جس سے مخالف گروپ کی عورتوں کو بات کرنے کا موقع ملتا اور وہ کسی نہ کسی طرح مداح عورتوں کو نیچا دکھانے کی تاک میں رہنے لگیں۔۔۔۔۔

چنانچہ اب مجلس میں سوالات اور معمولات کے ساتھ ساتھ احتمالی سوالات کا بھی اضافہ ہو گیا تھا اس کے علاوہ مخالف گروپ کی عورتوں نے پروپیگنڈہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اور اب وہ سب سے یہی کہتیں۔

”اے ہم تو جب جانیں کہ جو کچھ ہم کہیں وہ

ہمیں منگا کر دے۔۔۔۔۔“

اور پھر محفل فرمائشوں کا اکھاڑہ بن گئی۔۔۔۔۔ ایک عورت بولی۔

”ہمیں تو اسی وقت موگرے“ بیلے کے پھول چاہئے۔“

یہ آواز سن کر شاید نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر فضا میں بلند کیا۔ ہاتھ کی منحنی بند کی اور اسے دو تین مرتبہ گردش دے کر نیچے کر کے منحنی کھولی تو اس میں تازہ تازہ موگرے کی ٹکیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی تو ڈکرائی گئی ہیں۔۔۔۔۔ ایک روز!

ایک عورت نے اٹا پٹیس کی فرمائش کی۔۔۔۔۔ وہ بھی اسی طرح پوری ہوئی لیکن مخالف گروپ اب بھی مطمئن نہ تھا۔۔۔۔۔ اس لئے ایک عورت نے تازہ تازہ گلاب جامنوں کی فرمائش کی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس قسم کی فرمائش کے متعلق پہلے سے طے کر کے آئی تھی، اس نے سوچا ہو گا کہ بندھنی میں مٹھائی کا آنا مشکل ہے مگر گلاب جامنوں کی فرمائش سن کر شاید نے فضا میں ہاتھ گھمایا اور پھر اس خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے آپ کے پاس گلاب جامن ہیں۔۔۔۔۔“ شاید کی بات سن کر وہ خاتون بہت زیادہ پریشان ہوئیں پہلے تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پراپنے جسم کے آس پاس دیکھنے لگیں یکا یک ان کا ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے دوپٹے پر پڑا۔۔۔۔۔ خاتون ایک دم گھبرا کر اچھل پڑیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے سانپ پکڑ لیا ہو، اس اچھل کود میں ان کے دوپٹے کا پلو ہٹا تو سب کی نظروں کے سامنے ایک ہالسی کی بنی ہوئی چھوٹی سی نوکری کے اندر کاغذ میں لپیٹی ہوئی گلاب جامنیں موجود تھیں۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔۔۔۔۔ دوسری عورتیں یہ کرشمہ دیکھ رہی تھیں اب سب حیرانگی کے عالم میں تھیں کہ شاید نے آہستہ سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں جتنا توں کا سردار ہوں۔۔۔۔۔ میں خود کسی

کو پریشان کرنا پسند نہیں کرتا، اسی لئے آپ لوگ بھی آئندہ مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہ کریں، میں تو اس لڑکے کے پاس صرف قرآن شریف سننے آتا ہوں۔۔۔۔۔“

اس واقعہ کے بعد پھر کسی عورت نے سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔۔۔۔۔ لیکن ایک دو روز بعد ایک دوسرا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک روز ایک صاحب نے اپنی لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ”جہاں لڑکی کی بات چیت چل رہی ہے کیا وہ جگہ مناسب ہے؟“

شاید! ان کا سوال سن کر بڑی دیر تک سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے سر تھوڑا اونچا کرتے ہوئے کہا۔

”جس جگہ لڑکی کی بات چل رہی ہے وہ جگہ مناسب نہیں ہے۔۔۔۔۔ لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔“

اور ہوا بھی یہی ان صاحب نے شاید کا جواب سن کر جب اچھی طرح انکوائری حاصل کی تو پتہ چلا کہ یہ بات سچ ہے۔

اسی طرح ایک محترمہ کا 14، 15 سالہ لڑکا ایک بیٹے سے غائب تھا۔ پولیس میں بھی رپورٹ لکھوائی گئی اور لاہور سے باہر رہنے والے عزیزوں کو خط اور ٹیکس کئے گئے۔ لیکن ہر جگہ سے نفی میں جواب ملا ماں باپ پریشان تھے۔

ماں نے جب اپنے لڑکے کے متعلق شاید سے سوال کیا تو وہ پہلے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

”آج شام تک لڑکا واپس آ جائے گا۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ اسی دن شام کو ان کے صاحبزادے صاحب تشریف لے آئے۔۔۔۔۔ ہوا یہ تھا کہ وہ ماں باپ کے لاڈلے تھے، ایک دن ماں باپ نے کسی بات پر ڈانٹا۔۔۔۔۔ وہ اس چیز کو برداشت نہ کر سکے اور گھر سے نکل گئے اور پھر خود ہی گھر آ گئے۔

لیکن! مجھے تو ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی



## کباڑی

وہ دونوں رستوران میں بے فکری سے چائے پینے میں مصروف تھیں کہ عمر رسیدہ عورت نے آگے جھک کر اپنی جواں سال ساتھی سے سرگوشی کی..... سامنے والی میز پر بیٹھا ہوا آدمی بار بار میری طرف دیکھ رہا ہے..... جواں سال لڑکی نے مرکز اس آدمی پر ایک نگاہ ڈالی اور بے نیازی سے بولی..... میں اسے جانتی ہوں کباڑی ہے..... ہر جگہ پرانے اور ناکارہ مال کی تلاش میں رہتا ہے۔ (شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہار)

بلکہ اسے قلعہ کبنا مناسب ہوگا..... صدر دروازے کے باہر سفید، سفید دھواں اٹھ رہا تھا، کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا تھا اس لئے کہ آگ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لیکن دھواں زمین کے مساموں سے نکل رہا تھا اور پھر نکل کر ایک جانب ہو جاتا یہ دھواں صرف ایک جگہ سے نکل رہا تھا جگہ جگہ یہی حالت تھی، بزرگ نے قریب پہنچنے کے بعد ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر فوراً ہی دھوؤں میں زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ دیکھتے، دیکھتے دھوؤں کے بجائے کچھ لوگ انسانوں کے روپ میں کھڑے ہوئے نظر آئے بزرگ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا

”یہ دروازے کے پورے دار ہیں۔“

سب انے جھک کر سلام کیا۔ بزرگ سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، جب ہم دروازے کے پاس پہنچے تو بہت بڑا دروازہ خود بخود کھل گیا! لیکن کھولنے والے کون تھے؟ یہ نہیں معلوم اس لئے کہ کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا جب ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک بہت بڑی عمارت تھی، لیکن اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے سامنے ایک کشادہ باغ تھا، وہ باغ کیا تھا جنت کا گمان ہوتا تھا رنگ پر نگے پھول کھلے ہوئے تھے، ہمز

اس لئے کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ اس برجی کے نیچے اسکول کا باغ تھا۔ پھر یہ دروازہ کہاں سے آگیا؟ جو کچھ بھی تھا..... بہر حال یہ بات میں خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

جب ہم دونوں دروازے کے پاس پہنچے تو میں نے دیکھا کہ نیچے جانے کے لئے بڑی خوبصورت سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرے لئے یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے کہ پوری شاہی مسجد سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں کہیں بھی سنگ مرمر استعمال نہیں کیا گیا۔ لیکن اس دروازے میں سیڑھیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر میری سمجھ میں یہ مطلب آیا کہ شاید دروازے تک مسجد کی حد ہے اور سیڑھیوں کے بعد کچھ اور ہے.....

ہم دونوں دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے لیکن جتنے زیادہ نیچے اترتے جاتے تھے اتنی ہی زیادہ روشنی ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ جب سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے دن نکل آیا ہو۔ معلوم نہیں یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ میں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان یا چاند سورج کسی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن میری نظروں کے سامنے ایک پورا شہر تھا۔ اونچے نیچے کی، کئی منزلہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ سڑکیں کشادہ تھیں۔ وکائیں گھٹی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغ تھے۔ کافی چہل، پہل بھی، لوگ چل پھر رہے تھے۔ ان چلنے پھرنے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی..... بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔

ہم دونوں چلتے رہے..... بزرگ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ راستے میں فرض ان کو سلام کر رہا ہے اور پھر ان کے گزرنے تک ایک جانب ہٹ کر ادب کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ چلتے، چلتے آخر کار ہم ایک مکان کے سامنے رکے..... مکان بہت بڑا معلوم ہوتا تھا، مکان کیا تھا،

میں نے ان بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن خوف کی وجہ سے باہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں ضرور دیکھ رہا تھا..... :  
”تم اپنے دل سے خوف دور کرو..... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آؤ ذرا میرے ساتھ چلو۔“ بزرگ نے کہا۔

میرے لئے ان کا کہنا ماننے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اس لئے کچھ سوچے کچھ بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔  
ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے مسجد کے صحن میں دیکھا، اس وقت چاندنی نکلی ہوئی تھی، ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ کچھ فاصلے پر ان بزرگ کی طرح کچھ اور لوگ بھی آ جا رہے تھے۔ لیکن کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے، میں بالکل نہ سمجھ سکا.....

”آؤ! میرے ساتھ۔“ بزرگ میرا ہاتھ تھامے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں جا رہا ہوں؟ میری تو اس وقت ایسی حالت تھی جیسے مجھے پتہ ناگزیر کر دیا گیا ہو۔

اب بزرگ اور میں دونوں ساتھ، ساتھ مسجد کے صحن میں چل رہے تھے، ہمارا رخ موقتاً تالاب کی جانب تھا جب پورا صحن پار کر کے آخری دالان کے قریب پہنچے تو ہمارا رخ اسلامیہ ہائی اسکول کی جانب ہو گیا، میرا ہاتھ اب بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

مسجد کی چھوٹی برجی کے پاس پہنچ کر وہ بزرگ ایک لمحے کے لئے ٹھہرے، انہوں نے کچھ دیر تک برجی کی بنیادوں کو دیکھا پھر ہاتھ سے ایک لکیر بتاتے ہوئے اشارہ کیا۔

ایک! میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ کے لئے غبار چھا گیا جس کی وجہ سے میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے غبار صاف ہونے کے بعد سامنے ایک دروازہ تھا، اس دروازے کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔

نہ تھی..... میں تو اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا..... اس لئے..... میں شاید سے تنہائی میں ملنے کی فکر میں رہا..... ایک روز وہ مجھے میدان میں جاتے ہوئے ملا..... میں اسے بڑے تالاب کے کنارے لے گیا۔ اس لئے کہ اس قسم کی باتوں کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی.....

چٹانوں پر بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پورا واقعہ سنانے کو کہا..... پہلے تو وہ انکار کرتا رہا، آخر بڑی مشکل سے راضی ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں شاہی مسجد میں ابو سے قرأت سکھ رہا ہوں۔ کبھی میں گھر آجائے آ جاتا ہوں اور کبھی رات میں دین رہا جاتا ہوں.....“

یہ اب سے کئی مہینے پہلے کی بات ہے ایک رات میں مسجد کے باہر لان میں سو رہا تھا..... والد کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے وہ حجرے میں تھے..... سوتے میں اچانک ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اٹھا کر بیٹھا دیا ہو، پہلے تو نیند کے غمار میں بات سمجھ میں نہ آئی لیکن پھر فوراً ایک عجیب قسم کا احساس ہوا جیسے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا تو مجھے اپنے سر ہانے ایک بزرگ کو کھڑے ہوئے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ”یہ کون صاحب ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟“

اس سے پہلے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا..... حلیہ بھی عجیب تھا..... سفید اجلا لباس پہنے ہوئے تھے ہوا بھی بھی سفید تھی چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور تھا اور وہ میرے سر ہانے خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے۔

اس حلیہ میں ایک اجنبی کو آدمی رات کے وقت اپنے سر ہانے اس طرح کھڑے ہوئے دیکھ کر مجھے ڈر کی وجہ سے پسینہ آ گیا۔ اس قدر خوف زدہ تھا کہ بجا گئے کا خیال کیا تو ہانگوں میں طاقت نہ تھی..... چیخنے کی کوشش کی تو آواز نہ نکل سکی۔ مجھے اس طرح پریشان ہوتا دیکھ کر ان بزرگ نے دلاسا دیتے ہوئے شانے پر ہتھکی دی۔  
”گھبراؤ نہیں بیٹے! ڈرنے کی ضرورت نہیں؟“ انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

گھاس قرینے سے لگا گئی تھی، پرندے چپک رہے تھے جگہ جگہ پھل دار درخت کھڑے ہوئے تھے، بڑے بڑے خوش تھے جن میں فوارے چل رہے تھے، میں نے اتنا خوبصورت باغ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، دل کر رہا تھا کہ یہاں کی دل بھر کر سیر کروں لیکن وہ بزرگ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے چل رہے تھے۔

عمارت! میں داخل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ کافی تعداد میں مرد و عورتیں اڑکے اور لڑکیاں چل پھر رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب یا تو خدام ہیں یا نچلے درجے کے جن ہیں۔ اس لئے کہ بزرگ کو دیکھ کر جس طریقے سے وہ ان کا ادب کر رہے تھے وہ ان کے خادم ہونے کا ثبوت تھا۔ کئی جگہ میں نے بچوں کو کھیلنے بھی دیکھا، وہ بزرگ کو دیکھ کر احترام سے کھڑے ہو گئے، کسی عورت یا لڑکی نے مجھے دیکھ کر نہ ہی کوئی پروہ کیا اور نہ چپکنے کی کوشش کی۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یا تو ان میں پردے کی رسم نہیں ہے یا پھر مجھ سے پردہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ ویسے راستے میں عورتیں ملی تھیں میں نے ان کے چہروں پر نقاب جیسی چیز دیکھی تھی مگر عورتیں نقاب میں ہونے پر بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم! ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں اچھے قسم کے تالینوں کا فرش تھا۔ ان پر چھوٹے چھوٹے موٹے گدے پڑے تھے اور سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ ساتھ میں گاؤں کیلئے بھی قرینے سے لگے تھے۔ بزرگ نے مجھے ایک گدے پر لے جا کر بیٹھا پھر میرے قریب بیٹھے ہوئے بولے۔

”بیٹا تمہیں تعجب ہوگا کہ میں کون ہوں اور میں تمہیں کہاں لے کر آیا ہوں؟“

ان کے سوالات کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے، اس لئے خاموشی سے ان کی صورت دیکھنے لگا۔

”بیٹا، ذرا نہیں بات کرو۔“ بزرگ نے شفقت

آميز لہجے میں کہا۔

”سنوایہ جتنا توں کا شہر ہے اور میں ان سب کا امیر ہوں۔ یہ منصب ہمیں شاہ جنات کی جانب سے عطا ہوئی ہے۔ تم میرے مہمان ہو، تمہیں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جنات میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن تم سردار کے مہمان ہو اس لئے سب تمہاری عزت کریں گے۔“

میں نے کئی بار تمہیں قرآن شریف پڑھتے ہوئے سنا ہے، مجھے تمہاری قرات بہت پسند ہے، میں اپنی بیوی اور بچوں کو بھی تمہاری قرات سنانا چاہتا تھا اس لئے تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ اطمینان سے بیٹھو، میں اپنے بچوں کو بلاتا ہوں، تم سے مل کر وہ خوش ہوں گے۔“

بزرگ نے زور سے کچھ کہا۔ دروازوں میں سے سرائی ہوئی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ یکا یک مجھے سردی کی وجہ کچھ محسوس ہونے لگی۔ خوف کی وجہ سے میرا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور میں آنکھیں میچاڑے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ابھی میں کچھ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ چاروں طرف لرزتے ہوئے ہیولے نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہیولے جسموں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ ایک لمحہ کے بعد ہی میرے سامنے عورتیں اڑکے لڑکیاں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔

”بیٹی وہ بچہ ہے جس کے بارے میں میں نے تم لوگوں کو بتایا تھا۔ اس کا نام شاہد ہے اور یہ بہت اچھی قرات سے قرآن شریف پڑھتا ہے۔ آج میں تمہارے پاس اس لئے لایا ہوں کہ تم بھی اس کی قرات سن سکو۔ اچھا پہلے اس کی خاطر تواضع کرو، پھر یہ تمہیں قرآن شریف سنائے گا۔“

بزرگ کے اتنا کہنے پر پورا کمرہ سفید دھوئیں سے بھر گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ہوا زور سے چلنا شروع ہوئی لیکن جب ہوا کا زور کم ہوا تو کمرے

میں ایک بہت بڑا دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں قرینے سے پلیٹوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ پینے کے لئے ایک نئے قسم کا شراب تھا۔ اس کا رنگ نہ تو پوری طرح سفید ہی تھا اور نہ لال بلکہ عجیب طرح کا رنگ تھا۔ پینے میں اتنا اچھا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ پیے ہی چلے جاؤں۔

مجھے اس وقت نہ تو بھوک تھی اور نہ ڈر کی وجہ سے کھانے کی خواہش تھی لیکن بزرگ کے اصرار پر کھانا پڑا۔ میرے کھانا شروع کرنے پر دوسرے لوگوں نے بھی کھانے میں میرا ساتھ دیا۔ مٹھائی بالکل تازہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے حلاوتی کی دکان سے گرم گرم انہی لائی گئی ہو۔ اسی طرح پھل بھی یہ معلوم ہو رہے تھے کہ جیسے انہی درختوں سے توڑ کر لائے گئے ہوں۔

کچھ دیر میں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر سب میری جانب دیکھنے لگے۔ اب کافی حد تک میرا ذرا بھی دور ہو چکا تھا۔ اس لئے بزرگ کی فرمائش پر سورتہ جن کا ایک رکوع میں نے قرات کے ساتھ سنایا۔ پڑھنے کے دوران سب نے مہاجر جہا کی سکھار کی کچھ دیر کے بعد بزرگ نے اپنے گھر والوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھا لڑکا کتنا اچھا پڑھتا ہے۔“

”ان کو یہاں بلایا کیجئے۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”ہاں میں ان کو یہاں لایا کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو بھی ان سے قرات سیکھنا چاہئے۔“ اچھا بیٹا، چلو میں تم کو چھوڑ آؤں لیکن ایک بات یاد رکھنا اب میرا ساقی تم پر رہے گا۔ مگر تم ذرا نہیں۔“

ابھی بزرگ نے بات ختم کی ہی تھی کہ یکا یک باہر سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی شخص پر سختی کی گئی ہو اور وہ اس اذیت پر کراہ رہا ہو۔ بزرگ نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ ان کے منہ سے ابھی بات ختم ہوئی تھی کہ یکا یک کمرے میں دھماکہ ہوا اس دھماکے کے ساتھ ایک دھواں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک

جن نمودار ہوا لیکن وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک دوسرا جن بھی تھا جس کو پہلا جن منبھولی کے ساتھ اپنے گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دوسرا جن ملزم ہے جس کو پہلا جن پکڑ کر لایا ہے۔

”کیا بات ہے؟“ بزرگ نے پہلے جن سے پوچھا۔

”اس نے پھر شرارت کی ہے۔“ پہلے جن نے جواب دیا۔

”ہاؤ۔۔۔۔۔۔“ بزرگ نے ملزم سے کہا۔

”میں راستے میں کھڑا تھا کہ ایک شخص نے مجھے لکڑی ماری۔“

”کس روپ میں کھڑے تھے؟“

”کالے کتے کے روپ میں۔“

”پھر تو نے کیا کیا۔“

”میں نے اس شخص کے گھر کو آگ لگا دی۔“

”تم نے شرارت کی ہے۔ اس آدمی کو کیا معلوم

تھا کہ کتے کے روپ میں جن ہے۔ ویسے بھی کسی جن کو انسان کے ستانے کی ممانعت ہے لیکن تم نے ایک انسان کے گھر میں آگ لگا دی ہے۔ اس لئے اب

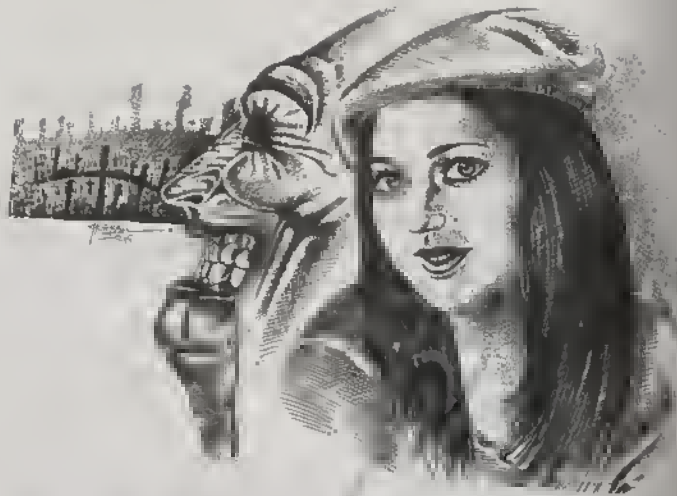
تمہاری یہ سزا ہے کہ چھ مہینے تک تم کتان کر انسانوں کی ہستی میں گھومو گے اور اس عرصہ میں تم نے کسی قسم کی شرارت کی تو اس کی سزا تم کو ملے گی لے جاؤ۔“

”بزرگ کے لے جاؤ کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ دونوں جن ہوا میں تحلیل ہونا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئے۔

میں اس عجیب قسم کی عدالت اور فیصلے کو دیکھ کر بڑا تعجب کر رہا تھا۔ نہ دلیل نہ گواہ اور نہ کسی اور قسم کی عدالتی کارروائی۔ ایک منٹ کے اندر ہی ایک مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔“ ان کے لئے تھلاؤ۔“

بزرگ نے ایک جانب دیکھتے ہوئے کہا لیکن جس جانب انہوں نے منہ کر کے کہا تھا مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ مگر ایک بار پھر ہوا زور سے چلنا شروع ہوئی اور چشم زدن میں ایک جن رومال میں کوئی چیز باندھے ہوئے کھڑا تھا۔





## انجام

ساجدہ راجہ - ہندوستان سرگودھا

اچانک جن نے اپنے ہاتھ آگے کٹے تو اس کے ہاتھوں سے تیز شعاعیں نکلیں اور ٹھاکر کے جسم میں پیوست ہو گئیں، ٹھاکر کے منہ سے انڈیت ناک چیخوں کا طوفان پھوٹ پڑا اور ٹھاکر جل کر خاکستر ہو گیا۔

ایک حیرانگیز دل گداز اور موت کرتی حقیقی کہانی جسے پڑھنے والے عیش عیش کر سکیں گے

وہ درخت سے بندھے ہوئے جھولے پر بیٹھی مسلسل اونچی آواز میں گانا گارہی تھی۔ اس کی سریلی آواز نے اک سماں باندھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور مسلسل آگے پیچھے ہوتے ہوئے جھولے کی حرکت بھی اس کا ارتکاز نہ توڑ سکی۔

اس کا نام پریتی تھا وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن بہت پرکشش تھی خاص کر اس کی خوبصورت آواز

وہ پورے گاؤں میں چرچے تھے۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ بہت لاڈلی تھی۔ اس کی ہر جائز ناجائز خواہش کو آنکھیں بند کر کے پورا کیا جاتا تھا حالانکہ اس کا باپ بہت غریب تھا۔ گاؤں کے زمیندار کی جو بی بی کا لازم۔ لیکن جیسے بھی ہوتا وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی ماں اسی عمر کی عورت تھی وہ صرف گھر کے کام کاج

بزرگ کے ساتھ ہوا۔ اور ہر بار پہلے کی طرح رومال میں انہوں نے مجھے مٹھائی اور روپے پلیٹ کر دیے۔ اس کے بعد وہ گھر بھی اکثر میرے پاس آئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

شاہد کی کہانی بڑی تعجب خیز تھی۔ کہانی سننے کے بعد میرے لئے اب وہاں ٹھہرنا بے کار تھا اس لئے ہم دونوں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ لیکن کافی دنوں کے بعد ایک روز میری ملاقات شاہد سے پھر ہو گئی۔ میں نے ویسے ہی تذکرہ اس سے پوچھا۔

”کیوں شاہد اب بھی ان بزرگ کے ساتھ تمہارا جانا ہوتا ہے۔“

”میں وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔“ شاہد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ کیسے۔“

ایک روز والد نے حضرات کے ذریعہ ان بزرگ کو بلایا۔ پھر بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتے ہوئے والد نے انہیں سمجھایا کہ ”ان کی وجہ سے لڑکے کی تعلیم و تربیت پر اثر پڑ رہا ہے۔ دوسرے ایک وقت آئے گا کہ اس کی شادی بیاہ بھی کرنی ہے۔ اس شہرت کی وجہ سے شادی میں بڑی قیمتیں پیش آئیں گی۔ اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ اپنا سارے جھجھ پر سے اٹھالیں۔ البتہ قرأت سننا ہو تو مسجد میں جب شاہد پڑھے تو وہ آکر سن سکتے ہیں۔“

پہلے تو بزرگ نے والد کی بات ماننے سے انکار کر دیا بعد میں راضی ہو گئے اور اب ان کا جھجھ پر کوئی اثر نہیں ہے۔ البتہ مسجد میں جب بھی کسی میں قرآن شریف پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بزرگ بھی سوچ رہے ہیں لیکن مجھے نظر نہیں آتے ہیں۔

مجھے شاہد کی باتوں پر یقین تھا اور ویسے بھی مجھے معلوم ہے کہ اب اس کے گھر میں عورتوں کے آنے جانے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔



اس کی وضع قطع سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ملازم ہے۔

”لو بیٹے، یہ تمہارا تحفہ ہے۔“ بزرگ نے رومال کا بنڈل مجھے دیتے ہوئے کہا۔ میرے بنڈل لے لینے پر وہ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اچھا اب تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ ان کی آواز پھر سنائی دی۔ ”آنکھیں کھول لو۔“

میں نے آنکھیں کھولیں پہلے تو بڑی دیر تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں لیکن کچھ دیر کے بعد چاروں طرف دیکھا تو رومال کا بنڈل میرے ہاتھ میں تھا اور میں مسجد کے دالان میں اپنے بستر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

جو واقعات اب تک میرے ساتھ پیش آئے تھے ان کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔ میں بڑی دیر تک رومال پکڑے ہوئے بستر کے پاس کھڑا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں اور کہاں جاؤں؟

آخر جب ہوش بحال ہوئے تو یہی مناسب سمجھا کہ والد کو چکا کر تمام واقعہ بتا دوں میں نے اسی وقت اندر کمرے میں جا کر انہیں بیدار کیا اور پورا قصہ سناتے ہوئے وہ رومال کا بنڈل ان کو دے دیا۔ انہوں نے بنڈل کھول کر دیکھا تو اس میں تازہ بنی ہوئی مٹھائی تھی اور ساتھ میں چاندی کے سکے والے سو روپے بھی تھے۔ والد نے ان چیزوں کو ویسے ہی رومال میں باندھ دیا اور پھر دو روکر کرنے کے لئے ہمت بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں بیٹا۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ میں بھی مسجد میں ان لوگوں کو کوئی بار دیکھ چکا ہوں۔ انہیں صرف تمہاری قرأت پسند ہے۔ اچھا اب اذان ہونے والی ہے۔ تم بھی ضروریات سے فارغ ہو کر نماز کی تیاری کرو۔“

دن نکلنے پر میں ایک بار اس دروازے کی تلاش میں برجی تک گیا لیکن وہاں کسی دروازے کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس دن کے بعد کئی مرتبہ پھر میرا جانا ان

کرتی تھی۔ حالانکہ زمیندار کی جتنی نے اس کوئی بار کہا کہ وہ بھی اس کی حویلی میں آکر کام کرے تاکہ ان کے گھر کے حالات ٹھیک ہو سکیں لیکن پریتی کے چارام واس کو یہ بات گوارہ نہیں تھی۔ اس لئے بعد میں کسی نے اس پر زور نہیں دیا۔

رام واس کو بھی پریتی کے شوق کا پتہ تھا وہ جانتا تھا کہ پریتی کی آواز بہت سندر ہے اس لئے اس نے کبھی اس کے شوق پر پابندی نہیں لگائی۔ پہلے پہل تو وہ صرف اپنی سکھیوں کو ہی گانا سناتی تھی لیکن پھر یہ بات کسی طرح زمیندار کے کانوں میں پڑ گئی کہ رام واس کی بیٹی کو گانے کا بہت شوق ہے اور وہ گاتی بھی بہت اچھا ہے۔

ایک دن اس نے رام واس کو بلا کر پوچھا۔  
”رام واس سنا ہے تیری چھوری کو گانے کا بہت شوق ہے اس کی آواز بھی سنا ہے بہت میٹھی ہے۔“  
”جی ٹھا کر صاحب..... آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میری پریتی کو بھگوان نے بہت سندر آواز سے نوازا ہے، وہ جب گاتی ہے تو ارد گرد جیسے سب ساکت ہو جاتا ہے۔“ رام واس نے عاجزی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو ہمیں گانا سننا کتنا پسند ہے اور سندر آواز ہماری کمزوری؟“ ٹھا کر چند رام واس نے تائید طلب نظروں سے رام واس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

”ہم نے تمہاری چھوری کی بہت تعریف سنی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم اسے کسی دن حویلی لاؤ، ہم اس کا گانا سننا چاہتے ہیں۔“

رام واس نے ٹھا کر کے منہ سے پریتی کے گانے کی تعریف سنی تو اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی وہ جبکہ کراٹھا اور چند رام کے چرن چھوئے اور وہابی کے لئے مڑ گیا۔ چہرے پر چمکتی خوشی کو رام واس چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اس کی جنتی نے اس کے چہرے پر چمکتی خوشی کو بھانپ لیا۔ ”کیا

بات ہے پریتی کے پتا.....؟ اس سے بہت خوش دیکھتے ہو کیا کوئی خاص بات ہے؟“ رام واس کی جنتی سرسوتی نے اشتیاق سے پوچھا تو جواباً رام واس بولا۔  
”بھانگوان بات ہی ایسی ہے تم سنو گی تو تمہاری خوشی بھی دو چند ہو جائے گی۔“

”ایسی کیا خاص بات ہے؟“ ذرا مجھے بھی بتاؤ۔“ سرسوتی کے پوچھنے پر رام واس بولا۔

”وہ اپنے ٹھا کر صاحب ہیں نا چند رام؟ ان کو اپنی پریتی کی آواز کی سندر کا پتہ چلا ہے وہ چاہتے ہیں کہ پریتی ان کی حویلی میں آکر انہیں اپنی سندر آواز میں گانا سنانے اگر انہیں پریتی کی آواز پسند آگئی تو وہ پریتی کو بہت کچھ دیں گے بلکہ جب بھی ان کا دل چاہے گا وہ پریتی کو بلا کر اس کا گانا سنیں گے اور دل کھول کر نوازیں گے۔“

رام واس نے ایک ہی سانس میں اسے اپنی خوشی کی وجہ بتائی تو جواباً سرسوتی خاموش ہو گئی۔

رام واس نے حیران ہو کے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ شکر سے انداز میں بولی۔ ”پریتی کے باپو تم جانتے ہو کہ ٹھا کر کس طبیعت کا آدمی ہے وہ ایک عیاش آدمی ہے اور نہ جانے کتنی لڑکیوں کی عزت روند چکا ہے مجھے پریتی کا رن خطرہ ہے کہ اگر ٹھا کر نے ہماری پریتی کو نقصان پہنچا تو ہم کیا کر سکیں گے؟ میں اپنی پریتی کو کسی صورت حویلی نہیں بھیجوں گی۔“

”جنگلی میں ٹھا کر چند رام کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ اپنے ملازموں کا کتنا خیال رکھتے ہیں، ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ جانتی ہو پرنام سنگھ کی چھوری کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا تھا۔ اس بے چاری کی عزت کسی درندے نے روند ڈالی تھی اس کے غریب ماتا پتا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن ٹھا کر نے اس لڑکے کو ڈھونڈ کر کتنی کڑی سزا دی تھی اور بعد میں اس لڑکے کے گھر والوں کو اتنی دولت دی تھی کہ وہ اپنی بقیہ زندگی اچھے طریقے سے گزار سکیں اور اپنی چھوری کی شادی بھی کسی اچھی جگہ کر سکیں۔“ رام واس نے ٹھا کر کی تعریف میں

زمین آسان ایک کرنے شروع کئے تو سرسوتی نے اس کو ٹوک دیا۔

”بس بس..... میری زبان نہ کھلاؤ، سارا پنڈ جانتا ہے کہ یہ ٹھا کر ہی تھا جس نے پرنام سنگھ کی چھوری مادھوری کی عزت لوٹی تھی اور سزا اس بے چارے غریب گوپال کو دی اور بعد میں مادھوری کے گھر والوں کو اتنی دولت دی کہ وہ بے چارے اسے ٹھا کر کا احسان سمجھتے رہے۔“

”تم بھی ٹھا کر کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو وہ اتنا اچھا نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو اس کے کالے کرتوت حویلی کی اونچی دیواروں میں دب جاتے ہیں لیکن کب تک.....؟ بھگوان جلد ہی اس باپ کا چہرہ بے نقاب کرے گا۔“

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ رام واس بیزاری سے بولا۔ ”اتنے اچھے آدمی کو محض غلط فہمی کی بنیاد پر اتنا برا کہہ رہی ہو۔ تم جو بھی کہو میں جلد ہی پریتی کو حویلی لے کر جاؤں گا اگر ٹھا کر کو پریتی کی آواز پسند آگئی پھر تو سمجھو دارے نیارے۔“

رام واس اپنی ہی من میں بولے پٹلے جا رہا تھا جبکہ سرسوتی کے چہرے پر فکر و دو کی لکیریں جتنی جاری تھیں۔

ایک دن پریتی اپنی سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولنے میں مگن تھی ساتھ ساتھ اس کی سریلی آواز ماحول کو بہت خوبصورت بنا رہی تھی اس کی سکھیاں بھی خاموشی سے اس کی آواز کی سندر کو اپنے اندر اتارنے میں مصروف تھیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا، وہ جب بھی اپنے گھر سے ذرا دور ان گھنے درختوں پر پڑے جھولوں میں جھولا جھولنے جاتیں اس کی سکھیاں ٹھیلے کودنے کی بجائے بڑی محویت سے اس کا گانا سنتی تھیں۔ لاجوئی کہتی تھی۔ ”پریتی تیری آواز کانوں میں رس سا گھول دیتی ہے منش کو سنار سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ منش تو منش ہوائی مخلوق بھی یقیناً تیری آواز کے سحر میں کھو جاتی ہوں گی تو ایسا کیا کران درختوں کے نیچے

یادیران جگہوں پر اپنی آواز کا جاو نہ چکایا کہ کسی دن کوئی جن عاشق ہو گیا تو پھر تو کوئی کام سے۔“

اور پریتی ہنس کر اس کی بات کو نال جاتی تھی۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے لڑکیاں اپنی دنیاؤں میں مگن کسی بات پر توجہ ہی نہیں دیتی ہیں انہیں جس کام سے منع کیا جائے وہی ان کی ضد بن جاتا ہے پریتی نے بھی لاجوئی کی بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن یہ بات سچ ہو کر رہے گی۔

اس دن بہت گرمی تھی پریتی کو گھر میں گھبراہٹ ہوئی تو وہ ان گھنے درختوں کی جانب چل دی جہاں وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولتی تھی اس نے سوچا کہ وہاں درختوں کی چھاؤں میں کچھ دیر بیٹھے گی تو گرمی سے نجات مل جائے گی اس وقت کوئی سکھی بھی اس کے ساتھ موجود نہیں تھی وہ جھولے پر آ کے بیٹھ گئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کی طبیعت میں خوشگوار بیت پیدا کر دی اور اس نے اپنی مدھڑ آواز کا جاو چکنا شروع کر دیا۔

ٹھا کر کا ملازم گوبی جو کسی کام سے ادھر سے گزر رہا تھا اتنی سندر آواز سن کر ٹھٹک گیا وہ بے قدموں ادھر کی اور بڑھا جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی گوبی نے حیرانی سے جھولے پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا جو حویلی میں کام کرنے والے ملازم رام واس کی چھوری تھی۔ حیرانی اسے اس کی آواز سے ہوئی تھی اتنی سندر آواز اس نے اپنی زندگی میں نہیں سنی تھی اور ٹھا کر چند رام تو آواز سن کر پاگل ہو جائے گا۔ اس نے سوچا وہ ابھی جا کر ٹھا کر کو آگاہ کرتا ہے کہ اتنی مدھڑ بھری آواز ان کے اپنے پنڈ میں موجود ہے اور وہ شہر سے غریب عورتوں کی بھونڈی آواز کو سننے کے لئے اتنی رقم خرچ کرتا ہے وہ یہ سوچ کر راجہ کی خبر کے لئے مڑ گیا۔ پریتی کو اس کے آنے اور جانے کی خبر بھی نہ ہوئی وہ تو بس اپنے آپ میں مگن تھی یہ جانے بنا کہ کوئی اور بھی اس کو بہت حیرت سے دیکھ رہا ہے۔

جس درخت پر وہ جھولا جھول رہی تھی اسی کی ایک شاخ پر وہ بیٹھا تھا، وہ پریتی کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ پریتی کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا اور اس کی آواز کی



سندرتا اسے باہل کئے دے رہی تھی۔

اس کا تعلق ایک بے دین جنات سے تھا لیکن وہ سرکش ہرگز نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کسی آدم زاد کو بلا وجہ تنگ کیا تھا اب بھی وہ اپنے قبیلے میں جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں سریلی آواز پڑی تو وہ فوراً رک گیا اور اسی درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا جس پر پر پتی جھولا جھولنے ہوئے گاٹا گاڑی تھی۔

اس نے فی الحال اپنے قبیلے کی طرف جانا ترک کر دیا اور پر پتی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا نام روزام تھا اور وہ بہت ہی طاقتور جن تھا لیکن اس نے پر پتی کے جسم پر قبضہ جمانے کے بجائے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ پر پتی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

ادھر گوہی اس وقت تھا کہ رام داس کے کمرہ خاص میں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا توڑی دیر پہلے وہ ٹھاکر کو پر پتی کی آواز کی سندرتا کے بارے بتا چکا تھا اور ساتھ ہی اس کے حسن و شباب کی داستان بھی۔ ٹھاکر کے لئے دونوں باتیں اہم تھیں ”آواز اور شباب“ یہ ہونی نہیں سکتا تھا کہ وہ آواز کے ساتھ ساتھ شباب سے بھی لطف اندوز نہ ہوتا۔ شہرے وہ جن عورتوں کو گمانے کے لئے لاتا تھا وہ ٹھٹھے سے تعلق رکھتی تھیں جن کے لئے عزت سے زیادہ دولت کی اہمیت ہوتی تھی اور وہ اپنے شباب کی پوری پوری قیمت وصول کرتی تھیں اس لئے ٹھاکر کے لئے ان کو دام کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ خود ہی کپے ہوئے پھل کی طرح جھوٹی میں آن گرتی تھیں۔

لیکن گاؤں کی نارویوں کو رام کرنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا ان کے نزدیک عزت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوتی اور پھر گاؤں میں اس طرح کے واقعات جلد پھیل جاتے ہیں ٹھاکر بھی پنڈ کی نارویوں سے ذرا احتیاط رہتا تھا وہ کوئی کھیل بھی غیر محتاط ہو کر نہیں کھیلتا تھا یہ نہیں کیسے اسے پر نام نگہ کی چھوری یا دھوری کو کھینے میں غلطی ہوگئی اور بات پورے پنڈ میں پھیل گئی لیکن ٹھاکر نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس معاملے

کو دبا دیا تھا اور آئندہ کے لئے محتاط ہو گیا تھا۔

گوہی کے منہ سے رام داس کی چھوری کی تعریف سن کے اس کے منہ میں پانی بھر آیا اسے یہ مرحلہ بہت آسان لگا وہ رام داس کو حکم دے کر کسی بھی وقت پر پتی کو جوہلی بلا سکتا تھا اور پر پتی کو دولت کا لالچ دے کر یا دھمکی وغیرہ دے کر با آسانی اپنی مرضی کر سکتا تھا۔

اس وقت بھی وہ گوہی سے اس موضوع پر بات کر رہا تھا اور گوہی بڑھ چڑھ کر اسے شور دے رہا تھا ٹھاکر چند رام کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور اس کی آنکھیں کثرت شراب نوشی سے سرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ مکمل ہوش میں تھا۔

”اوئے گوہی“ اس نے اپنے سامنے ہاتھ باندھے گوہی کو مخاطب کیا۔

”تو جب بھی کوئی خبر لاتا ہے بڑی اچھی خبر لاتا ہے تبھی تجھے اپنا خاص ملازم بنایا ہوا ہے اور پھر تیری تو اپنی بیوی بہت رستلی ہے، میں تو اس کو گھسی جوہلی میں بلا چکا ہوں۔ گوہی تو گھر کی مرغی کو چھوڑ کر ادھر ادھر نہ کیوں مارتا ہے؟“ ٹھاکر کے لہجے میں چھپی ممتی خیزی کو سمجھ کر گوہی مسکرا دیا اور ہاتھ باندھے کہہ بولا۔

”ٹھاکر صاحب..... آپ تو جانتے ہیں۔“ گھر کی مرغی وال برابر۔ وہ مرغی تو مجھے روز نصیب ہوتی ہے اس لئے جی ادب سا جاتا ہے اس لئے دال کو منہ مارنا پڑتا ہے تاکہ کچھ تو منکا ڈال فائدہ تبدیل ہو۔“

گوہی کے جواب پر ٹھاکر کے منہ سے قہقہہ نکل گیا اور خوب ہنسنے کے بعد وہ بولا۔ ”بہت ہوشیار ہو گیا ہے، لگتا ہے دال کچھ زیادہ ہی راس آگئی ہے ایسا کر رام داس کو میرا پیغام پہنچا دے کہ جب میرا حکم ہو وہ اپنی چھوری کو لے کر جوہلی آجائے ہم اس کا گاٹا سننا چاہتے ہیں۔“

”اور ہاں۔“ گوہی جیسے ہی باہر جانے کے لئے مڑا ٹھاکر چند رام بولا تو گوہی رک گیا اور حوالہ دیا کہ وہیں سے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔ ”آج رات اپنی جی کو جوہلی

میں پہنچا دینا بہت دن ہوئے اس سے ملے ہوئے آج وہ بہت یاد آ رہی ہے۔“ گوہی سر ہلاتا ہر نکل گیا۔

دوسرے دن گوہی کو کہنے کی بجائے ٹھاکر نے رام داس کو خود بلوا کر اس کی چھوری پر پتی کو جوہلی میں لانے کے لئے کہا۔ جب رام داس نے یہ خبر اپنی جی کو سنائی تو وہ خوش ہونے کی بجائے پریشان ہوئی لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ شام سے پر پتی کو لانا ٹھاکر کی جوہلی جانا پڑتا۔ اس نے جھگوان سے پر پتی کی سلامتی کے لئے پراختہ کی اور خاموش ہوگئی۔

پر پتی اپنے کمرے میں پرسکون سو رہی تھی کہ اسے کسی نے اتنے پیار بھرے انداز میں پکارا کہ اس کی نیند فوراً اڑن چھو ہوگئی۔ کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں میھاڑ کر حیرت سے ارد گرد دیکھنے لگی اسے حیرانگی ہو رہی تھی کہ اسے کس نے پکارا ہے۔؟ حالانکہ آواز بہت نرم اور مدھم تھی لیکن اس کے باوجود وہ گہری نیند سے کس طرح اچانک بیدار ہوگئی؟ پھر اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو یہ سوچ کر وہ بھر سے لینے لگی کہ وہ آواز دوبارہ سے سنائی دی کسی نے اسے بہت پیار سے پکارا تھا۔

وہ خوف زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی اچانک اسے اپنے بالوں میں کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا کوئی نادیدہ ہاتھ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور وہ دنیا و فانی سے بے خبر ہوئی جا رہی تھی پھر اس کے کانوں میں وہی دلکش آواز گونجی۔

”جہمیں مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا بلکہ تمہاری حفاظت کروں گا۔“

”لیکن..... تم ہوکون.....؟ اور بند کمرے میں کس طرح آئے۔“ پر پتی مدھوش سی آواز میں اس نادیدہ وجود سے پوچھ رہی تھی۔ کچھ دیر تو پراسراری خاموشی رہی پھر وہ بولا تو پر پتی کو اپنے کانوں میں رس گھلتا محسوس ہونے لگا۔

”میرا تعلق قوم جنات سے ہے لیکن ہم سرکش جنوں میں شمار نہیں ہوتے جو انسانی وجود پر اپنا قبضہ جمالیتے ہیں اور انہیں ہر طرح کی تکلیف دینے سے باز نہیں آتے لیکن ہمارے قبیلے کا یہ دستور ہے کہ جو بھی جن کی انسان کو تکلیف پہنچائے گا اس کی جتنی طاقتیں سلب کرنی جائیں گی اور اسے سخت سزا دی جائے گی اگر وہ دوبارہ اس طرح کی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کرے تب اسے معافی ملتی ہے۔“

حیرت انگیز طور پر اس کے جن ہونے کے باوجود پر پتی کو اس سے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر پتی کے سر سے ہٹائے تھے اس کی آواز تو آ رہی تھی لیکن وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”کیا تم میرے سامنے نہیں آ سکتے.....؟“ پر پتی نے کسی نادیدہ نقطے پر نگاہیں جما کر کہا۔

”کیوں نہیں.....؟“ پھر شخصہزی ہوا کا اک جھونکا پر پتی کے چہرے سے نکلایا اور سامنے بستر پر دھوس کا اک مرغولہ بننے لگا دھیرے دھیرے وہ مرغولہ اک شخص انسانی وجود میں ڈھلنے لگا جب وہ ہیولہ مکمل ہوا تو اک خوبصورت وجود پر پتی کے سامنے تھا ویسے تو وہ بالکل انسان ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اس کی ہڈیوں بہت گھنی اور آنکھیں کسی حد تک کانوں کی جانب پھینچی ہوئی تھیں قطع نظر اس کے وہ بلاشبہ بہت حسین مرد تھا، پر پتی نے آج تک اتنا خوبصورت مرد نہیں دیکھا تھا وہ آنکھوں میں سسکائے لئے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی اسے اتنی محویت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس کے لبوں پر دلکش ہنس آٹھرا۔

”ایسے دیکھ کر تم یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میں بہت خوبصورت ہوں؟ حالانکہ میں تو خود تمہاری آواز کا دیوانہ ہوں اور تمہارا یہ معصوم سا چہرہ.....؟ ای ویہ سے تو میں تمہارے پاس رک گیا اور اب تو یوں لگتا ہے کہ میں کہیں بھی جائیں پاؤں گا۔“ اس کی بے قرار آواز پر پتی کو کسی اور دنیا کی سیر کرانے لگی اس نے کب اتنے خوبصورت الفاظ میں کسی سے اپنی تعریف سنی تھی اس

کے مہر بھرے لیوں پر پاک الوہی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا ایسے پہلے تو کبھی نہیں ہوا؟ پریتی نے دل میں سوچا ضرور لیکن کچھ کہنے سے باز رہی۔

”کیا تم مجھے اپنا دوست سمجھ سکتی ہو.....؟“ اس کے سوال پر پریتی نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی چمک سے خائف ہو کر پھر سے نگاہیں جھکا لیں لیکن مرکوا ثبات میں ہلانا نہیں بھولی تھی۔

”تم نے مجھ سے میرا نام بھی نہیں پوچھا.....؟“ روزام نے پیار سے پریتی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو پریتی کو کبھی خیال آیا۔

”تم نے اتنا سوچ ہی کہاں دیا کہ میں تمہارا نام پوچھ سکوں۔ اب بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟“ پریتی نے مصحوبیت سے دریافت کیا تو جواب میں روزام نے اسے اپنا نام بتایا اور پھر سارا واقعہ اسے بتایا کہ کس طرح وہ اس کی آواز سن کر دک گیا اور اب وہ کہیں بھی نہ جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔

پریتی کو یہ فکر کھانے لگی کہ اگر گھردالوں کو پیہ چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ لیکن روزام نے اس کو بتایا کہ وہ غائب حالت میں اس کے ساتھ رہے گا کسی کو ذرا بھی پیہ نہیں چلے گا۔ پریتی مطمئن ہو گئی پھر باتوں میں رات گزرنے کا پیہ بھی نہیں چلا۔

صبح وہ جلدی بیدار نہ ہو سکی تو اس کی مانتا نے اسے جگا دیا اور اسے بتایا کہ آج شام سے اسے ٹھاکر کی حویلی گانا سنانے کے لئے جانا ہے۔ پریتی بہت حیران ہوئی کہ ٹھاکر کو کیسے پیہ چلا کہ وہ اچھا گاتی ہے؟ لیکن اسے ہر حال میں ٹھاکر کی حویلی جانا تھا کیونکہ علم عددی کی سزا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ساتھ ساتھ اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ پیہ نہیں ٹھاکر کس قماش کا آدمی ہوگا۔ کیونکہ پنڈ والوں سے وہ بھی ٹھاکر کی فطرت کے بارے کچھ نہ کچھ سن چکی تھی اس لئے اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا وہ پریشانی کے عالم میں کمرے میں واپس آ گئی اور خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

اچانک روزام کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ چونک گئی اس وقت وہ بالکل اسے خاموش کئے ہوئے تھی جب روزام نے اسے مخاطب کیا تب اسے اس کا خیال آیا۔ ”اتنی جلدی مجھے ذہن سے جھٹک دیا.....؟ ابھی تو میں تمہارے پاس ہوں جب چلا گیا تو بھلا تم کہاں مجھے یاد رکھو گی.....؟“ روزام کی آواز پر وہ شرمندہ ہو گئی۔

”نہیں وہ دراصل.....“ اور پھر اس نے ساری بات روزام کو بتادی جواباً اس نے پریتی کو کھلی دی اور کہا کہ وہ فکر نہ کرے۔ ”میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ہر وقت تمہارے ساتھ موجود ہوں گا وہ بے فکر ہو کر حویلی جائے۔“

اس کی بات پر پریتی کو ڈھارس ہوئی اور وہ ہر پریشانی کو ذہن سے جھٹک کر حویلی جانے کے لئے تیار ہوئے گی۔

ٹھاکر چندر رام نے تمام تیاریاں مکمل کر لیں تھیں اس نے اپنی خواب گاہ کو مزید خوبصورت بنوایا۔ گلابوں کی پیتیاں بیڈ پر بکھیر دیں جن کی مہک نے پورے کمرے کو محسوس کر دیا تھا بیڈ کے آس پاس گلابوں کی لڑیاں لگوائیں جس سے کمرے کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کمرے کے رنگ سے ہم رنگ پردے اور بیڈ شیٹ کی مکمل نما کمرے کا تاثیر پیش کر رہی تھی گویا کمرہ یوں تاثیر پیش کر رہا تھا جیسے آج ہی کسی کی شادی کے لئے خصوصی طور پر سجایا گیا ہو۔

وہ جب بھی کسی شکار کو یہاں لاتا تو کمرے کو اسی طرح سجاتا تھا کمرے کا رومان پرور ماحول شکار کو شکار کرنے میں آسانی دیتا تھا اور جو آسان شکار نہ ہوتا اسے دولت کی چکا چوند دکھائی جاتی کچھ تو بھٹیا رڈاؤں و ستیوں اور کچھ اس کے باوجود بھی مشکل ثابت ہوتیں جنہیں وہ اپنے زور بازو سے فتح کر لیا کرتا تھا اور پریتی کے بارے میں بھی اس کا خیال تھا کہ وہ غریب لڑکی ہے دولت کی چکا چوند سے وہ زیادہ مزاحمت نہیں کرے گی اور جب گویلی نے اسے پریتی اور اس کے پتا کے آنے کی اطلاع دی

تو اس نے جلدی سے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔

گویلی بھی ان کے ساتھ ہی اندر آیا۔ جیسے ہی ٹھاکر چندر رام کی نظر پریتی کے سانولے لیکن پرکشش چہرے پر پڑی وہ اپنی آنکھیں جھپکاتا بھول گیا۔ ایسا حسن اس نے کہاں دیکھا تھا وہ دل ہی دل میں گویلی کو شاباش دے رہا تھا جس نے اتنا تکمیل شکار سے فراہم کیا۔

اچانک رام داس کی آواز گونجی تو وہ چونک گیا جو اپنی چھوری پر پریتی کو کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھاکر کو پر نام کرے اس کے کہنے پر پریتی نے ہاتھ جوڑ کر منسکارت کیا جواباً ٹھاکر نے اسے ایسی بھولی نظروں سے دیکھا کہ اس کا وجود کانپ گیا عورت نور امر کی نظر کو پچھان لیتی ہے کہ وہ کس زلاتی سے دیکھ رہا ہے؟

لیکن رام داس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ تو بس اسی میں خوش تھا کہ ٹھاکر نے اسے اتنی عزت بخشی کہ اس کی بیٹی کو خصوصی طور پر بلایا جب ٹھاکر اچھی طرح پریتی کو نظروں سے ٹٹول چکا تو اس نے گویلی کو مخاطب کیا۔

”گویلی رام داس کو مہمان خانے لے جا اور اسے پوری عزت سے پیشا جو بھی طلب کرے فوراً حاضر کر۔“ اور اس کے ساتھ ہی گویلی کو آٹھ کا مخصوص اشارہ کیا تو وہ مٹی خیزی سے سر ہلاتا اور رام داس کو ساتھ لیتا مہمان خانے کی جانب بڑھ گیا وہ ٹھاکر کے اشارے کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا رام داس کو اتنی شراب پلائی تھی کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جانے اور وہ کھل کر کھیل سکیں۔

جیسے ہی گویلی رام داس کو لے کر باہر نکلا ٹھاکر چندر رام نے ہوس بھری نگاہوں سے دیکھا اور آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا پریتی کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”یہ آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا.....؟“ پریتی کے سہمے لہجے پر ٹھاکر نے مٹھی نظروں سے اسے گھورا اور بولا۔ ”گھبراؤ نہیں مجھے تب تک گانا سننے میں مزہ نہیں آتا جب تک مکمل خاموشی اور سکون نہ ہو۔ تم ایسا کرو گانا شروع کر دو۔“

یہ کہہ کر ٹھاکر پریتی کے بہت قریب بیٹھنے لگا تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور بولی۔

”معافی چاہتی ہوں ٹھاکر صاحب لیکن میں آپ کے اتنا نزدیک بیٹھ کر نہیں گا سکتی مجھے عجیب سا لگتا ہے۔“

پریتی کی بات پر ٹھاکر زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ”کوئی بات نہیں تم جس طرح کا سکتی ہو ویسے گاؤ۔“ یہ کہہ کر ٹھاکر نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی اور مدہوش نظروں سے پریتی کو دیکھنے لگا اور جب پریتی نے اپنی مدہوش آواز میں گانا شروع کیا تو ٹھاکر مدہوش سا ہو گیا اتنی سندرا آواز اس نے کب اپنی زندگی میں سنی تھی۔

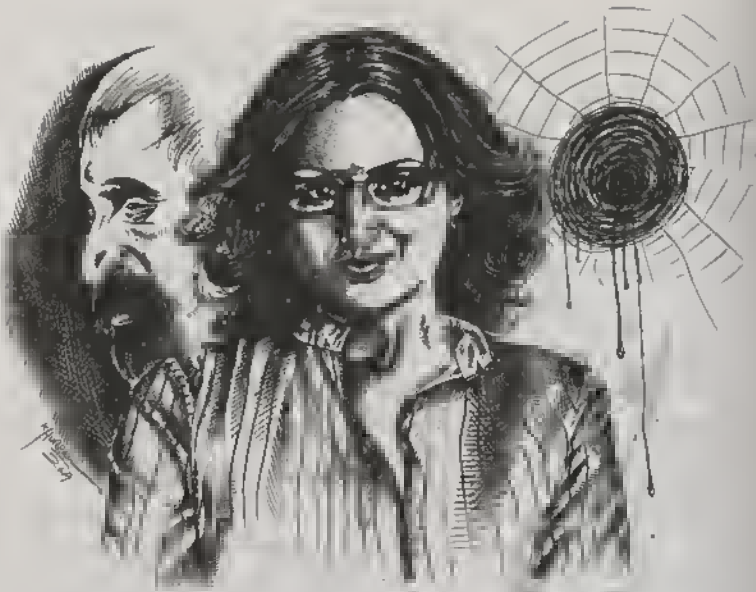
جوں جوں پریتی گاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی دیے ہی ٹھاکر مدہوش سا ہوتا جا رہا تھا اور جب پریتی نے گانا ختم کیا تو کچھ دیر تو وہ یونہی بڑا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے پریتی کی طرف بڑھا اس کے لیوں پر پریتی کی آواز کی تقریبنوں کے پل تھے۔

پریتی کے قریب پہنچ کر اس نے جو بھی پریتی کو اپنے بازوؤں میں بھرنا چاہا اس کے منہ پر پاک زوردار تھپڑ پڑا تو وہ جیسے ہوش کی وینا میں دایں آ گیا اور پھر جیسے ہی اس کی نظر پریتی کے پیچھے کھڑے وجود پر پڑی تو اس کے جسم پر کچھ ہی طاری ہو گئی۔

پریتی کے پیچھے ایک انتہائی خوبصورت اور خوفناک آدمی کھڑا تھا اس کے منہ سے خون بہہ کر اس کے پورے جسم کو بھگور رہا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر خون کی ایک بوند بھی فرش پر نہیں گری تھی کسی جب وہ بولا تو اس کی آواز نے ارد گرد بھونچال پیدا کر دیا جبکہ پریتی کو معلوم ہو گیا کہ اس کے پیچھے یقیناً روزام ہوگا جو اپنی شکل بدل کر ٹھاکر کو خوف زدہ کرنے آیا ہے تاکہ وہ پریتی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ اس کی بھیا تک آواز نے ٹھاکر کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا، وہ بہت خوف زدہ ہو گیا۔ جبکہ روزام چند قدم آگے بڑھ کر ٹھاکر کے قریب آ گیا اور اپنی ڈراؤنی آواز میں ٹھاکر کو مخاطب کیا۔

”اُدے ٹھاکر..... تو کیا سمجھتا ہے کہ توں غریبوں





## خودی کا قاتل

اقصی رباب - فیصل آباد

بزرگ نہ حیرت کی کیفیت میں جواب دیا۔ آج ہم ایک ایسے معمہ میں پھنس گئے ہیں جس کا کوئی حل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسا ہم نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آخر بات کیا ہے جو کہ ہماری ریاضت کے باوجود سمجھ سے بالاتر ہے۔

جاہت خلوص اور توکل کی ایک وافر من موئی داستان اہل دل کے لئے سوغات

ہر ایک چیز اسے جاندار، سانس لیتی ہوئی نظر آتی۔ اپنے بستر اور دیواروں سمیت ہر ایک چیز جسے لوگ بے جان سمجھتے، اسے ہر اس چیز میں جان نظر آتی۔ ہر ایک ساکت چیز بھی سانس لیتی محسوس ہوتی۔ اگر وہ اپنی می یا ڈیٹ سے بات کرتی اپنے محسوسات کے بارے میں تو وہ لوگ سمجھتے کہ شاید اس کے ساتھ کوئی دماغی مسئلہ ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی اس کا اعتبار نہیں کرے گا۔ وہ کسی کو بھی وہ

انجلیکا اپنے بستر پر نیم دراز چھت گور کھینے میں مگن تھی چھت اس کے سامنے رنگ بدل رہی تھی سرخ بھی سفید بھی سیاہ مگر اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا شاید تک نہیں تھا۔ اس کے ساتھ آج کل ایسے حیرت انگیز واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ وہ جس چیز کو بھی زیادہ غور سے اور دھیان سے دیکھتی اسے وہ چیز اپنی ہیئت بدلتی محسوس ہوتی

میں گونجی اس نے گولی کی طرف غضب ناک نظروں سے گھورا اور بولا۔

”تو اس دنیا کا سب سے بڑا بے غیرت ہے جو اپنی چٹی کواپنی خوشی سے ٹھاکر کے حوالے کرتا تھا اور دولت بنوڑتا تھا لیکن اب وہ دولت تیرے کچھ کام نہیں آئے گی۔“ اس نے گولی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر اپنے ہاتھ آگے کر دیئے اور گولی کے منہ سے اذیت ناک چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ٹھاکر چندر رام اور گولی کی موت پر جہاں لوگوں نے بھگوان کا شکر ادا کیا تھا وہیں وہ حیران بھی تھے کہ ایسا کس نے کیا لیکن وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھے ان کے لئے سب سے بڑی بات ٹھاکر اور گولی سے نجات تھی ٹھاکر کے پرپوار نے بھی شکر ادا کیا کیونکہ وہ بھی ٹھاکر سے سخت نالاں تھے۔ لیکن خوف سے زبان نہیں کھولتے تھے۔ ظالم اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔

پریتی بہت اداس تھی کیونکہ روزام چلا گیا تھا اس کا دل پس جانا بہت ضروری تھا اس نے پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ پریتی کو اسی دن کا انتظار تھا لیکن ایک دن عجیب بات ہوئی ایک آدمی ان کے گھر آیا اس نے پریتی کو بلوانے کا کہا جب پریتی آئی تو اس نے اسے خوش خبری سنائی کہ وہ فلم کے میوزک کا پروڈیوسر ہے اسے گانے کے لئے کسی نئی آواز کی ضرورت تھی اور اسے پریتی کا پتہ چلا تو وہ یہاں چلا آیا کیونکہ ایک آدمی نے اسے یہاں کا پتہ دیا ہے پھر اس نے پریتی کو گانے کے لئے کہا، جب پریتی نے اسے گانا سنایا تو وہ محو رہا اور اسے فوراً اپنے گانوں کے لئے بک کر لی۔ کچھ دن بعد پریتی نے اپنے پرپوار کے ساتھ ممبئی چلے جانا تھا اس پروڈیوسر نے انہیں فلیٹ دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

پریتی حیران تھی کہ وہ آدمی کون ہو سکتا ہے اس پروڈیوسر کو اس کے بارے میں بتایا پھر اس کے ذہن میں روزام کا نام آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔



پر ظلم کے پہاڑ توڑتا رہے گا اور ایٹور خاموشی سے دیکھتا رہے گا۔ ایٹور صرف اس لئے خاموش تھا کہ شاید تو اپنی ان حرکتوں سے باز آجائے اور ایٹور سے معافی مانگ لے لیکن نہیں۔ تو تو ظلم کرتے ہوئے بھول گیا کہ ایک تجھ سے بھی بڑا اوپر موجود ہے جو تیری ہر حرکت کو ٹھکرا رہا ہے لیکن وہ درگزر کرتا آیا اور تو نے اس خاموشی کو کچھ اور سمجھ لیا لیکن اب تیرے ظلم اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ایک لمحہ بھی اگر تجھے زندہ چھوڑا گیا تو تو یہ نہیں کیا کرے گا۔ اب اپنے انجام کے لئے تیار ہو جا۔ ایٹور ایک لمحے کے لئے بھی تجھے چھوڑنے پر تیار نہیں.....

”نہیں..... نہیں بھگوان کے لئے مجھے کچھ نہ کہو، میں سارے برے کام چھوڑ دوں گا۔“ ٹھاکر چندر رام نے روزام کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

لیکن اب کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا اور وہیے بھی جب ظالم کو لگتا ہے کہ اس پر برا وقت آ گیا ہے تو وہ معافی مانگتا ہے اور آئندہ اچھا رہنے کا وعدہ کرتا ہے لیکن جب برا وقت مل جائے تو وہ پھر اپنے اصلی روپ میں آ جاتا ہے اور بھگوان سے کئے گئے وعدے کو بھول جاتا ہے جیسے ٹھاکر چندر رام۔

لیکن روزام نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اپنے ہاتھ آگے کئے اس کے ہاتھوں سے تیز شعاعیں نکلیں اور ٹھاکر کے جسم میں پیوست ہو گئیں اس کے منہ سے اذیت ناک چیخوں کا طوفان پھوٹ پڑا۔ شعاعیں جہاں جہاں پڑیں وہاں سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھاکر نے اذیت کے عالم میں اپنی جان دے دی۔

پریتی آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جب ٹھاکر نے دم توڑ تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر رام داس اور گولی دوڑتے ہوئے آئے اور اپنے آگے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئے اور جب ان کی نظر روزام کی خوفناک شکل پر پڑی تو ان کی آنکھیں باہر کو اٹل پڑی۔ اچانک روزام کی آواز پورے کمرے

سب کیسے دکھا سکتی تھی جو وہ خود محسوس کرنے لگی تھی۔ پہلے اسے شکایت تھی کہ اس کے والدین اپنی اپنی مصروفیت کی وجہ سے مصروف رہتے ہیں اور اسے زیادہ وقت نہیں دیتے اور جس وقت وہ گھر ہوتے وہ خوب جی بھر کر انجوائے کرتی۔ مگر اب صورتحال بدل گئی تھی۔ اب انجلیکا اپنے والدین کے گھر میں موجودگی کو بھی زیادہ اہمیت نہ دیتی۔ اسے بہن بھائیوں سے تو وہ پہلے ہی زیادہ گھل مل کر نہیں رہتی تھی کیونکہ وہ ان کی سوتیلی بہن تھی۔ مگر انجلیکا اس بات سے بے خبر تھی۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کا رویہ اس کے ساتھ اگر بہت اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت تنہائی میں گزارتی۔ ہر وقت خود کو اپنے کمرے میں بند رکھتی۔ ایک دو بار انجلیکا کے والدین نے اس بات کو محسوس بھی کیا مگر اپنی فطری اور موثر لائف کی مصروفیات میں اس بات پر زیادہ دھیان نہ دے سکے۔ انجلیکا کی شکل تب ہی نظر آتی جب وہ اسکول جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلتی یا اسکول سے واپس آتی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ کھانا بھی اس کے کمرے میں ہی جاتا۔ اور کمرے میں یا تو وہ اپنا اسکول کا کام کرتی یا پھر ہر چیز کو نور سے بغیر پلکیں چھپکائے دیکھتی رہتی۔ جیسے وہ سب چیزیں اس سے ہمکام نہ ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اکثر دیوار پر کچھ نقوش اور کچھ تحریریں ابھرتی گئیں مگر انجلیکا ان تحریروں کو ٹھیک طور پر پڑھنے سے قاصر تھی اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا تھا وہ سمجھنے سے بالاتر تھی۔ دل ہر چیز سے جیسے اچانک ہوتا جاتا تھا۔ ایک دن اسکول سے واپس آتے ہوئے راستے میں اس کی مذہبیز ایک بارش بزرگ سے ہو گئی۔ بزرگ ایک دم سے اسے دیکھ کر چونک گئے انجلیکا بھی ان سے بہت متاثر نظر آئی ان کا باوجود روحانی نور سے مزین چہرہ اسے بہت خوبصورت لگا۔ بزرگ نے شفقت سے پوچھا۔ ”بہن تمہارا نام کیا ہے؟“ انجلیکا نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ ”میرا نام انجلیکا ہے۔“ یہ سن کر بزرگ کا چہرہ حیرانگی کے

بجروہ میں غوطہ زن نظر آیا۔ انجلیکا کو بزرگ کی آنکھوں میں واضح طور پر حیرانی اور کنکش کے آثار نظر آئے۔ انجلیکا چاہتی تھی کہ وہ بزرگ اس سے اور بات کرے مگر وہ بزرگ خاموشی اور حیرانی اپنے پر لئے آگے کو بڑھ گئے۔ انجلیکا وہیں چپ چاپ کھڑی اس بزرگ کو جانتے دیکھتی رہی۔ اور جب وہ نظر آنا بند ہو گئے تب اس نے گھر کی طرف قدم بڑھا دیا۔ بزرگ مسجد میں پہنچ کر خاموش تھے۔ ان کے ایک شاگرد نے ادب سے عرض کیا۔ ”اے پیر و مرشد! آپ کو اتنا خاموش ہم نے بھی نہیں دیکھا۔“ بزرگ نے حیرت کی کیفیت میں جواب دیا ”آج ہم ایک ایسے معمر میں پھنس گئے ہیں جس کا کوئی حل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسا ہم نے آج سے پہلے بھی نہیں دیکھا۔“ ”پیر و مرشد! یقیناً یہ کوئی بہت بڑی بات ہوگی جس نے آپ کو ہجرت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی جانا چاہتا ہوں کہ ایسی انہونی بات کیا ہے؟“ ”ہمیں آج راستے میں ایک بچی ملی جس کا نام انجلیکا ہے۔ مگر جس طرح وہ رومانیت کی سیرگ پر قدم رکھتی تھی نظر آئی۔ ویسے ممکن نہیں ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے نور کا سفر تووری طے کر سکتا ہے آج ہم اس کے بارے میں استعارہ کریں گے ہم حقیقت جانتا چاہتے ہیں کہ آخر بات اصل ہے کیا جو ہماری اتنی ریاضت کے باوجود ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم خود کو بہت صاحب علم خیال کرتے تھے مگر ایک چھوٹی سی بچی نے ہمیں الجھا دیا ہے کہ ہم اس کے سامنے چھوٹے ہیں۔“ شاگرد بھی اپنے پیر و مرشد کی یہ بات سن کر حیران ہو گیا۔ اوشہ انجلیکا آج کچھ سکون محسوس کر رہی تھی۔ جو بے چینی بے سکونی اور اضطراب اسے ایک لمبی کا سکون نہیں لینے دیتا تھا آج اس کا اضطراب جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ دل کو قہر اس محسوس ہو رہا تھا آج وہ خوش تھی

اور انجلیکا کو محسوس ہوا کہ یہ سکون صرف اور صرف اس بزرگ ہستی کی وجہ سے نصیب ہوا ہے۔ اس نے پختہ تہیہ کر لیا کچھ انہیں ضرور تلاش کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کا خدا اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اس بات کو پختہ ارادہ کر کے وہ سو گئی۔ آج انجلیکا کو اسکول جانے کی بھی جلدی تھی تاکہ واپسی پر اس بزرگ کو ڈھونڈ سکے۔ واپسی پر اسے وہ بزرگ وہیں کھڑے دکھائی دیئے بزرگ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر معصوم مسکراہٹ کھل اٹھی۔ بزرگ بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیئے۔ انجلیکا ان کے پاس پہنچ کر دلی جوش سے بولی۔ ”مجھے آپ سے ملنے کی بہت خواہش تھی۔ آپ مجھے یہاں نظر نہ آئے تو میں آپ کو ڈھونڈنے نکل پڑتی۔“ بزرگ احمد شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا۔ ”انجلیکا بیٹا تمہارے کمرے میں ایک الماری ہے اسے آج جا کر اچھی طرح دیکھنا۔ تم کو اس میں سے کچھ ملے گا۔“ انجلیکا نے حیرانی سے پوچھا کہ ”کیا ملے گا مجھے؟“ ”یہ تم خود جا کر دیکھو بیٹا۔“ یہ کہہ کر بزرگ وہاں سے چل پڑے۔ انجلیکا حیرت اور دل میں طرح طرح کے خیالات سوچتے گھر کی طرف بھاگی آج پہلی بار وہ گھر کی طرف دوڑ کر جا رہی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں پہنچنے کی جلدی تھی کمرے میں جاتے ہی اس نے اپنا بیک بستر پر بیٹھا اور الماری کے پاس پہنچ کر اس سے کہا کہ بارے اندر ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتی مجھے دو۔ الماری کا دروازہ کھلا اور کوئی چیز اس کے پاؤں پر گر گئی اور الماری کا دروازہ بند ہو گیا اس نے جھک کر دیکھا تو ایک ڈائری تھی انجلیکا حیران ہو گئی کہ یہ کس کی ڈائری ہے۔ تجسس سے مجبور ہو کر انجلیکا نے ڈائری پر مضمونی شروع کر دی یہ کسی اسماء نامی لڑکی کی ڈائری تھی۔ وہ مسلمان تھی مگر اس نے محبت میں مبتلا ہو کر

## گناہ

جس گناہ سے عزم ہوتی ہے وہ ماں سے ”بدسلوکی“ ہے۔ جس گناہ سے انسان پر لعنت دہی ہے وہ ”جھوٹ“ ہے۔ جس گناہ سے دنیا ہی میں پکڑ ہوتی ہے وہ ”ظلم“ ہے۔ جس گناہ سے رزق تنگ ہو جاتا ہے وہ ”زنا“ ہے۔ جس گناہ پر پردہ فاش ہو جاتا ہے وہ ”نشر“ ہے۔ جس گناہ سے پوری انسانیت تباہ ہو جاتی ہے وہ ”قتل“ ہے۔ جس گناہ سے ”نعتیں چھن جاتی ہیں وہ “تکبر“ ہے۔ جس گناہ سے وعائیں قبول نہیں ہوتیں وہ ”حرام خوری“ ہے۔ جس گناہ سے عبادتیں ضائع ہو جاتی ہیں وہ ”بدعت“ ہے۔ جس گناہ سے جنت حرام ہو جاتی ہے وہ ”شرک“ ہے۔ (المس حبیب خان۔ کراچی) ڈیوڈ سے شادی کر لی وہ حیران رہ گئی کہ ڈیوڈ تو اس کے باپ کا نام ہے۔ مگر اس کی ماں کا نام تو ایسی ہے یہ اسماء کون ہے پھر؟ جوں جوں وہ ڈائری پڑھتی گئی حیرت کی وادی میں اترتی گئی۔ اسماء اس کی ماں تھی۔ جب انجلیکا اس دنیا میں آنے والی تھی ایک دم سے اس کی ماں کے اندر اپنے مذہب سے محبت بیدار ہو گئی اور اس نے کثرت سے نمازیں اور نوافل، ذکر و افکار کا آغاز کر دیا۔ اس کی دن رات اللہ سے دعا تھی کہ اس کی بیٹی روحانیت کے اس مقام پر پہنچے جہاں لوگ زندگی بھر کی ریاضتوں کے بعد بھی پہنچ نہیں پاتے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کر لی۔ انجلیکا حیران رہ گئی کہ یہ سب جو اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کی ماں کی دعا کا نتیجہ ہے۔ اگلے دن اسے بزرگ سے ملنے کی جلدی تھی ہزاروں سوال تھے جو اس کے دل میں چل رہے تھے۔ وہ اسلام کے بارے میں جانتا چاہتی تھی۔ ان بزرگ نے کہا۔ ”اگر وہ پاکستان جاسکے وہاں ایک روحانی پیشوا ہیں وہ اس کی



مرد کریں گے۔ وہاں رہ کر وہ مذہبی تعلیم بھی حاصل کر سکتی ہے اور روحانی منزلیں بھی ستر سکتی ہے۔“

اس نے حامی بھری کہ اسے اپنی ماں کی خواہش کو پورا کرنا تھا اب اس نے اپنے باپ ڈیوڈ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا جب اس نے ڈیوڈ سے بات کی تو حسب توقع وہ غصے سے چیخنے چلانے لگے مگر جو بھی ڈیوڈ کی آنکھیں انجلیکا کی آنکھوں سے ملیں۔ انجلیکا کی آنکھوں سے خیال کی لہر برقی رو کی طرح ڈیوڈ کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی۔ اب ڈیوڈ ایسے خاموش تھا جیسے کچھ نہیں ہوا۔ انجلیکا جانتی تھی اب ڈیوڈ وہی کرے گا جو وہ اس سے کروانا چاہتی ہے۔ ارتکاز افکار کی شق مٹی مرتبہ وہ کچلی تھی ڈیوڈ نے ہنسی خوشی اسے پاکستان بھجوا دیا۔ بزرگ نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ وہ یہاں ایک دینی مدرسے میں بیٹھ گئی۔ اس کا نام انجلیکا سے بدل کر اقرام رکھ دیا گیا۔ وہ مذہب میں ڈھلنے لگی۔

”آج نماز پڑھتے ہوئے میرے ساتھ عجیب بات ہوئی ہے۔“ اقرام مدرسے کے منہم صوفی رحمن سے گویا ہوئی۔

”کیا بات ہوئی؟“ صوفی رحمن نے حیرت سے پوچھا۔

”نماز پڑھتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے میں چھوٹی ہو رہی ہوں اتنی چھوٹی کہ کم ہوتے ہوتے میرا سائز چھوٹی کے سائز سے بھی چھوٹا ہو گیا پھر اس سے بھی چھوٹا، پھر اور چھوٹا اور پھر میں زمین میں اترنے لگی۔ نیچے اور نیچے شاید پاتال میں۔“ اقرام نے گھبراتے ہوئے انہیں اپنی کیفیت بتائی۔

صوفی صاحب ششدر رہ گئے انہوں نے اقرام کو تسلی دے کر بھیجا۔ اب اقرام کے ساتھ اکثر ایسا ہونے لگا کہ کبھی تو وہ پاتال کی گہرائی میں تارخا کو محسوس کرتی اور کبھی آسمان کی بلندی تک جاتا۔

اس طرح آج کل وہ ایک نئے روحانی تجربے سے دوچار تھی۔ جو پرتھر پر بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ اب اسے عجیب الحاح و وجد واضح نظر آتے۔ کچھ تو اسنے

بھیا تک ہوتے کہ اس کی چیخیں نکلتے نکلتے وہ جاتیں۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ ہر انسان کے ساتھ ایسی چیزیں موجود تھیں۔ شاید عام لوگوں کا نظریہ نہیں آتا مگر قدرت نے ہر کلمہ گو کے گرد ایک حفاظتی حصار رکھا ہے تاکہ شیاطین اس کے پاس نہ آسکیں۔ مگر بہت کم تھے جن کا وہ حفاظتی حصار موجود تھا ورنہ سب کا حفاظتی کورنہ صرف یہ کٹوٹ چکا تھا بلکہ ایک بہت خوفناک وجود بھی تھا جو ان کی روح کا خون کی ری رہی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خونی بلا لوگوں کی روحوں کو کمزور سے کمزور تر کرتی جا رہی تھی مگر جن کی روح کے ساتھ یہ سلسلہ جاری تھا انہیں تو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ خونی بلا انہیں اندر سے کتنا کھوکھلا کر چکی ہے ان کی روح کیسے جاں بلب ہے۔ انہیں کیوں اس کا علم نہیں ہو رہا آخر مگر اس بات کا جواب اسے کون دیتا؟ کسی کو یہ بلا، یہ خون آشام بلا، یہ دیما نظر ہی نہیں آ رہے تھے جو اتنا بڑا نقصان کر رہے تھے آہستہ آہستہ ان کے جسم دروہ کی طاقت کو کھینچ کر انہیں کمزور کر رہے تھے۔ آخر وہ ایک ویجاہز سے مخاطب ہوئی۔ ”تم کون ہو؟ اور کیوں اس شخص کو جسمانی و روحانی دونوں طرح سے کمزور کر رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میں وہ شیطان ہوں جو اس کے اپنے اندر موجود ہے۔ اس کی اپنی کوتاہیوں اور اسلام سے دوری کی وجہ سے میں اس کی روح کی ساری طاقت ختم کرتا جا رہا ہوں اگر یہ مسلمان ہوتا تو میں اس کے پاس سے بھی گزرتا تو میں اذیت میں مبتلا ہو جاتا اور اس مسلمان سے پناہ کے پکر میں کہیں دور بھاگ جاتا کہ میرا وجود ختم نہ ہو جائے۔ مگر اللہ کے ذکر سے دوری اور غلط اعتقادات نے اس کا حفاظتی کورنہ توڑ دیا۔ اور اب یہ خود کو خود ہی دھیرے دھیرے مار کر میری غذا کا سامان فراہم کر رہا ہے میں اس کو ختم نہیں کر رہا یہ خود اپنا قاتل بن رہا ہے اب میں اتنا اچھا بھی نہیں کہ یہ مجھے خود اپنے آپ کو میرے سامنے پیش کرے اور میں افکار کردوں ہم سب تو زندہ ہی ان لوگوں کے گناہوں اور برائیوں کی وجہ سے ہیں۔ یہ جتنے گناہ کرتے ہیں ہم اتنا ہی طاقتور ہوتے ہیں۔“

اقرام یہ سب سن کر حیران ہو کر رہ گئی۔ کہ اگر ایسی آدمی سے کوئی مانگے کہ تمہارا تھوڑا سا خون چاہئے تو شاید یہ کبھی نہ دے مگر یہ شیطان جو دن رات اس کے ساتھ ہے اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے اور دن رات اس کا خون چوس رہا ہے اپنے لیے بھیا تک دانتوں سے اسے تو اس کا احساس بھی نہیں کہ یہ دن رات کیسے موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

وہ اپنی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی کہ کیسے لوگ مذہب سے دوری اور اپنے اعمال کے باعث ان خون آشام بلاؤں کے زیر تسلط تھے۔ اور وہ جادو گروں کے پاس دوڑ رہے تھے جو ان کے مرض کو کسی ان کے رشتہ داروں کے جادوؤں کا نتیجہ قرار دے کر ادران کے جادو کی کاٹ کے نام پر لمبی چوڑی رقمیں وصول کر رہے تھے۔ کہیں وہ دیکھ رہی تھی انسانوں کے اندر خوفناک اژدھے پل رہے تھے جن کی خوراک انسانی غصہ تھا۔ اور وہ اپنی پسینہ کی خوراک کھا کر اتنے مضبوط اور طاقتور ہو چکے تھے کہ اس نے انسان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اور یہ انسانی اژدھا اتنا بے لگام تھا کہ اس کے اپنے بی بیچوں، بیوی باپ، ماں، عزیز واقارب کو کھٹا جا رہا تھا اور انسان اتنا کمزور اور بے بس تھا جیسے اس اژدھے کا غلام بن چکا ہے۔ یہ کئی نفرت لہتا تھا اور اس نے انسان کے گرد اپنا حصار قائم کر رکھا تھا اور اسے لگا تار تنگ سے تنگ کرتا جا رہا تھا۔ اور اس انسان کو احساس تک نہیں تھا اس کے اپنے اندر، اس کے اپنے خون سے ایک خطرناک اژدھا پل رہا ہے۔ جو اس کے اپنی کو تو نگل رہا ہے مگر کسی دن اچانک اسے بھی نگل جائے گا۔

اب اقرام میں اتنی طاقت آچکی تھی کہ اس کی روح اس کے بدن سے الگ ہو کر جہاں چاہے جا سکتی تھی اور کچھ دیر کے بعد واپس اپنے بدن میں آ جاتی۔ اس دن بھی اس نے اپنی روح کو بدن سے الگ کیا اور پھاڑوں پر پہنچ گئی۔ یہاں وہ حالت استغراق میں تھی اپنے ذرا دکار کر کے میں مجھ کی اور ہر چیز سے بے گانہ

اپنے ہی ورد میں ڈوبی، وہی۔ اس کا ورد ختم ہوا تو نجانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔

وہ واپس لوٹی تو حیران رہ گئی کہ وہاں اس کا جسم موجود نہیں تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی باتوں سے چٹا چلا کہ اس کے جسم کو مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا ہے اس کی روحانیت اس کے لئے سزا بن گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کرے کہاں جائے؟

اتنے میں اس کی تیسری آنکھ نے دیکھا ایک اسپتال میں ایک مردہ بچہ منہ میں کھڑکیوں پر اس عورت کو جب پتہ لگا کہ اس کا بچہ مردہ ہے تو یہ تو مرجائے گی اس کا شوہر اور گھر والے تو پہلے ہی ایک ایکسڈینٹ میں مر چکے ہیں بس اس بچے کے سہارے تو یہ بد نصیب زندہ تھی۔

اقرام نے فوراً فیصلہ کر لیا اور اس بچے کے جسم میں داخل ہو گئی۔ بچے نے سانس لینا شروع کر دیا۔ وہاں موجود ڈاکٹر اور نرسیں حیران رہ گئیں۔ یہ ان کی میڈیکل ہسٹری کا پہلا واقعہ تھا کہ ایک مردہ بچہ اچانک زندہ ہو گیا تھا سب حیرت کے ساتھ خوش بھی تھے کہ اس عورت کو جینے کا بہانہ مل گیا اب اس بچے کے سہارے یہ زندہ رہ پائے گی۔

اقرام سوچ رہی تھی ہم لوگ اللہ کے سوا اور سہارے کیوں ڈھونڈتے ہیں آخر؟ کیوں فانی چیزوں اور انسانوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

سب کو معلوم ہے اپنی اصل کا، اپنی منزل کا پھر بھی خود کو گھوک دیتے ہیں اس عورت کی ساری امیدیں اس بچے سے وابستہ ہو گئیں ہمیشہ کی طرح یہ اس بار بھی اپنے خالق کو بھول گئی اسے اپنا سہارا نہیں سمجھا شاید اب یہ لوگ صمم، بکم، عصبی کی عملی تفسیر بن چکے ہیں جن کے دلوں پر، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی اب یہ لوگ ہدایت کے راستے کی طرف شادی نہیں آئیں گے۔



وہ واقعی پر اسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گلہ نشہ قسط کا خلاصہ

حکیم، ہمارے کتاب دوشی کا سفیر پڑھ کر ختم کی تورولوکا بولا۔ مصنف نے واقعی کمال کر دیا ہے، بہت اچھی اور بالکل حقیقی واقعات بیان کئے ہیں، بہر حال بہت سزا آ یا کوئی اور اچھی کتاب، دو تو ضرور سنا بیٹے گا۔ یہ سن کر حکیم دنگر بولے۔ آپ فکر نہ کریں میں کوشش کروں گا کہ کوئی اور اچھی کتاب آپ کو پڑھ کر سناؤں اور ہاں یاؤ یا، حکیم دنگر نے کہا۔ ایک صاحب آئے تھے بہت پریشان تھے اور باتوں باتوں میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، ان کی عمر تو اسی سال ہے مگر دیکھنے میں وہ ساٹھ کے لگتے ہیں، انہوں نے یہ لغاضہ اور یہ ڈانڑی دی ہے ان کا کہنا ہے کہ میں نے سارے واقعات ڈانڑی میں درج کر دیے ہیں، روہو کا نے ڈانڑی لی اور اپنے کمرے میں آ کر لغاضہ کھول کر پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا کہ حکیم صاحب میرا نام پر تاب سٹکھ ہے۔ دوش سنبالتے ہی میں آزاد طبیعت کا مالک ہو گیا تھا۔ سکول اور پھر کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایک چھٹی میں میں گاؤں آیا اور اپنے دو چچا زاد بھائیوں کے ساتھ شکار پر نکل گیا۔ گاؤں سے تھوڑی دور پر چنگ تھا۔ اس دن شکار نہیں ملا تو ہم نے واپسی کے لئے اپنے اپنے گھوڑوں کو موڑا، مگر پھر اچانک ایک ہرن نظر آیا تو چچا زاد بھائی سیکل نے ہرن پر گولی چلا دی، گولی ہرن کو لگی مگر ہرن نگڑاتا ہوا بھاگا تو بھائی بھی اس کے پیچھے لگ گئے اور ہم دونوں بھی ان کے پیچھے بھاگے تھوڑی دور جا کر دیکھا تو سیکل بھائی بے ہوش پڑے تھے اور ان کے سامنے ایک سر پڑا تھا جو کہ بہت ہی بھیاک شکل کا تھا۔ خیر بھائی کو اٹھا کر ہم لے آئے، گھر آ کر ان کی حالت بہت غیر ہونے لگی اور معلوم ہوا کہ ان پر ایک جھنگلی ہوئی آتما نعرہ سوار ہو گئی تھی، خیر اس آتما نے کئی کمروں کی بھیجٹ لے کر بھائی کی جان چھوڑ دی۔ اس کے بعد میں کالج آ گیا۔ روہو کا نے سیکل تک پڑھا تھا کہ ایک ملازم آ گیا اور روہو کا سے بولا۔ حکیم صاحب آپ کو حکیم دنگر بلا رہے ہیں۔ روہو کا اٹھا اور ملازم کے ساتھ حکیم دنگر کے کمرے میں آ گیا۔ حکیم دنگر کے سامنے ایک صاحب اور ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ بہر حال روہو کا ان دونوں کو اپنے کمرے میں لے کر آ گیا اور ان کی روواؤ سننے لگا۔ اس لڑکی جس کا نام خوشبو تھا۔ اس پر ایک جنم زاوہ عاشق ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے سارے گھر والے بہت پریشان تھے روہو کا نے باپ بیتی کو قتل کی وی اور بولا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں میں کوشش کروں گا کہ اس جنم سے آپ لوگوں کی جان چھوٹ جائے۔ وہ جن ہر روز رات میں خوشبو کے پاس اس کے کمرے میں آتا تھا۔ جب وہ اس رات خوشبو کے پاس آیا تو وہ خوشبو سے بولا۔ مجھے کمرے میں کسی ادنیٰ بھی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے، اور ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی میری نگرانی کر رہا ہے۔ (اب آگے پڑھیں)

خوشبو بولی۔ آپ خواہ مخواہ تنگ

کر رہے ہیں، بھلا آپ کی طاقت کے آگے کسی کی مجال ہے جو آپ کی نگرانی کرے، لگتا ہے کہ آپ آج کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں۔ اس سے پہلے تو آپ نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ کسی میں اتنی ہمت ہے کہ آپ سے ٹکرائے، آپ پریشان نہ ہوں۔

”ہو سکتا ہے کہ میرا یہ دہم ہو، خیر چھوڑو ان باتوں کو، ان باتوں میں وقت گزر رہا ہے، اگر ایسا ہوا تو

میں اسے دیکھ لوں گا، اور تمہاری حفاظت کے لئے میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا، میں کسی بھی صورت تم سے دور نہیں ہو سکتا، یہ میرا اہل فیصلہ ہے، کوئی مد مقابل آیا تو پھر اس کی خیر نہیں، چاہے تمہارا کوئی خونی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اچھا اب وقت ضائع نہ کرو اور میری آغوش میں آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

اور پھر خوشبو کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ خوشبو اس کی ہاتھوں میں ساکت ہو کر رہ



مگنی۔ تو رولوکانے اب غائبانہ طور پر کمرے میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

جن زادہ روشاک کافی دیر تک خوشبو کی ذات سے لطف اندوز ہوتا رہا، اور پھر ایک مقررہ وقت پر جو کہ اکثر اس کا وقت ہوتا تھا۔ اس وقت پر خوشبو کو بے سدھ چھوڑ کر کمرے سے غائب ہو گیا۔

صبح کافی دیر تک خوشبو سوئی رہی اور پھر بہن کے جگانے پر اس کی آنکھ کھلی۔ خوشبو کی آنکھیں جاگنے کی وجہ سے آج کچھ زیادہ ہی سرخ ہو رہی تھیں، جنہیں دیکھ کر کہکشاں نے پوچھا۔ ”آئی آج تو آپ کی آنکھیں بہت زیادہ سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا آنکھوں میں کوئی تکلیف ہو گئی ہے؟“

”کہکشاں ایسی کوئی بات نہیں۔ رات سر میں بہت شدید درد تھا جس کی وجہ سے کافی دیر تک جاگی رہی تھی، چلو نیچے چلتے ہیں۔“ اور پھر دونوں ہمیشہ سیڑھیوں سے اترتی ہوئی نیچے چلی آئیں۔

خوشبو پر نظر پڑتے ہی اس کی ای بولیں۔ ”ارے خوشبو آج تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے، آج تو بہت زیادہ سرخ ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم پر اور ہمارے حال پر رحم کرے۔ بیٹا میں تو یہ سوچ سوچ کر مٹھتی جا رہی ہوں کہ کاش! تم نے شروع دن ہی میری بات مان لی ہوتی تو آج یہ جان لیوا کھن دن دیکنا نصیب نہ ہوتا۔ تمہارے ابو بھی دن رات کرب و اذیت کے پہاڑ تلے دبے چلے جا رہے ہیں۔“

بیٹا تمہارا ذہن تو جب اس کے تسلط سے فراغت پاتا ہے تو تم گھڑی دو گھڑی کے لئے اپنے ذہن کو آزاد پاتی ہو لیکن ایک ہم نہیں کہ ہم سارے گھروالے ہر وقت ہر لمحہ سوچوں کے گرداب میں پھنسے رہتے ہیں۔ لگتا ہے اس کرب و اذیت کی وجہ سے ہم زندہ درگور ہو جائیں، یا پھر.....“

خوشبو کی ای نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”ای آپ زیادہ فکر نہ کریں، اللہ نے چاہا تو بہت جلد ہم ان جان لیوا مصائب سے چھٹکارا پائیں

گئے، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہماری جان تمام پریشانوں سے چھوٹ جائے گی۔“ خوشبو بولی۔

”چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشہ کرو۔“ اس کی والدہ بولیں۔ تو خوشبو اپنا بخلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔

ادھر رولوکانے اپنے کمرے میں بیٹھا اس جن زادہ روشاک کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ”کم بخت خوشبو کو اپنے گھٹنے میں جکڑ چکا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو ایک قسم کا سحر خوشبو کے دل و دماغ پر طاری کر دیتا ہے جس کی وجہ سے خوشبو کا دماغ اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ خیر میں دیکھتا ہوں کہ اس کا سدباب کیا ہوتا ہے۔ اس کا مکمل علاج ضروری ہے، یعنی اس کا خاتمہ، کیونکہ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ کسی بھی وقت جب موقع ملے یہ کوئی بھی ناخلفانی نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئے گا۔ یا پھر اگر اسے قید بھی کر دیا گیا تو کسی وجہ سے یہ آزاد ہو گیا تب بھی یہ خوشبو کی ذات اور اس کے گھرانے کو نقصان پہنچانے سے ذرا بھی نہیں ہٹکے گا۔ اور اگر اس درمیان خوشبو کی شادی ہو گئی تو یہ اس کا اور بھی دشمن بن جائے گا۔ خیر کوئی بات نہیں، روشاک تو بھی کیا یاد کرے گا تو ناحق کسی معصوم پر اپنا تسلط جما بیٹھا ہے۔“ اور یہ بول کر رولوکانے مسکرانے لگا۔

دوسری رات آئی اور پھر رولوکانے غائبانہ طور پر خوشبو کے کمرے میں موجود تھا۔ اپنے وقت پر روشاک کمرے میں حاضر ہو گیا۔ خوشبو اپنے سر پر اپنا ہاتھ رکھے آنکھیں موند کر سوچوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبی پڑی تھی۔ اسے آواز سنائی دی۔ ”خوشبو۔“ تو اس نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ”آپ آ گئے۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ ہی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ ابھی تک آپ نہیں آئے۔ اب تو میں اپنی نیند بھی نہیں سو سکتی۔ کیونکہ ہر بل آپ کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور یہی سوچ سوچ کر آنکھوں سے نیند کوسوں دور رہتی ہے۔“

وہ خوشبو کی باتیں سنتا رہا اور اجنبی کی حالت میں اپنی آنکھیں کمرے کے چاروں طرف دوڑاتا بھی

رہا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اندرونی طور پر عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا ہو۔

”کیا بات ہے؟“ آپ اس طرح گھور گھور کر کمرے میں کیا دیکھ رہے ہیں؟“ خوشبو نے پوچھا۔

”کیا بتاؤں، مجھے کسی کی موجودگی کا گمان ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی ہم دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی نا دیدہ قوت۔“ روشاک اپنے ہاتھ کو مسلتے ہوئے بولا۔

”آپ کے علاوہ کوئی اور نا دیدہ قوت کون ہو سکتا ہے۔ میں تو سمجھ رہی ہوں کہ آپ کو اس قسم کا وہم ہو گیا ہے۔ مجھے تو ایسا بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہا۔“ خوشبو بولی۔

”خوشبو! جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں، وہ تم نہیں محسوس کر سکتی۔“ اور پھر اس کی ایک گرجدار غصیلی آواز گونجی۔ ”اگر کوئی موجود ہے تو فوراً سامنے آ جائے، ورنہ اگر میں نے اسے طریقے سے معلوم کر لیا تو تمہاری خیر نہیں، تمہیں اندازہ نہیں کہ ایک جن کی طاقت کیا ہوتی ہے۔“

اس کی آوازوں کے علاوہ پورے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ ”اب بھی دقت ہے تم جو بھی ہو فوراً ظاہر ہو جاؤ، نہیں تو.....“ اور پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ دیوار کی طرف کر دیا۔ پانچوں انگلیوں سے سرخ رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کے بعد وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم کر یہ عمل کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ سے نکلتی سرخ چنگاریاں دیواروں پر پڑتی رہیں۔ مگر کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا تو وہ جیسے شکست خوردہ انداز میں تھرا آلود نظروں سے سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔ ”میں نے اپنی طاقت کا تجربہ آزمایا مگر.....“ اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں، میرے اور آپ کے علاوہ اس کمرے میں اور کون ہو سکتا ہے، آپ اپنے آپ کو پریشان نہ کریں، چلیں میرے قریب بیٹھیں۔“ اور خوشبو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بیٹھا لیا۔

پھر وہ بولا۔ ”اگر تو کوئی ہے بھی تو، میں دیکھ لوں

گا، اس حقیقت کو پانے کے لئے اب مجھے کسی وقت دن میں بھی آنا پڑے گا، پھر میں دیکھتا ہوں کہ.....“ اور اس نے اس بار بھی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ کی پریشانی دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، آپ اس مسئلے کو چھوڑیں، کمرے میں کوئی بھی نہیں، صرف میں کمرے میں موجود ہوں، کوئی اور نہیں۔“ خوشبو مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے خوشبو کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

”خوشبو! میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تمہیں کوئی مجھ سے جدا کر دے۔ میں تمہیں کتنا چاہنے لگا ہوں اس کا تمہیں اندازہ نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ تم میری جان ہو۔ کاش! کہ اگر میرا بس چلتا تو میں ایک بل کے لئے بھی تم سے جدا نہیں ہوتا۔“

مگر میں مجبور ہوں، کیونکہ میرے قبیلہ کا قانون بہت سخت ہے، اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ حدود سے تجاوز اور غلطی کی سزائیں کوئی بھی نری نہیں برتی جاتی، چاہے وہ جنتا سردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ خیر کوئی بات نہیں، تمہاری خاطر کبھی وقت آیا تو میں اپنی جان تمہا در کر دوں گا، لیکن تمہاری ذات سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔“ وہ بولا۔

”اگر آپ کے قبیلہ کا اتنا سخت قانون ہے، اور آپ اس طرح چھپ چھپ کر یہاں آتے ہیں، اگر آپ کے قبیلہ والوں کو اس بات کی خبر ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟“ خوشبو بولی۔

”خوشبو! میں یہاں آتا ہوں اس کی خبر قبیلہ والوں کو نہیں ہو سکتی۔“

”اور اگر کسی طرح خبر ہو گئی تو پھر آپ کیا قدم اٹھائیں گے اور پھر میرا کیا ہوگا؟“ خوشبو بولی۔

”تم فکر نہ کرو، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ویسے ہم مسلمان جنتا ہیں، میرے والد قبیلے کے سردار ہیں، ہمارا قبیلہ شریعت کا بہت پابند ہے اور خاص طور پر میرے والد تو کفر قسم کے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی طرف

سے دل دہل جاتا ہے۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں، بس تم مجھے اچھی لگی اور میں تم پر اپنا دل پار بیٹھا، اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں معلوم۔“ اس نے خوشبو کا ہاتھ دبا تے ہوئے کہا۔

اس کے بعد بات جب آگے بڑھی تو رولو کا کمرے سے باہر نکل گیا اور پلک چمکتے ہی وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔

کمرے میں آکر رولو کا نے ہاتھ منہ دھو یا اور پھر بستر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی، تو اس نے دل ہی دل میں کچھ سوچا اور فوراً اس کا ایک کارندہ حاضر ہو گیا تو وہ بولا۔

”شران کل صبح سورج طلوع ہونے کے بعد فلاں گاؤں میں فلاں گھر کے چھتے پر جو کمرہ موجود ہے اس میں موجود رہتا ہے اور یہ خیال رہے کہ کسی طور پر بھی گھر والوں کو تمہاری موجودگی کا پتہ نہ چلے، چاہے کچھ بھی ہو جائے تم نے خاموش رہنا ہے اور پھر یہ بھی خیال رہے کہ تمہارا شاہد تک ظاہر نہ ہونے پائے، ورنہ بنانا یا کھیل بگڑ جائے گا۔“

میں تمہیں صاف اور واضح طور پر بتا رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس کمرے میں کوئی جن آدمی کے تو تمہاری موجودگی کو وہ محسوس کرے اور پھر اپنا کوئی حربہ آزمائے، مگر تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دینا ہے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس کا کوئی بھی حربہ تم پر کارگر نہیں ثابت ہوگا۔ روزانہ صبح سورج طلوع سے غروب ہونے تک اس کمرے میں رہتا ہے۔“

رولو کا کارندہ شران بولا۔ ”آپ کا حکم سر آنکھوں پر، آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی، میں آپ کی باتوں پر عمل کر دوں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ یہ بول کر شران غائب ہو گیا۔

صبح ہوئی! سورج کے طلوع ہوتے ہی شران! خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ خوشبو جوئے خواب تھی۔ شران ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ خوشبو ساڑھے آٹھ بجے اٹھی اور انگڑائی لیتی

ہوئی کمرے سے نکل کر نیچے اپنی والدہ اور بہنوں کے پاس آ گئی۔ اسے دیکھ کر اس کی امی بولیں۔ ”ارے خوشبو! آج تو تم جلدی اٹھ گئیں۔“

”جی امی! آج میری آنکھ جلدی کھل گئی۔“

”اچھا ہوا۔ خیر چلو منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔“

”جی امی! میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آئی۔“ اور خوشبو غسل خانے میں چلی گئی۔

ناشتہ کے بعد خوشبو اور اس کی دونوں بہنیں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں، تینوں بیٹنیں مل کر دن کا کھانا تیار کر نے لگیں۔ کھانے کے وقت پر دسترخوان لگ گیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے تک دن کے دن گئے۔

اس کے بعد کمرے میں بیٹہ کرتیوں بہنیں اور ان کی والدہ گھر بیٹو باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ باتوں کے درمیان خوشبو کا دل کی انجان بے چینی کی وجہ سے عجیب طرح کا ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی انجان قوت اسے اپنے کمرے میں جانے کے لئے دباؤ ڈال رہی ہو۔

”اچھا امی، اب میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ طبیعت ذرا نیند بھرنے کو چاہ رہی ہے۔“ خوشبو نے کہا۔

”ارے یہ کون سی بات ہوئی آج دن میں تم کیسے سوئے جا رہی ہو، اس سے پہلے تو تم دن میں سوئی نہیں۔ یہ اچانک نیند کا معاملہ.....؟“ امی نے پوچھا۔

”امی پتہ نہیں آج کیوں نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ میں چلتی ہوں، ایک گھنٹہ میں داپس آ جاؤں گی۔“ خوشبو نے کہا اور پھر اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک کمرے میں روشاک نمودار ہوا اور اس کی آواز سنائی دی۔

”خوشبو!“ یہ سننا تھا کہ بڑا کر خوشبو بستر پر اٹھ بیٹھی اور بدحواسی کے عالم میں بولی۔ ”آپ اور اس وقت،

خدا کے لئے اور مجھے اذیت نہ دیں، فوراً چلے جائیں، اگر کسی کی نظر پڑ گئی تو کبھی تو آپ دن نہیں آئے۔“

”خوشبو! تم اس قدر گھبراؤ نہیں، تمہارے گھر والے تو یہ بخوبی جانتے ہیں کہ میں اکثر بلکہ ہر روز تم سے ملتا ہوں، پھر کسی کی نظر پڑنے کا سوال کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ میں تمہارے علاوہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا۔“

دراصل میں اس بات کی تصدیق کے لئے آ گیا تھا کہ دیکھوں کہ پچھلی راتوں میں مجھے جو کسی اور کے وجود کا شک ہو تھا، وہ دن میں تو نہیں، مگر مجھے اس وقت بھی ویسا ہی محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت بھی کوئی وجود کمرے میں موجود ہے، مگر یہ وجود جو کہ میرے وار سے بچ رہا ہے، میں نے جو دار اس پر کیا تھا، وہ ایسا وار ہے کہ کسی اندہ کسی مخلوق کا اس وار سے بچ نہ سکا ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

لیکن ایک بات اور میرے دماغ میں آ رہی ہے کہ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔“ روشاک بولا۔

”آپ تو خواہ مخواہ شک میں پڑ گئے جبکہ آپ نے بہت زبردست وار بھی کیا، اگر کوئی وجود ہوتا تو وہ اسی وقت خاکستر ہو جاتا۔ میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اس شک کو اپنے دماغ سے نکال دیں اور آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔“ خوشبو بولی۔

”خوشبو! تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے کہ آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا؟“ روشاک نے کہا۔

”میرا مطلب کوئی غلط نہیں، میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر کوئی اندہ کسی مخلوق کا آپ کو احساس ہو چکی رہا ہے تو کسی نہ کسی وقت وہ مخلوق آپ کے سامنے آ جائے گی۔“

”ہاں! یہ بات تمہاری درست ہے، اگر وہ میرے سامنے آئی تو پھر اس کا مجھ سے بچ نہ سکا ممکن نہیں۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں ورنہ آپ فکر کے پہاڑ تلے دب چلے جائیں گے۔“ خوشبو نے کہا۔ لیکن خوشبو کے دماغ میں یہ بات اب مکمل طور پر بیٹھ چکی تھی کہ وہ نہ حکیم کامل نے ضرور کچھ ایسا کیا ہے تاکہ بے چین

ہو جائے اور پھر وقت کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جائے اور مجھے یہ بات بھی بہت اہل لگتی ہے کہ حکیم کامل اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئے گئے عمل پر اس کا وار کارگر ثابت نہیں ہوا۔ اور کامیابی کی سبیل نظر آ رہی ہے۔“

”تم کیوں خاموش ہو گئی، خوشبو! تم اپنے دماغ میں کوئی ایسی بات نہ لاؤ، کوئی بھی دیکھی یا اندہ کسی چیز ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتی، اور اگر کسی نے ایسا سوچا بھی تو میں اس کا حشر نشتر کر کے رکھ دوں گا، ایسا سوچنے والے کا نام دنیا سے مٹا کے رکھ دوں گا۔ خیر اب میں چلتا ہوں، رات میں پھر ملاقات ہوگی تم آرام کرو۔“ اور یہ بولتے ہی وہ نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

”خوشبو دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی یقیناً یہ عمل حکیم کامل ہی کا ہے۔ ورنہ آج اور کل رات سے پہلے روشاک نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

خیر یہ بھی اچھا ہوا کہ اب وہ ناقابل یقین بے چینی سے دوچار ہو گیا ہے۔ اس نے ہم گھر والوں کو بھی ایک طویل عرصہ سے کرب و اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی حرف آخر نہیں، یہاں پر ہر سیر پر سوا میرا موجود ہے۔ اب اس روشاک کے بچے کو معلوم ہوگا کہ طاقت کیا ہوتی ہے۔ اور اسی قسم کی باتیں سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

شام کے چھ بجنے والے تھے کہ کمرے میں خوشبو کی بہن کبکشاں آئی اور یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ خوشبو ابھی تک جوئے خواب تھی۔ اس نے دیکھتے ہوئے خوشبو کا ہاتھ پکڑا اور آواز دی۔ تو خوشبو کی آنکھ کھل گئی۔

”ارے کبکشاں! تم! خیریت تو ہے؟“ خوشبو نے پوچھا۔ ”آپ نیچے نہیں آئیں تو امی نے کہا کہ جا کر دیکھو، ابھی تک خوشبو نیچے نہیں آئی، سارے کام اس کے حصے کے پڑے ہیں۔ اسے کہو کہ جلدی سے نیچے آئے اور رات کے کھانے کی تیاری کرے۔“

پتہ نہیں کیوں آج مجھے نیند آ گئی، میں تو بے خبر سو رہی تھی اگر تم نہ چگائی تو پتہ نہیں اور کب تک سوئی





بدلتی تھی، اس کی کھر کھرائی آواز میں دشت تھی اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں، وہ اپنی منھیاں پھینچنے لگا تھا، وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم رہا تھا اور پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر چند ساعت بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس کی آنکھوں سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکلنے لگیں، وہ شعاعیں چاروں طرف کمرے میں پھیل گئیں۔

ان شعاعوں نے پورے کمرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ چاروں دیواروں، چھت اور فرش شامل تھے مگر اس سے پہلے روشاک نے بستر کے چاروں طرف اپنی انگلی کے اشارے سے ایک دائرہ کھینچ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ سرخ شعاعیں بستر سے ذرا ہٹ کر تھیں۔

”اب میں دیکھتا ہوں کہ تو کیسے بچتا ہے، تیرا وجود آج ہر حال میں ختم ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو فوج کر دکھا، میں بھی تو تیری طاقت دیکھوں، لیکن اب بھی دقت ہے کہ تو میرے سامنے آ جائیں تو۔۔۔“ اور اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ کیونکہ پورے کمرے میں سرخ شعاعیں گردش کرتی رہیں مگر کوئی بھی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر روشاک اور بھی پوچھ لگا گیا۔

ٹھوڑی دیر بعد کمرے میں موجود تمام شعاعیں غائب ہو گئیں لیکن روشاک کی بدحواسی عروج پر تھی۔ وہ زخمی سانپ کی طرح تھلا اور پھٹکار رہا تھا۔

ادھر خوشبو بستر پر سہمی ہوئی بیٹھی ایک روشاک کو دیکھ کر جا رہی تھی، اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ روشاک کی تمام باتیں کمرے سے باہر کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس لئے وہ اس طرف سے مطمئن تھی ورنہ وہ آوازیں سن کر گھر والے پوچھ لگاتے اور رات کے اس پہر ان کا سکون غارت ہو جاتا۔

ایسا لگتا تھا کہ روشاک اپنے آپ میں نہیں، اس پر جیسے جنوں سوار ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک ننگ ایک ہی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے میں جیسے تیز ہواؤں کا جھکڑ چلنے لگا لیکن چند ساعت بعد ہی ہواؤں کا جھکڑ غائب ہو گیا۔

اس کے بعد ایک روشاک کا دایاں ہاتھ لہا ہوتا شروع ہوا، اور دیوار کی طرف بڑھا، جس دیوار کی طرف وہ نظر سن جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ لمبا ہوا، دیوار کے پاس پہنچ گیا، اور پھر اس کا ہاتھ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ چند ساعت تک اس کا ہاتھ دیوار کے ساتھ لگا رہا، پھر آہستہ آہستہ دیوار سے ہٹ کر سینے پر اور سینے سینے اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس کے جسم میں ایک زبردست جھرجھری نظر آئی۔ اس کے بعد پھر اس نے ایک اور لمبا سانس کھینچا۔

ابھی بھی خوشبو اسے ٹھٹکی باندھے دیکھنے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس پر سکت طاری ہو گیا ہو، صرف اس کی آنکھوں کی پلکیں ہی جھپکتی نظر آ رہی تھیں اور پورا وجود جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔

”خوشبو تم گھبراؤ نہیں، میں سب کچھ سن رہا ہوں گا۔“ جب یہ آواز خوشبو کے کان میں پڑی تو جیسے وہ چونک پڑی۔

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ جی!!“

”جی۔۔۔۔۔“

”میں سمجھنے سے قاصر ہوں، یہ تو حقیقت ہے کہ کوئی ناویدہ فوت کمرے میں موجود ہوتی ہے، میں تمام حربے آزما چکا ہوں، تمام طاقتیں صرف کر چکا ہوں مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، میں ایسا خطرناک اور خوفی وار آزما چکا ہوں۔ ایسی خوفناک شعاعیں ہیں کہ اگر کوئی شے دیوار کے اندر بھی موجود ہو تو وہ جل کر خاکستر ہو جائے، لگتا ہے وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، چلے کہ وہ ہے کون۔ بہر حال میں اسے چھوڑ دوں گا نہیں۔ آج میں اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کروں گا، شاید مجھے کوئی اور تریب بتائیں۔

لیکن پھر ایک خیال آتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن پھر یہ بھی خیال آتا ہے

کہ اس سے پہلے تو کبھی ایسا کچھ نہیں ہوا، اور کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسا خطرہ مول لے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تم گھر والوں یا پھر رشتہ داروں میں سے کوئی بھی کسی عامل کے پاس گیا ہو، اور اگر ایسا ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ کوئی کسی عامل کے پاس گیا ہے۔

پھر ایک خیال اور بھی آتا ہے کہ شاید کوئی ہنگامی بوٹی فوت ہو، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کسی ہنگامی بوٹی ہستی کا ہم دونوں کے مسئلہ ملاپ سے اس کا کیا نقصان ہوگا کہ ہمیں اس میں آن کوئی بہر حال اگر کوئی ہستی ہے تو میں اسے نہیں چھوڑ دوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“

یہ تمام باتیں سن کر خوشبو نے بھی ایک لمبا سانس کھینچا اور بولی۔ ”آپ تمام طاقتیں آزما چکے، بقول آپ کے یہ بہت خوفناک اور خوفی وار ہے، اس کے باوجود اگر کوئی ناویدہ فوت ہے تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی عامل کے پاس نہیں گیا۔ اور کوئی جا بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ہمارے گھر والے اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں، اور اب تو گھر والے بھی آپ کی خوشی میں خوش ہیں، اور میں تو دل و جان سے آپ پر ہمارے ہوں۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ کوئی اس معاملے میں کیسے مداخلت کر سکتا ہے۔ کسی کو ایسا کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ اور میں تو یہ سمجھ نہیں سکتی کہ اندرونی معاملات کیا ہیں، آپ بخونی جانتے ہیں۔ میرا تو مشورہ ہے آپ اس طرف دھیان نہ دیں۔ یہ سب آنے والے حالات پر چھوڑ دیں۔

میں ایک مرتبہ پھر کہہ رہی ہوں کہ اگر کوئی ناویدہ وجود ہوا تو کسی نہ کسی روز تو سامنے آئے گا ضرور اور جب وہ سامنے آئے گا تو آپ سے پچاسا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ آپ کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہونا چاہئے۔ اور پھر جب میں آپ سے راضی خوشی ہوں تو کسی اور کو مداخلت سے کیا فائدہ ہوگا، آپ بے فکر رہیں،

میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں، مزیدادہ سوچیں نہیں، ورنہ آپ خوشیوں میں جلا ہو کر جانی توازن کھو بیٹھیں گے۔“ خوشبو نے ہر ایک لفظ کو جیسے چبا چکا کر ادا کیا۔ مگر خوشبو تو دل ہی دل میں بہت خوش تھی اور اس کا بل پل کا سکھ چھن چھن جائے، اور اس قدر اذیت سے دوچار ہو جائے کہ جینا محال ہو جائے۔

”خوشبو! تمہاری باتیں سن کر میں بہت خوش ہوا، واقعی تم بھی مجھے دل سے چاہتی ہو، تمہاری باتوں سے میں بہت مطمئن ہوں، بس تم حکم کرو، میں دنیا کی ساری دولت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ میں کسی بھی صورت تمہاری آنکھوں میں پریشانی کی جھلک نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر تم سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اور ہاں! یاد آیا۔ آج میں کچھ رقم لے آیا ہوں، اپنے گھر والوں کو دے دیتا، سامنے بیک پڑا ہے، رقم ہے تو ٹھیک ٹھاک اگر کم ہو تو بتا دیتا۔ اپنے والد کو دیتا اور کہتا کہ اگر اور ضرورت ہو تو، میں اور بھی لا دوں گا۔ گھر کو زیادہ وسیع اور عالی شان بنوا لیں گے۔“ خوشبو مسکراتے لگی اور بولی۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہم لوگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ میں بھی تو ہر بل آپ کے انتظار میں اپنا وقت کاٹی ہوں اور جب آپ پر نظر پڑتی ہے تو میرا دل بہت خوش ہو جاتا ہے، مکاش! کہ آپ میری نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔“ خوشبو ادھر پر ہی دل سے تو یہ باتیں کر رہی تھی مگر اندر ہی اندر اس کے خیالات روشاک سے باغیانہ تھے۔ وہ بستر سے نیچے اترتی اور بیک کو کھول کر دیکھا تو وہ مسکراتے لگی اور بولی۔ ”یہ رقم تو بہت زیادہ ہے، آپ کہاں سے لائے، خیر اسے میں اباحضور کے حوالے کر دوں گی۔“ یہ بول کر وہ بستر پر دوبارہ بیٹھ گئی، پھر بولی اب تو آپ بہت مطمئن نظر آ رہے ہیں، کمرے میں جس ناویدہ فوت کو آپ محسوس کر رہے تھے کیا وہ چلی گئی یا اب بھی کمرے میں موجود ہے؟“



”وہ بھاگ گیا، اگر نہیں بھاگتا تو آج اس کا آخری وقت ہوتا، خیران باتوں کو چھوڑو“ اس کے ساتھ ہی اس نے خوشبو کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی ہانپوں میں سمیٹ لیا۔ خوشبو ایک ادا سے لہراتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کے بعد دونوں جذبات کے ٹھٹھیں مارتا سمندر کے گرداب میں غوطہ زن ہو گئے۔ اس کے بعد خوشبو کب غنڈکی وادی میں اتر گئی اسے پتہ نہ چلا۔

خوشبو صبح کے وقت اپنے کمرے سے نکلے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالا بیگ تھا جسے دیکھ کر اس کی والدہ اور والدہ اچھیے میں پڑ گئے۔

”خوشبو! یہ کیا ہے؟“ اس کی والدہ نے پوچھا۔

”ای! اس میں روپے ہیں، رات وہ لے آیا تھا، اس نے کہا ہے کہ اپنے والد کو دینا تاکہ اس رقم سے وہ گھر کو زیادہ وسیع اور عالیشان بنائیں۔“ یہ بولی کر خوشبو نے بیک اپنے والد کے سامنے رکھ دیا۔

”بس بیٹا! مرنا کیا نہ کرتا۔“ یہ بولی کر انہوں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور خاموش ہو گئے۔ اور پھر وہ بولے۔ ”آج میں نے حکیم کامل صاحب کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجھ سے مصافحہ کر رہے ہیں، مصافحہ کے بعد انہوں نے کہا۔ ”حقیق صاحب اور سنائیں کیسے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”حکیم صاحب بس اللہ کا کرم ہے، آپ کی یاد مت اتر آ رہی تھی۔“ یہ سن کر وہ مسکرائے اور بولے۔ ”آپ نے یاد کیا اور میں آ گیا۔ دراصل میں

کل آ تا مگر ایک ضروری کام کی وجہ سے نہ آ سکا۔ آپ کو یہ بھی بتانا تھا کہ آپ لوگ فکر نہ کریں، کیونکہ میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور بہت جلد وہ کم بخت اپنے انجام سے دو چار ہو جائے گا، ابھی میں اسے ہلکان کر رہا ہوں تاکہ وہ اندرونی اور ظاہری طور پر کرب و افیت میں مبتلا ہو جائے اور پر والے پر بھروسہ نہ کریں، آپ لوگوں کو اس سے نجات مل جائے گی۔“ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

اذان فجر کی آواز سنائی دی۔ ”اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔“

”ابا حضور! میرا دل بھی گواہی دے رہا ہے کہ اب بہت جلد ان تمام پریشانیوں سے ہمیں چھٹکارا مل

جائے گا اور مجھے بھی یہ کامل یقین ہو چلا ہے کہ مجھ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“ خوشبو بولی۔ ”ابھی لوگ بیٹھیں، میں ناشتہ بنا کر ڈرائے آتی ہوں۔“ تھوڑی دیر میں ناشتہ تیار ہو گیا تو سب نے ناشتہ کیا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر خوشبو کے ابا۔ ”بیگم یہ رقم اٹھا کر سنبھال کر رکھ دو۔“

دن کے دس بجے ہوں گے کہ باہر سے مار اور خبر دی۔ ”صاحب ایک صاحب آئے ہیں اور سے ملنا چاہتے ہیں۔“

ملازم سے تفتیش صاحب بولے۔ ”تم ایسا کر انہیں بیٹھک میں بٹھاؤ، میں ابھی حاضر ہوا۔“ یہ سن کر ملازم چلا گیا۔

چند منٹ بعد تفتیش صاحب بیٹھک میں گئے دیکھ کر چونک پڑے۔ بیٹھک میں ردو کا بیٹھا تھا۔ ردو کا کو دیکھ کر تفتیش صاحب اچھیے پڑ گئے۔ ”حکیم صاحب آپ! اور اتنی صبح، اگر مجھے

ہوتا کہ آپ آج تشریف لائیں گے تو میں گاڑی دیتا۔ آپ کو آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی۔“

”نہیں جناب! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی

آپ فکر نہ کریں، بس پروگرام بنایا اور آ گیا، میں۔ آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ضرور آؤں گا، آتا ہوں میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ اگر کوئی مسئلہ جب میرے ذہن پر سوار ہو جاتا ہے تو جب تک میں اسے حل نہیں کر لیتا، مجھے عجیب عجیب سی بے چینی لگی رہتی ہے۔

آپ لوگ فکر نہ کریں، میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، اوپر والے کی مدد سے یہ مسئلہ بہت جلد ہو جائے گا، یہ مسئلہ کوئی آسان نہیں، بلکہ بہت خطرناک ہے، وہ بہت طاقتور ہے ساتھ ہی ساتھ ضد اور ہٹ دھرم بھی ہے۔

آپ کی بچی خوشبو کی ذات سے دست بردار اسے منظور نہیں۔ اس مسئلے کے لئے وہ بہت دور جاسکتا ہے، وہ کسی بھی خوبی وار سے نہیں چو کے گا۔ اس طرح کے جب کسی ضدی جن یا روح

واسطہ پر جاتا ہے تو اسے آہستہ آہستہ قابو کرنا پڑتا ہے، اسے بہت زیادہ ہلکان کرنا پڑتا ہے، آہستہ آہستہ ہلکان کرنے سے اس کی اندرونی کیفیت کمزور پڑنے لگتی ہے، وہ ناقابل یقین حد تک بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر جذبات میں آکر اوجھے، ٹھکنڈوں پر اتر آتا ہے، وہ بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں پڑ چکا ہو کر اپنا چین سکون کو بیٹھتا ہے اور یہی نہیں بلکہ خواہ مخواہ بے موقع اپنی خفی طاقتوں کو ضائع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پریشانی کے عالم میں اپنے ہمدردوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

اس کے ہمدرد بھی یہی کہتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ اپنی ضد کے آگے اپنے حدود سے تجاوز کر گئے اور اس کے کارن اب پریشانی سے دو چار ہو، اس کے دوسرے ساتھی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کا مقابل کس طاقت کا حامل ہے۔ خیر آپ اپنے ذہن پر بالکل بھی بار نہ ڈالیں، آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ تمام پریشانیوں سے بہت جلد چھٹکارا مل جائے گا۔

اور ہاں! یاد آئے۔ ذرا پہلی کو بلائیں، اس سے چند باتیں کرنی ہیں۔ ”رولو کا بولا۔“

”حکیم صاحب میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں ابھی تک باتوں میں لگا رہا اور آپ سے پانی تک کا نہیں پوچھا۔ آپ تشریف رکھیں، میں ابھی آیا۔“ عتیق صاحب بولے۔

عتیق صاحب جلدی سے اٹھے اور گھر میں چلے گئے اور فوراً ہی وہ واپس آگئے بولے۔ ”میں نے آپ کے متعلق خوشبو کو بتا دیا، وہ آ رہی ہے۔ حکیم صاحب آپ کا یہ احسان ہم گھر والے حاجیات ماننے رہیں گے، آپ کی طرف سے ہمیں نئی زندگی ملے گی، میں تو اس قدر پریشان تھا کہ کیا بتاؤں، کئی مرتبہ تو خیال آیا کہ میں خودکشی کروں، کیونکہ اس ذلت و رسوائی، کرب و دازیت اور بچوں کی تکلیف سے دلیراشتہ ہو چکا تھا، اگر ہمارے مذہب میں خوشی حرام نہ ہوتی تو میں اب تک اپنے آپ پر یہ ظلم کر بیٹھا ہوتا۔“ یہ بولتے بولتے عتیق صاحب کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی تھی۔

”عتیق صاحب! انسان کو ہمت حوصلہ اور جواں مروی سے مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہئے، جو لوگ حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں وہ بہت زیادہ ناقابل یقین اور ناقابل برداشت پریشانیوں میں گھر جاتے ہیں، اوپر والے پر بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرنی چاہئے اور جو لوگ اوپر والے پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ ان کی جان پریشانی سے چھوٹ جائے تو یقیناً وہ ایسا وسیلہ، اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ مصیبت زدہ کی جان مصیبت سے چھوٹ جاتی ہے۔“

”السلام علیکم! خوشبو کی آواز سنائی دی۔“

”جی جی رہو!“ رولو کا بولا۔ خوشبو کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس پر ایک بڑا سا شیشے کا جگ اور دو گلاس موجود تھے۔ پاس آ کر اس نے ٹرے پر رکھی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے گلاس میں شربت ڈالا اور رولو کا کوشش کروایا۔ دوسرا گلاس اس نے اپنے والد کو پکڑا دیا۔

رولو کا بولا۔ ”عتیق صاحب اس کی کیا ضرورت تھی۔ خیر آپ لوگوں کی محبت کے پیش نظر میں شربت پی لیتا ہوں، دیے اکثر میری کوشش ہوتی ہے کہ میں کسی مریض یا ضرورت مند کو تکلیف نہ دوں، یادہ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں، خوشبو بیٹی دراصل میں نے تم سے چند باتیں کرنی تھیں، اس لئے آ گیا۔“

”حکیم صاحب آپ بعد شوق پوچھیں۔ میں بالکل صحیح جواب دوں گی۔“ خوشبو نے کہا۔

”حکیم صاحب آپ برائے مہربانی شربت پئیں، نہیں تو گرم ہو جائے گا۔“ عتیق صاحب بولے۔

عتیق صاحب کے بولنے پر رولو کا نے شربت پی لیا۔ اس کے بعد وہ خوشبو سے مخاطب ہوا۔ ”بیٹی یہ بتاؤ کہ جب سے تم مجھ سے مل کے آئی ہو، اس کے بعد اس جن کا تمہارے ساتھ کیا رویہ رہا ہے، یا پھر اس نے تمہارے سامنے کچھ محسوس کرتے ہوئے کیا کچھ بولا۔ یا تم نے اسے سامنے پا کر کیا اس میں کوئی تبدیلی یا کوئی بے چینی محسوس کی ہے اور اگر تم نے کچھ محسوس کیا تو، کیا

محسوس کیا؟“

”حکیم صاحب! اس کی پریشانیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، وہ جب بھی رات کے وقت کمرے میں آتا ہے تو دیواروں کو گھومنے لگتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ کوئی نادیہ قوت میری نگرانی کرنے لگی ہے، کئی مرتبہ اس کی آنکھوں سے سرخ شعاعیں نکل کر کمرے میں پھیل چکی ہیں، اس کا کہنا ہے کہ ”یہ میرا کاری وار ہے جس کے ذریعہ ان دیکھی قوت جل کر خاستہ ہو جائے گی۔“

اس کا یہ بھی کہتا ہے کہ میں کسی بھی صورت تم سے دست بردار نہیں ہو سکتا چاہے اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے اور اگر کسی نے رکاوٹ ڈالی تو رکاوٹ ڈالنے والے کا میں شتر نشتر کر کے رکھ دوں گا۔“ اس طرح کی اور بھی باتیں وہ کرنے لگا ہے، بہر حال اس کی بے چینی قابل دید ہوتی ہے، میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کا کچھ چین اس سے دور ہو رہا ہے، وہ بہت زیادہ بے چین ہو گیا ہے۔

میں اندرونی طور پر اس کیفیت سے بھی دو چار ہوں کہ کہیں طیش میں آ کر وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا بیٹھے جس سے ہم گھر والوں کو کوئی نہ تلافی نقصان ہو جائے۔“ یہ بول کر خوشبو خاموش ہو گئی۔

”بیٹا! یہ تو تم اپنے دماغ سے نکال دو کہ وہ تم گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچائے گا، میں نے اپنے خفیہ کارندے لگا دیے ہیں جو کہ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھ رہے ہیں اور اس کی تمام حرکتوں کی خبر مجھے دے رہے ہیں۔ میرے کارندے چوبیس گھنٹے اس گھر کی اور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میں چاہتا تو اب تک اسے آہنی شکنجے میں جکڑ چکا ہوتا مگر میں نے یہ نہیں چاہا۔“

میرا پوچھ گرام یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ ہلکان اور پریشان ہو جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ پھر اہوا درندہ غیض و غضب کے عالم میں بہت زیادہ دھڑ بھاگ کرتا ہے، وہ جتنا زیادہ غضبناک ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی

اسلم رانی لکھنے کی تحریر کردہ بہترین کتابیں

- سلطان عماد الدین زنگی
- سلطان نور الدین زنگی
- سلطان صلاح الدین ایوبی
- سلطان محمود غزنوی
- شہاب الدین غوری
- قطب الدین ایبک
- شمس الدین ایتھ
- غیاث الدین بلبن
- جلال الدین خلجی
- علاؤ الدین خلجی
- سلطان محمد تغلق
- فیروز شاہ تغلق
- تیمور لنگ
- قیلائی خان
- اسکندر لودھی
- ابراہیم لودھی
- بہلول لودھی
- ظہیر الدین بابر
- ہمایوں
- شیر شاہ سوری

قیمت فی کتاب - 25 روپے

Ph: 32773302

شیخ الحدادی



اندرونی طاقتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اندرونی اور بیرونی دونوں طرح سے تھک جاتا ہے، اس کی ہمت پست ہو جاتی ہے، وہ مذہب حال ہو جاتا ہے، اس کی ساری طاقتیں اپنا دم ختم کر دیتی ہیں۔ وہ اتنا تھک جاتا ہے کہ اس سے چلنا بھی دو ٹھہر ہو جاتا ہے اور پھر غلبہ پانے والے اسے آسانی سے دبوچ لیتے ہیں۔ یہی حال اس جن کا ہوگا۔ مجھے اس کو مارنے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ خود اپنی موت مر جائے گا یا پھر اسے مار دیا جائے گا۔

ضدی اور ہٹ دھرم لوگ جو دوسروں کو اپنی خواہشات کے پیش نظر آزیت پہنچاتے ہیں وہ بہت جلد اوپر والے کے عتاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے اس گھر کی طرف سے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کر دی ہے، اس گھر کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس گھر کے کسی فرد نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔

کسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ پھرجائے اور بے تکلیف بنا شروع کر دے، ڈرانے دھمکانے کے الفاظ اس کے منہ سے نکلیں، ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بھی بولے کہ میں ابھی اور اسی وقت اپنی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے یا اس میں ملوث لوگوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، میں ابھی دیکھتا ہوں کہ ایسا کرنے والا کون ہے، اور اس نے کس کی مدد حاصل کی ہے۔ ایسی حالت میں تم بالکل بھی خوف نہ کھانا۔ رولوکا نے کہا۔

”ٹھیک ہے حکیم صاحب! میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا کھائیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“ خوشبو بیٹی! ایسی کوئی بات نہیں، یہ تو تمہیں پتہ

ہے کہ میرا ایک ایک پل بہت اہم ہوتا ہے، اس وقت میں یہاں بیٹھا تم لوگوں سے باتیں بھی کر رہا ہوں اور میرا دماغ کہیں اور بھی لگا ہوا ہے۔ وقت کی اہمیت کے پیش نظر میرا ایک جگہ زیادہ دیر تک بیٹھنا کسی وقت ممکن

نہیں ہوتا۔ ڈرا اس مسئلے سے نہت لوں پھر کسی روز تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا ضرور کھاؤں گا۔ تم اور تمام گھر والے بے فکر ہو کر کھائیں پیئیں اور خوش رہیں، کسی قسم کے بھی نقصان کے متعلق نہ سوچیں۔ بلکہ یہ سمجھ لو کہ کسی بھی حالت یعنی غصے یا انتقامی طور پر وہ اس گھر کا ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا۔

اجھا عتیق اب آپ مجھے اجازت دیں، میں چلتا ہوں، مٹی کا کام اور بھی نمٹانے ہیں۔“

یہ سن کر عتیق صاحب بولے۔ ”گھر کا تانگہ ہے میں کوچوان کو بلاتا ہوں، آپ تانگے میں تشریف لے جائیں۔ دیکھئے میری بات سے انکار مت کریں، آپ کی مہربانی ہوگی، میری یہ بات رکھ لیں۔ یہاں سے آپ کا دواخانہ زیادہ دور نہیں، میں بھگتا ہوں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔“

خیر چلئے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ میں تانگہ میں چلا جاتا ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ راستے میں مجھے کسی ضرورت سے روکنا پڑے تو تانگہ واپس کر دوں گا، اور یہ بات کوچوان کو بتا دیجئے گا، جب میں تانگہ رکاوٹوں تو وہ تانگہ روک لے اور مجھے اتار کر واپس آجائے۔“ رولوکا بولا۔

”ٹھیک ہے حکیم صاحب! میں کوچوان کو سمجھا دیتا ہوں، چلیے آپ کی مرضی۔“ عتیق صاحب بولے۔

کوچوان کو عتیق صاحب نے ملازم کے ذریعہ بلوایا اور اسے ساری بات بتلا دی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ رولوکا نے عتیق صاحب سے مصافحہ کیا اور خوشبو کے اوپر اپنا دایاں ہاتھ پھیر کر دعا دی اور کمرے سے نکل کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ عتیق صاحب نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ خوشبو نے بھی اپنا ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا اور تانگہ آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا اور پھر تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کانی دور تک تانگہ چلتا رہا۔ جب تانگہ ایک جنگل کی حدود کے قریب پہنچا تو رولوکا نے کوچوان کو تانگہ روکنے کے لئے۔

کوچوان نے تانگہ روک لیا تو رولوکا تانگہ سے اتر گیا اور بولا۔ ”اب تم واپس چلے جاؤ، مجھے یہاں پر کچھ کام ہے، ورنہ میں دلی تک تمہیں تکلیف دیتا۔“ کوچوان بولا۔ حکیم صاحب! اس ویران اور بیابان میں آپ کو کیا کام پڑ گیا اور پھر آپ یہاں سے کس طرح دلی تک جائیں گے، جبکہ یہاں سے دلی کا فاصلہ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا ہے اور اس وقت یہاں سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزرتی، اگر آپ اپنا کام کر لیں اس کے بعد میں آپ کو دلی تک چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں میاں! تمہاری بڑی مہربانی، اب تم واپس جاؤ، میری فکر نہ کرو، میں واپس چلا جاؤں گا، دیے تو میرے ایک جاننے والے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وقت پر وہ آجائیں اور میں ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں دلی چلا جاؤں، تمہاری بڑی مہربانی یہاں تک چھوڑنے کا۔“ رولوکا بولا۔

بہر حال رولوکا کے حکم کے مطابق کوچوان واپس آ گیا۔

آدھا گھنٹہ میں وہ عتیق صاحب کے سامنے تھا۔ اسے دیکھ کر عتیق صاحب بولے۔ ”میاں! تم نے حکیم صاحب کو کہاں چھوڑا!“ یہ سن کر کوچوان بولا۔ ”جناب وہ تو فلاں جنگل کی حدود شروع ہونے سے پہلے ہی اتر گئے، اور مجھ سے کہا کہ تم واپس چلے جاؤ، میں نے بہت اصرار کیا کہ آپ کو میں چھوڑ دوں گا، انہوں نے کہا کہ مجھے ایک کام پڑ گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے ان کی مرضی اور خوشی، وہ کسی نہ کسی طرح دلی پہنچ جائیں گے۔“ عتیق صاحب نے کہا۔

”عتیق صاحب دراصل رولوکا کی حقیقت کو کچھ کچھ سمجھ چکے تھے کہ حکیم کا دل بہت زیادہ ماورائی قوتوں کے حامل ہیں اور بہت زیادہ نادیدہ قوتیں ان کے قبضے میں ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ دلی میں بیٹھے بیٹھے جن زادہ روٹھا کے گرد آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

آج عتیق صاحب، خوشبو بلکہ سارا گھر بہت خوش تھا۔ عتیق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ”خوشبو

بیٹا! تم میرے لئے تھوڑا سا حلوہ بنا دو، آج کافی دنوں بعد میرا دل حلوہ کھانے کو چاہ رہا ہے۔“ یہ سن کر خوشبو کی والدہ مسکرائے لگیں اور بولیں۔ ”خوشبو! یہ تو ٹھیک نہیں کہ صرف تمہارے اپا ہی حلوہ کھائیں گے، میں تو سمجھتی ہوں کہ سب لوگ ہی حلوہ کھائیں گے، تم سب کے لئے حلوہ بنا لو۔“ یہ سن کر خوشبو مسکرائی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ دونوں بہنیں بھی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ ایک بیٹا تھا جو کچرے کے وقت اسکول چلا جاتا تھا۔ وہ نوے کلاس میں زیر تعلیم تھا۔

عتیق صاحب! بیگم سے بولے۔ ”حکیم کامل بہت پیچھے ہوئے اللہ والے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی اور ہم گھر والوں پر کرم و فضل ہے کہ اس نے ہمارے لئے ایک وسیلہ پیدا کیا اور ہم حکیم صاحب تک جا پہنچے، دلی میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اس جن کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

اس جن کی بے چینیوں بہت بڑھ گئی ہیں۔ وہ بالکل بدحواس ہو کر رہ گیا ہے، اور اس بات کی تصدیق خود خوشبو نے بھی حکیم صاحب سے کی ہے۔“ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غصے میں نہیں کوئی نقصان پہنچا بیٹھے۔“ بیگم بولیں۔

”بیگم یہ نہیں ہو سکتا۔ حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ اس کا دماغ انہوں نے اس طرف سے باندھ دیا ہے۔ اس کے دماغ میں اس طرح کا اور اس طرف کوئی بھی خیال نہیں آ سکتا۔

”اور اگر کسی طرح وہ جان جائے کہ یہ گھر والے میرے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں اور کسی عامل کے پاس گئے تھے تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے۔“ ”بیگم! حکیم صاحب نے ہر طرح کی گمانی دہی ہے کہ آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں اور نہ ذرہ برابر بھی دل میں اندیشہ لائیں۔ اس گھر کا وہ ایک تنکا بھی اب نہیں توڑ سکتا۔“ ”بھئی میں تو حکیم صاحب کی قابلیت کا قائل ہو گیا ہوں۔ خوشبو کا کہنا بھی ہے کہ وہ بھی اب

بالکل مطمئن ہے۔

حکیم صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ بہت جلد وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، ہماری بچی سکھ کا سانس لے، اور پھر سونے پر لٹکی ہوئی ہماری جان بھی اس کے خوف سے آزاد ہو جائے میں تو ہر نماز میں گڑگڑا کر اللہ سے دعا نہیں مانگتی ہوں کہ ہمیں اس موذی سے نجات ملے۔“ عقیق صاحب کی جگمگ بولیں۔

”بیکم اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ تعالیٰ اپنا فضل ضرور کرے گا۔“ عقیق صاحب بولے۔

”حتیٰ دیر میں حلوہ بن کر تیار ہو گیا۔ گرم گرم حلوہ پلیٹ میں نکال کر خوشبو لے آئی تو تمام گھر والوں نے مزے لے لے کر حلوہ کھایا۔ آج گھر والوں کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔

خیر خوشی خوشی کام کاج میں لگ گئے دن کٹ گیا، شام ہوئی اور پھر رات آ گئی، سب نے مل کر رات کا کھانا کھایا اور پھر کھانا کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ والد والدہ ایک کمرے میں جبکہ دونوں بہنیں ایک کمرے میں اور بھائی الگ کمرے میں سوتا تھا اور خوشبو تو چھت پر بنے کمرے میں مونی تھی۔

تمام کام اور گپ شپ کے بعد خوشبو اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جاتے وقت اس کی والدہ بولیں۔ ”خوشبو بیٹا! تم اس بد بخت سے زیادہ بخت مباحش نہیں کرنا، اپنا منہ بند ہی رکھنا تو زیادہ اچھا ہوگا، اور اسے کسی قسم کی بھی ہتھک نہ پڑے کہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اگر وہ کسی بہانے یا پھسل سے معلوم کرنے کی کوشش کرے تو اپنا دل و دماغ قابو میں رکھنا، ورنہ اگر اسے کوئی ہتھک پڑ گئی تو ہماری ذات کو کٹھن نہیں کر دے گا۔ بیٹا! میری بات دھیان میں رکھنا اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتے رہنا۔ اچھا اب جاؤ اپنے کمرے میں۔“

”جی امی! میں آپ کی باتیں دماغ میں رکھوں گی، آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ اور خوشبو

سڑھیاں پڑھتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں جا کر اس نے لائٹ جلائی اور بستر پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر بیٹھی رہی، پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ پر سوچوں کی یلغار تھی۔ دیے بھی وہ اپنے کمرے میں بہت زیادہ اذیت کا شکار رہتی تھی۔ کیونکہ ایک آدمی اکیلے کمرے میں پڑے پڑے حقیقتاً اکتا جاتا ہے اور وقت کٹنے نہیں کٹتا۔

کمرے میں اگر دو افراد ہوں تو بات چیت میں تھوڑا وقت کٹ جاتا ہے، اور پھر وہ باتیں کرتے کرتے نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

آج خوشبو کو کمرہ بہت زیادہ بھیاں لگ رہا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مجبوراً کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف یہی باتیں گردش کر رہی تھیں کہ نہ جانے آج وہ کس طرح کمرے میں آئے، آج نہ جانے اس کے ساتھ کیسے حالات ہوں، وہ کس طرح کی بے کئی باتیں کرے گا، اس کی شکل کس قدر وحشت ناک اور بھیاں لگنے لگی، یا پھر جس ہستی کو وہ کمرے میں محسوس کرتا ہے، کہیں وہ ہستی کوئی ناقابل برداشت قدم نہ اٹھا بیٹھے، کیونکہ روشاک تو اپنے تئیں اس ہستی کو زبردست نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ حکیم صاحب نے اس کی مکمل گارنٹی دی ہے کہ وہ کسی قسم کا بھی نقصان کرنے کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں، اور حکیم صاحب کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

خوشبو مزید اس قسم کے خیالات کے ادھیڑ میں مبتلا تھی کہ اچانک کمرے میں آواز سنائی دی۔ ”خوشبو“ اور اپنا نام سننے ہی خوشبو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، تو دیکھا کہ روشاک سامنے موجود تھا اور اس کی آنکھیں کمرے کی دیواروں کی طرف گردش کر رہی تھیں۔

”آج پھر یہ کم بخت کمرے میں موجود ہے، میں اپنے محسوسات کو غلط فہم قرار دے سکتا۔“

”اوائے چھپکلی کی اولاد، اگر تجھ میں ہمت ہے تو میرے سامنے آ، یہ چھپ چھپا کر کیوں مجھے تک کر رہا

ہے، ہمت والے تو سامنے آ کر مقابلہ کرتے ہیں، تو مکیدڑے بھی بدتر اور کم ہمت ہے، اس لئے تو چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھ مجھے میں تو تیرے سامنے موجود ہوں، اور اگر تجھ میں ہمت ہے تو میرا کوئی نقصان کر کے دیکھ، تجھے میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اوئے آجا میرے سامنے ورنہ میں تیرا ہوش کر دوں گا کہ تیری دنیا والے پناہ بھی نہیں مانگ سکتے، تیرا حشر دیکھ کر وہ عبرت حاصل کریں گے اور آئندہ تیری دنیا کا کوئی بھی ہم جیسے کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کرے گا، چل فوراً میرے سامنے آجا، کیوں دم دبا کر خاموش ہے۔“

وہ اس طرح کے اور بھی جملے بولتا رہا اور خوشبو ایک تک اسے دیکھنے جا رہی تھی۔

”ارے چل! اگر سامنے نہیں آتا تو یہ بتا دے کہ تو میرا کوئی دشمن ہے یا پھر خوشبو کا کوئی ہمدرد ہے یا پھر تیری مرضی مجھے صرف پریشان کرنا ہے یا پھر مجھے خوشبو سے الگ کر کے خود اس پر قبضہ کرنے کی خواہش ہے، کچھ بتا دے، دیکھ اگر تو نے ابھی بھی نہ بتایا تو میں تیری تلاش میں زمین کے اوپر ہی نہیں بلکہ پائناں تک جاؤں گا، میں اکیلا نہیں بلکہ اپنے چند خیر خواہوں کے ہمراہ تجھے زحمت نکالوں گا۔“

پھر اس نے ایک لمبا سانس کھینچا اور بولا۔ ”کم بخت ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا۔ اگر ہمت ہوتی تو میرے مد مقابل ٹھہرتا۔ خیر میں اسے چھوڑ دوں گا تو نہیں، بہر حال میں اب اسے تلاش کر کے اس کا حشر نشر کر کے ہی رہوں گا۔ دیکھنا ہوں کہ اب یہ کہاں تک بھاگتا ہے۔“

اس کے بعد وہ خوشبو کی طرف پلٹا، خوشبو ایک ٹک اسے ہی دیکھنے جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”خوشبو! تم بھی میری جگہ سے خاصی پریشان ہو گئی ہو، تمہیں پریشان کرنے کی میری مرضی قطعی نہیں مگر نہ جانے یہ کیوں کم بخت ہے جو مجھے پریشان کرنے لگا ہے، خیر ان باتوں کو چھوڑ دو، میں اسے دیکھ لوں گا، کاش! میرے بس میں ہوتا کہ میں چند دن اسے دور دراز کر اس چرے کو تلاش کر سکتا۔

میں یہ بات اپنے قبیلے میں بھی نہیں کہہ سکتا،

میرے والد صاحب تو زبردست قوت کے مالک ہیں، نادیہ تو میں تو ان کے سامنے دست بدست سر جھکانے کھڑی رہتی ہیں، ان کی خفیہ طاقت اتنی وسیع ہے کہ ایک نظر میں سامنے چھپے ہوئے کی اصلیت جان لیتے ہیں۔

اگر میں ان سے مدد طلب کروں گا تو پھر وہ اصلیت جاننے کی کوشش کریں گے کہ کوئی میرے پیچھے کیوں پڑا ہے اور مجھے ہراساں کیوں کر رہا ہے اور پھر تم سے ملنے کا سارا معاملہ سامنے آ جائے گا اور پھر میں والد کی نظروں میں قصور وار ٹھہر جاؤں گا کیونکہ والد صاحب اصول کے بہت کچے ہیں۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کسی بھی آدم زاد کو کسی جن سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے کیونکہ آدم زاد نادیہ تو توں کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے مگر جنات تو یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ آدم زاد کو دیکھ سکیں بلکہ جنات نفی چیزوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔

اور ہمارے قبیلے کا کوئی جن کسی آدم زاد کو نقصان پہنچاتا ہے یا پھر کسی طرح تک کرتا ہے، اور اگر والد صاحب کو پتہ لگ جائے تو وہ جن بغیر سزا کے فوج نہیں سکھا، اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے اور خاص طور پر وہ جن اور بھی سخت سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے جو اپنے دل اور نفسانی خواہشات کے چکر میں پڑ کر کسی آدم زادی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ ایسے جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔“

یہ باتیں سن کر خوشبو بولی۔ ”اور اگر آپ کے متعلق آپ کے والد صاحب کو پتہ لگ جائے کہ آپ میرے عشق میں گرفتار ہو کر مرنے والی مانی کرتے ہیں تو۔“ ”خوشبو یہی تو سوچ کر میں اکثر لرز جاتا ہوں، لیکن کیا کروں دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہوں، اور میری حتی الامکان کوشش رہتی ہے اور رہے گی کہ کسی بھی صورت میرے اور تمہارے معاملات کے بارے میں والد صاحب کو پتہ نہ چلے۔ میں نے تو اس بات کو اپنے دوستوں تک سے چھپا رکھا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وقت کوئی دوست باعث حد میرے راز کو افشاں



کردے اور میں بے موت مارا جاؤں۔“

”چلے جان لیتی ہوں کہ آپ کی کوشش ہے کہ اس معاملے کی خبر آپ کے قبیلے کے کسی جن یا پھر آپ کے والد صاحب کو پتہ نہ چلے مگر کسی بھی وجہ یا کسی بھی طریقے سے اگر پتہ چل جاتا ہے تو آپ اس صورت میں کیا قدم اٹھائیں گے اور پھر آپ کے ساتھ ساتھ کہیں میں نہ درمیان میں آ جاؤں اور میری ذات کا نقصان ہو جائے اور اگر ایسا وقت آیا تو میں اپنی صفائی میں اپنے بچاؤ کی تدبیر کر سکتی ہوں۔“

آپ جن زادہ ہیں اور میں کمزور آدم زادی، بھلا طاقت میں، میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

”خوشبو بات تو تمہاری بالکل صحیح ہے، بس اس کے آگے میری سوچ محدود ہو کر رہ جاتی ہے، خیر ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ تمہاری ذات کو کوئی نقصان پہنچے کیونکہ اس صورت میں ہمارے قبیلہ والے اور خاص طور پر والد صاحب آدم زاد کو موصوم اور بے قصور گردانتے ہیں اور اگر کوئی آدم زاد عامل خواہ خواہ جب کسی جن کو نقصان پہنچاتا ہے تو اس کی خیر نہیں ہوتی۔“

خوشبو بولی! ”میری تو آپ سے التجا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آئے اور آپ کا مجھ سے ملنے کا راز فاش ہو جائے تو براے میرا ہی مجھے اور میرے گھر والوں کو دور ہی رکھئے گا کیونکہ ایسی صورت میں تو ہم تمام گھر والے دل کا دورہ پڑنے سے ختم ہو جائیں گے۔ ایک تو ویسے ہی ہمارے گھر والے ہر وقت آپ کے غضب سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ سبہ ہوئے رہتے ہیں۔“

”خوشبو ایسی کوئی بات نہیں، بھلا تمہارے گھر والے مجھ سے کیوں خوفزدہ رہتے ہیں، ان سے بول دینا اور میں تو پہلے بھی بول چکا ہوں کہ وہ مجھ سے خائف نہ رہا کریں۔ ویسے بھی میں تم لوگوں کی مانی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہوں۔“

ارے میں تم پر قربان ہو سکتا ہوں مگر تمہاری ذات کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا اور اگر وقت آیا تو دیکھ لیتا یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔“

روشاک بولا۔

”اگر ایسی خطرناک بات ہے آپ کے قبیلے کی تو آپ اپنے دل پر پھر رکھ کر مجھے بھول جائیں، کیونکہ میں نہیں چاہتی اور نہ ہی چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ کو نقصان اٹھانا پڑے، میں تو یہ بھی مانتی ہوں کہ آپ کے قبیلے میں جن زاد ہوں مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوں گی اور ویسے بھی قبیلے کے سردار کے بیٹے کے لئے تو ایک سے ایک لگتی ہے، میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر شانت کر لیں۔“

میں بھی آپ کو دل و جان سے جانتی ہوں مگر جہاں جانی نقصان کا احتمال ہو دہاں سوچ بوجھ سے کام لینا چاہئے، اور یہ حقیقت ہے کہ جان سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں۔ ایک کا جانی نقصان اور دوسرے کو زندگی بھر کے لئے کرب و اذیت، کیونکہ زندہ رہنے والا زندہ درگور ہو کر رہ جاتا ہے اپنے محبوب کی جدائی میں۔ اب بھی وقت ہے آپ سنجیدگی سے غور کریں۔“

کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ میں آپ کی جدائی میں زندگی بھر تڑپتی رہوں، اب تو میں بھی آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔“ خوشبو نے اوپری دل سے کہا۔ جبکہ خوشبو تو چاہتی تھی کل چھوڑ آج ہی اس سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ وہ تو مجبوری کے تحت اس کے آگے سرخم کر دیتی تھی تاکہ اس کے گھر والے اس کے غضب کا نشانہ نہ بنیں۔

”خوشبو! میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میرے قبیلہ میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت جن زادی موجود ہیں مگر تمہاری ذات کے آگے وہ سب بچے ہیں اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو میں نہ چاہتے ہوئے اپنے والد اور قبیلہ کے رسم و رواج کے تحت کسی جن زاوی کو زندگی کا ساتھی بنالوں مگر اصل چاہت کی حقدار صرف تم رہو گی۔ میرا وجود اس کے پاس رہے گا اور دل و دماغ تمہارے پاس۔“

”خیر چلے یہ تو بوقت بتائے گا کہ کس کی قسمت

میں کیا لکھا ہے۔ قبل از وقت یہ سوچ سوچ کر خود کو ہلکان اور پریشان کرنا ٹھیک نہیں۔“ خوشبو نے ہر ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کیا۔

خیر چھوڑو ان باتوں کو، آج کا وقت تو باتوں باتوں میں ہی کٹ گیا، تم اپنے دل پر کوئی باتیں محسوس کرنا بس تم کھاؤ پیو اور خوش رہو۔“ روشاک بولا۔

خوشبو بولی۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج آپ نہ جائیں اور صبح تک یہیں رہیں۔“ اور یہ بول کر خوشبو مسکرائے تھی۔

خوشبو کی یہ بات سن کر روشاک جھٹک بولا۔

”خیر، خوشبو، یہی تو نہیں ہو سکتا، اذان فجر سے قبل والد صاحب میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیتے ہیں اور اگر میں موجود نہیں ہوا تو۔۔۔۔۔“ اور پھر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور جلدی سے کمرے سے غائب ہو گیا۔

صبح کے وقت حسب معمول خوشبو نیند سے جاگ گئی اور پھر سے نیچے آ گئی۔ منہ ہاتھ دھویا غسل کیا اور ناشتہ کے بعد کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

دن کے گیارہ بجے رولو کا ان کے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔ ملازم اندر آیا اور عتیق صاحب کو بتایا کہ ”جناب ایک صاحب تشریف لائے ہیں اور وہ اپنا نام حکیم کامل بتا رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

حکیم کامل کا نام سنتے ہی عتیق صاحب جھٹک کر سیٹھ سے اٹھے اور فوراً باہر آئے اور رولو کا کوڈ نکھتے ہی مصافحہ کے لئے ہاتھ جا بڑھایا۔ مصافحہ کے بعد عتیق صاحب بولے۔ ”حکیم صاحب آپ نے بتایا ہوتا تو میں تا نگہ بھیج دیتا، اب آئندہ آپ نے جب بھی آنا ہو، تو آپ دن ضرور بتائیے گا تاکہ میں اس دن آپ کو لانے کے لئے تا نگہ بھیج دوں۔ آپ ہمارے لئے اتنی تکلیف اٹھا رہے ہیں، ہم تو کسی قابل نہیں اس کا اجر اللہ تعالیٰ یقیناً آپ کو دے گا۔ آپ اندر تشریف لے آئیں۔“ اتنی دیر میں خوشبو نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

عتیق صاحب کے ساتھ رولو کا ڈرائنگ روم میں آیا اور صوفے پر بیٹھ گیا اور خوشبو سے مخاطب ہوا۔ خوشبو بیٹی! خیر بت تو ہے ناں۔“

”جی حکیم صاحب بالکل خیریت ہے۔“ خوشبو رولو کا کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ عتیق صاحب رولو کا اور خوشبو کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر گھر کے اندر چلے گئے۔

رولو کا بولا۔ ”بیٹی گھبرا نا نہیں، میں خاص کر یوں آیا کہ بتا دوں، روشاک دو دن نہیں آئے گا، میں اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دوں گا، وہ رکاوٹ ایسی ہوگی کہ کسی صورت بھی اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتا، نہ ہی وہ دن میں آئے اور نہ رات میں اور تیسرے دن رات میں جب وہ آئے گا تو بہت نڈھال ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ غصے میں پھرا ہوا ہو، تم اسے دیکھ کر قطعی خوف نہیں کھانا اور نہ ہی اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی بات لانا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ اب اس گھر والوں کی ذات کو ذرہ برابر بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ان دونوں راتوں میں تم بالکل بے فکر ہو کر آرام سکون کے ساتھ سونا۔“

”جی حکیم صاحب! بہت اچھی بات ہے، میں آپ کی باتوں پر بھرپور عمل کر دوں گی۔ کسی کسی وقت تو میرے دل میں یہ بھی آتا ہے کہ چاہے میری ذات کا نقصان ہو جائے مگر میرے گھر والے بخیر و عافیت رہیں۔ کاش! میں شروع میں ای کی بات مان کر اس کے ساتھ رعایت نہ کرتی، یعنی جب وہ ملی کے بچے کی شکل میں آیا تھا۔ ای کی بات نہ مان کر ہی میں اذیت ناک کرب سے دوچار ہوں۔“ خوشبو بولی۔

”خیر جو ہوا تھا وہ تو ہو گیا، اس کے پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب بس کھاؤ پیو اور خوش رہو، اس کے سامنے اس طرح رہنا کہ جیسے تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ بالکل انجان، ہو سکتا ہے کسی بھی بہانے سے تم سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔“

دو دن جب اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی

ہوگی تو ناقابل یقین حد تک طیش میں آجائے گا اور پھر ہر موضوع پر سوچے گا کہ یہ اچانک میرے ساتھ ایسا کون کر رہا ہے۔

مجھے اس کی ساری حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ بہر حال اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ بہت زیادہ جسم کی پر اثر آئے کیونکہ زخمی سانپ بہت زیادہ ترہتا ہے، اس کی کسی بھی حرکت پر بے خوف رہتا۔

اسے میں عتیق صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس پر چائے کے لئے دو کپ موجود تھے۔ ٹرے لا کر انہوں نے سامنے بڑی میز پر رکھ دی۔ پھر سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔ حکیم صاحب آج آپ نے تکلیف کیسے کی، عتیق صاحب کی بات سن کر رولو کا بولا۔ ”وراصل میں نے خوشبو بنی سے چند باتیں کرنی تھی وہ میں نے کر لی ہیں۔ ٹھیک ہے خوشبو بنی، اب تم جا کر آرام کرو۔ چند منٹ میں میں چلا جاؤں گا۔ اور جو باتیں میں نے کی ہیں، انہیں دماغ میں رکھنا۔“

رولو کا کی بات سن کر خوشبو نے خدا حافظ کہا اور گھر کے اندر چلی گئی۔

عتیق صاحب کے اسرار پر رولو کا نے چائے پی اور مصافحہ کر کے ڈرائنگ روم سے نکل گیا تو دیکھا کہ تانگہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ عتیق صاحب نے تانگے والے کو پہلے ہی بلوایا تھا۔

”حکیم صاحب! آپ پیدل نہیں جائیں گے، آج آپ تانگے میں اپنے مطب تک جائیں گے۔ یہ میری خواہش اور التجا ہے۔“

یہ سن کر رولو کا بولا۔ ”ٹھیک ہے عتیق صاحب، آج میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور میں تانگے میں ہی چلا جاؤں گا۔“

عتیق صاحب کو چوان سے بولے۔ ”رمضانی، حکیم صاحب کو بہت آرام سکون سے لے جانا، کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ملے اور تانگہ زیادہ تیز نہ چلانا جس

سے حکیم صاحب کو تکلیف ہو آرام آرام سے دلی مطلب تک پہنچا دینا۔“

”ٹھیک ہے سرکار۔“ کو چوان بولا۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ اور یہ بول کر اس نے گھوڑے کو اشارہ دیا تو گھوڑا آگے ہی آگے بڑھنا لگا۔

ڈھائی گھنٹے میں کو چوان نے رولو کا کو دلی مطلب کے پاس اتار دیا اور واپس آ کر عتیق صاحب کو بتا دیا کہ ”حکیم صاحب کو آرام سکون کے ساتھ میں نے پہنچا دیا۔“

بہر حال دن گزر گیا۔ رات آئی اور خوشبو اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بے فکر ہو کر سو گئی، اسے تو پتہ تھا کہ آج کسی صورت بھی رولو کا نہیں آئے گا۔ سکون سے بستر پر لیٹ گئی اور رولو کا کی صلاحیت اور طاقت کا دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ آج وہ ذہنی طور پر بہت ہی پرسکون تھی اور پھر ایک طویل عرصہ کے بعد بہت جلد نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

ادھر رات کے ساڑھے گیارہ بجے جب وہ جن زادہ رولو کا خوشبو کے پاس آنے کے لئے اپنے قبیلہ سے نکلا اور جب خوشبو کے گھر سے تھوڑی دوری پر پہنچا تو وہ اچانک ایک شخص کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ شخص کی دیوار بہت گرم تھی مگر آنکھ سے پوچھل، اسے چھونے سے لگتا تھا کہ یہ بہت گرم ہے مگر کوئی اندھ کبھی دیوار پر نہ کھنکھاتا۔

وہ کئی لمحے سوچتا رہا اور پھر وہ اوپر آسمان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جتنا اوپر گیا، وہ دیوار اپنی جگہ برقرار تھی۔ پھر وہ اوپر کو بڑھتے بڑھتے آسمان کی وسعت میں پہنچ گیا مگر وہ دیوار بدستور اپنی جگہ قائم تھی۔

پھر آنا فانا وہ اوپر سے زمین کی طرف بڑی تیزی سے آیا اور زمین کے اندر گھس چلا گیا مگر یہ کیا زمین کے اندر بھی وہ دیوار موجود تھی۔ وہ پاتال میں گھس چلا گیا۔ مگر پاتال میں بھی وہ گرم دیوار اپنی جگہ قائم تھی۔

اب تو اس کی پریشانی، گھبراہٹ دیدنی تھی۔ وہ پاتال سے اوپر کو اٹھنے اٹھنے زمین سے باہر نکل آیا اور ایک جگہ ٹھہر کر، اس دیوار نما رکاوٹ کے متعلق غور کرنا

شروع کر دیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کوئی ایسی ہستی اس کے سامنے آگئی ہے جو کہ پھر پور طریقے سے اس کی نگرانی کر رہی ہے اور اس ہستی نے اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے تاکہ میں خوشبو تک نہ پہنچ سکوں، مگر وہ ہستی ہے کون؟

اور اسے میری ذات سے کیا لیتا دینا اور چپاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری کسی ایسی ہستی سے کوئی نہ بھڑکے گی نہیں ہوگی۔

پھر وہ سے کون جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔ خوشبو یا پھر اس کے گھروالے کسی کے پاس گئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے کسی سے میرے متعلق کوئی بات کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ ”چھپ کر وار کرنا ہے، اگر ہمت ہے تو سامنے آ کر دیکھ۔ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔“ پھر اس نے سوچا۔ ”میں اس کے متعلق پتا کیسے کروں، میری تمام کوششیں کمزور ہو گئی ہیں۔ پھر بھی وہ زبردست طریقے سے وار پر وار کرنے لگا، جس سے اس کے راستے میں حائل رکاوٹ دور ہو جائے اور وہ خوشبو تک پہنچ جائے۔ مگر وہ کسی صورت بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر پھر پھرے ہوئے زخمی ناگ کی مانند اپنے قبیلہ کی طرف پلٹ گیا۔ کیونکہ اس کا ایک مخصوص ٹائم ہوتا تھا اس ٹائم تک اسے ہر حال میں اپنے کمرے میں موجود ہونا ہوتا تھا۔

اپنے کمرے میں بیچ و تاب کھانے لگا، اس کی نیند اور آرام و سکون غارت ہو چکا تھا۔ اس نش و نب میں اس کا وقت گزرنے لگا اور پھر ایک مقررہ وقت پر اس کے والد نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے اس نے آواز دی۔ ”جی ابا حضور! میں جاگ گیا ہوں۔“

صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا۔ وہ سوچوں کے پہاڑ تلے و بار ہا، اس نے لاکھ جتن کر لئے مگر اس راز کو جاننے سے قاصر رہا کہ اسے کون اور کیوں پریشان کر رہا ہے؟

اور پھر ابھی اوپر بن میں دن کے ڈھائی بج

گئے اب اس کی بے چینی مردج پر پہنچ گئی تھی، اس نے گھر والوں اور قبیلہ والوں سے نفرتیں بجا کر خوشبو کے گھر کی طرف اڑاں بھری مگر اس جگہ پہنچ کر اسے پھر مایوسی ہوئی کیونکہ رات کی طرح اس وقت بھی وہ رکاوٹ والی گرم اندھ کبھی دیوار موجود تھی۔ جب اسے مکمل یقین ہو گیا کہ وہ رکاوٹ تو بدستور اپنی جگہ قائم ہے تو مجبور اپنے قبیلہ میں واپس آ گیا۔

رات آئی تو اس کی بے چینی مزید دو چند ہو گئی اور پھر رات کے ساڑھے گیارہ بجے اپنے کمرے سے نکلا خوشبو کے گھر جانے کے لئے اور پھر اس جگہ آ کر اسے مایوس ہونا پڑا کیونکہ اس کے راستے میں وہی گرم اندھ کبھی دیوار موجود تھی۔ آج تو اس نے اپنی تمام خفی قوتیں آزمائیں مگر وہ دیوار اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

طرح طرح کے بے شمار وار کر کے جب وہ تھک گیا تھا پھر طوعاً و قراً واپس پلٹ گیا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ جیسے جب جل پھلی ہوئی ہے۔ یا پھر جیسے کسی زندہ وجود کو آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں موجود رہتا رہتا مگر اس کے دماغ میں کوئی بھی حل نہیں آیا، وہ ہر صورت یہ نہیں جان سکا کہ وہ کون ہے جو اس کے راستے میں سنگلاخ پہاڑ کی طرح کھڑا ہو کر رکاوٹ ڈال رہا ہے۔

ادھر خوشبو اپنی جگہ بہت مطمئن اور خوش تھی کہ حکیم کامل نے اسے اپنے مضبوط قلعے میں جگہ نشاء شروع کر دیا ہے اور اس کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی ہے ورنہ ہر صورت میں وہ آتا ضرور، اس سے پہلے ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ متواتر دو دن اور دو رات نہ آیا ہو، آندھی ہو یا طوفان وہ آتا ضرور تھا۔

آج تیسرا دن تھا اور خوشبو کو پتہ تھا کہ آج وہ ضرور آئے گا کیونکہ رولو کا نے خوشبو کو بتا دیا تھا کہ میں صرف دو دن کے لئے اس کے راستے میں رکاوٹ حائل کروں گا اور تیسری رات میں وہ ضرور آئے گا کیونکہ



تیسری رات میں وہ رکاوٹ میں ہٹاؤں گا۔  
اور پھر تیسری رات آگئی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر  
سو چھا گیا۔ اس کے سارے گھر والے اپنے اپنے  
کمروں میں آرام کرنے لگے۔ رات کے ساڑھے  
گیارہ بجے وہ طوفان کی طرح باہر نکلا اور خوشبو کے گھر  
کی طرف کارخ کیا۔

مگر یہ کیا! آج تو اس کے راستے میں وہ  
رکاوٹ والی دیوار غائب تھی۔ اس رکاوٹ کو نہ پا کر اس  
کی پانچیں کھل گئیں۔ اور پھر وہ تیزی کے ساتھ خوشبو  
کے گھر کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ خوشبو حسب معمول  
اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور  
اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھا ہوا تھا۔ اس  
انداز سے کہ وہ بہت زیادہ سوچوں میں غرق ہے۔  
کمرے میں آ کر چند ساعت وہ بالکل خاموش  
کھڑا رہا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ آج کمرے میں بھی  
کوئی اندھکھی ہستی موجود نہیں اور خوشبو بھی بے حس و  
حرکت پڑی ہوئی تو اس نے آواز دی۔ ”خوشبو۔“

خوشبو کی ساعت سے جیسے ہی اس کی آواز مگرانی  
تو خوشبو نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں، اور اسے  
یک دم دیکھتے ہوئے فوراً بستر سے اٹھی اور تیزی سے  
نیچے اتر کر اس کے سینے سے لگ گئی اور بہت ہی زیادہ  
لگاؤ سے بولی۔ ”آپ دو دن کہاں رہے؟ انتظار  
کرتے کرتے میری آنکھیں جیسے پتھر کی ہیں۔ آپ  
نے مجھے تڑپا ہوا چھوڑ دیا۔“

اس نے خوشبو کو اپنی ہانہوں میں سمجھنے لیا۔ اس کی  
حالت اپنی جگہ بہت غیر تھی۔ وہ بالکل بدحواس ہو رہا تھا،  
اس کی حالت ایسی تھی کہ جیسے کوئی پرندہ پنجرے سے  
آزاد ہو گیا ہو، اس نے اپنے ہونٹ خوشبو کی گردن پر  
نکادے اور پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ خوشبو کی  
گردن سے ہوتے ہوئے اوپر کو بڑھنے لگے۔ خوشبو  
ایسی حالت میں تھی کہ جیسے ساکت ہو گئی ہو۔

اس کے ہونٹ متواتر گردن سے چرے اور پھر  
گال سے ہوتے ہوئے خوشبو کے ہونٹوں میں پیوست

ہو گئے، پھر خوشبو کے پورے وجود میں ایک سرد لہر دوڑ  
گئی، اس کے پورے جسم میں اچانک ایک کچکی سی طاری  
ہوئی جسے روشاک نے بخوبی اور واضح طور پر محسوس  
کرتے ہوئے خوشبو کے گرد اپنی ہانہوں کا گھیرا کچھ  
زیادہ ہی تنگ کر دیا۔

آج پہلی مرتبہ اس کی طاقت کا خوشبو کو احساس  
ہوا، خوشبو اس کی ہانہوں میں کسمانے لگی۔ مگر باوجود  
کوشش و کسمانے کے اس کی ہانہوں سے نکلتا خوشبو  
کے بس سے باہر تھا۔ پھر اسی حالت میں خوشبو کے گرد  
اپنی ہانہوں کا گھیرا تنگ کئے بستر کی جانب وہ بڑھنے لگا،  
خوشبو کو اس نے اوپر اٹھایا اور بستر پر آرام سے لٹا دیا۔  
خوشبو کی آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے  
خوشبو کے پورے وجود اور دل و باغ پر بحر بھونک دیا گیا  
ہو۔ خوشبو کی حالت بالکل غماض تھی، یوں محسوس ہوتا تھا  
کہ جیسے اس کے جسم سے جان نکال لی گئی ہو۔ اس کے  
پورے جسم پر سکتہ طاری تھا۔ مگر سانس لینے کی وجہ سے  
خوشبو کا سینہ اوپر نیچے ہوتا محسوس ہوتا تھا۔

خوشبو کو وہ یک دم تنگی باندھے چند گھڑی دیکھتا  
رہا پھر اچانک وہ خوشبو کے نرم و ملائم نازک گالوں پر  
اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی  
اندرونی بیجانی کیفیت بڑھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر  
ایک معنی فز سکر اٹھ پھیل گئی۔ پھر وہ اپنی گردن گھما کر  
اپنے دائیں بائیں اور سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔ اس کا  
انداز بتا رہا تھا کہ شاید وہ بنور کی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔

اس کی آنکھوں میں ایک انجانائی چمک پیدا  
ہوئی، ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں  
پھر اس کی آنکھوں سے سرخ شعاعوں کی دو لکیریں  
نکلیں اور خوشبو کے دماغ میں گھسٹی چلی گئی۔ اس کے  
بعد ان سرخ شعاعوں کا وجود ختم ہو گیا تو وہ سکراتے  
ہوئے جسم خوشبو کے پورے وجود پر اوندھے منہ جیسے  
ڈھسے گیا۔

اچانک کمرے میں ایک گرجدار آواز گونجی۔  
(جاری ہے)



## بھیا نک سزا

شائستہ سحر۔ راولپنڈی

گائٹوں کے لوگ اسے آسیبی بیماری کہتے تھے، ڈاکٹر یا حکیم کے  
پاس اس بیماری کا علاج نہ تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ اس  
بیماری سے صرف اور صرف معصوم بچے ہی ہلاک ہوتے تھے،  
بڑے بالکل محفوظ تھے۔

حرص و طمع کے متلاشی لوگ اکثر عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ ایک سبق آموز کہانی

نور پور چھوٹا سا قصبہ تھا جو ایک خوبصورت پہاڑی  
علاقے میں آباد تھا اس قصبے میں اکثر سیاح خوبصورت  
مقامات سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے تھے۔ مگر  
کچھ عرصے سے اس قصبے کی خوبصورتی کو جیسے کسی کی  
نظر کھا گئی تھی۔ کیونکہ کچھ ہی عرصے سے وہاں کسٹ پچوں کی  
امولت میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تھا یا ایک پراسرار قسم  
کی کوئی بیماری تھی جس نے کئی تندرست بچوں کو اپنی پلیٹ  
میں لے لیا تھا۔ اتنے خاصے تندرست بچے رات کو موتے  
اور صبح اپنے بستر پر مردہ حالت میں پائے جاتے تھے۔

گاؤں کے اکثر لوگ اس بیماری کو آسیب کا نام

وہ خوف زدہ نگاہوں سے اس وجود کو دیکھ  
رہا تھا جو کسی جوت کی طرح اسکے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ یہ  
..... یہ سب کیا ہے؟ چھوڑ دیجئے۔ وہ مذہبی آواز میں چیخا  
اور خود کو اس وجود کی گرفت سے چھڑوانے کی ناکام کوشش  
کرتے ہوئے دروازے کی طرف اس نے بڑھنا چاہا  
مگر وہ ایسا نہ کر پایا اور چکر کر زمین پر آگرا۔ وہ تنہا سا  
وجود اس کے اوپر سوار ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی من  
وزن اس کے اوپر آن گرا ہو۔ اس نے مدد کے لئے پکارنا  
چاہا مگر آواز جیسے خلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ یکدم اسے  
باہر سے کئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

دیتے تھے، جو رات کے کسی پہر معصوم بچوں کی جان لے لیتا تھا۔

علاوے کی انتظامیہ سخت دباؤ میں تھی کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس اس بیماری کا علاج نہ تھا حیرت کی یہ بات تھی اس بیماری سے صرف بچے ہی جاں بحق ہوتے تھے۔ بالغ لوگ اس بیماری سے بالکل محفوظ تھے۔

ریاست جو اس قصبہ کا رہا تھا علاقے میں نہایت معزز شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس نے نئی سال مختلف عملیات کیے تھے صرف کئے تھے۔ قصبہ والوں کی آخری ڈھارس وہی تھا لوگ ہر روز اس کا اپنا سمجھا کر کوئی نا کوئی تعویذ اس سے لے کر چلے جاتے تھے مگر موت جب کسی انسان کا تعاقب کرے تو اس سے پھر بچھا چڑوانا ناممکن بات ہے۔ حاجی غلام رسول کا گھرانہ قصبہ میں واحد گھرانہ تھا جو اس بیماری سے محفوظ تھا مگر وہ سخت پریشانی میں مبتلا تھے کیونکہ ان کا بھی باج چھ سال کا بیٹا بیمار تھا ان کو ہر دقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ خوش بیماری ان کے تخت چکر لگی نہ لگی لے لے لے وہ دقت خالق کے بغیر بیمار کو شہر کے ایک مشہور عامل کے پاس لے گئے۔

عامل نے بیمار کے گلے میں تعویذ ڈالا اور کلام الہی پڑھ کر اس پر دم کر دیا۔ غلام رسول کو عامل نے پوری تسلی دی کہ ”اب انشاء اللہ وہ آفتوں سے محفوظ رہے گا۔“

غلام رسول کو خدا کی ذات پر بڑا ابرور تھا سو وہ بیمار کو لے کر واپس قصبہ میں آگئے غلام رسول کی قصبہ میں بیمار کے ساتھ واپسی پر ہر شخص حیرت زدہ تھا۔ قصبہ کے لوگ ان دونوں کو ایسے گھور رہے تھے جیسے وہ باپ بیٹا کوئی عجیب ہوں۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں غلام رسول کے لئے مسخر تھا۔ جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ قصبہ میں مہلک بیماری نے ڈیرا ڈالا ہوا ہے اپنے بچے کو موت کے من میں لے آئے تھے کچھ لوگ غلام رسول کی بدولتی پر خسوس کر رہے تھے غلام رسول ان کی پرواہ کئے بغیر بیٹے کا ہاتھ تھامے بڑے سناٹا سے اپنے گھر کے دروازے کے قریب پہنچے۔

ریاست اتنے میں نمودار ہوا۔ آپ کدھر عجب تھے۔ وہ غلام رسول سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

غلام رسول مسکرا کر بولے۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ قصبہ میں کتنی خطرناک بیماری کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ ایس اسی بیماری سے محفوظ رکھنے کے لئے بیمار کو شہر دم کروانے لے گیا تھا وہ بہت مشہور عامل ہیں۔“

”اچھا کیا مگر ہر عامل ٹھیک نہیں ہوتا کچھ فراڈی ہوتے ہیں، آپ کو چاہئے تھا بیمار کو میرے پاس لے آتے۔“ ریاست بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

غلام رسول صاف گوئی سے بولے۔ ”دل تو میرا یہی کر رہا تھا مگر اس کی ماں کو کون سمجھائے عورتوں کے دماغ میں جب ایک بات گھس جائے تو اس کو نکالنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کسی جاننے والے نے اسے شہر والے اس عامل کا بیٹہ بتایا تو بس بڑی مٹی میرے پیچھے بھجوا دیجئے اسی عامل کے پاس جانا پڑا۔“

ریاست مسکرا کر بولا۔ ”چلیں پھر اگر میری خدمت کی ضرورت پڑی تو ضرور یاد کر لیجئے گا میں ایک کام سے نکلتا تھا، آپ چلیں اپنے گھر پھر ملاقات ہوگی۔“

ریاست آگے بڑھ گیا تو غلام رسول بچے کو لے کر گھر میں داخل ہو گئے۔

کئی روز بیت گئے قصبہ میں کوئی اندوہناک واقعہ رونما نہ ہوا، سب لوگوں کی نظر اس غلام رسول کے گھر پر تھیں کیونکہ غلام رسول کا گھر موت کے تختے سے محفوظ تھا مگر غلام رسول کو پورا یقین تھا کہ ان کے بیٹے کو یہ موذی بیماری ہرگز لاحق نہیں ہو سکتی۔

لیکن کچھ حادثات ایسے ہوتے ہیں جن کو روکنا انسان کی دسترس میں نہیں ہوتا کیونکہ وہ مقدر میں لکھ دیے جاتے ہیں، غلام رسول بھی سوچ نہیں سکتے تھے کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہونے والا تھا۔

ایک شام بیمار سو دالینے کے لئے گھر سے نکلا اور پھر واپس نہ آیا۔ اس کو قصبہ کے پپے جے میں تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملا۔ غلام رسول کی بیوی کا رورہ کر برا حال تھا، کوئی بد بخت اس کے بچے کو خواہ کر کے لے گیا تھا مگر وہ کون تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

غلام رسول نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ

بھیا تک سزا۔ شائستہ سحر

تھانے میں درج کروائی۔ مگر پولیس بھی مسلسل کوشش کے باوجود بیمار کو ڈھونڈ نہ پائی۔

بیمار کو لاپتہ ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ غلام رسول کا گھر کسی ماتم کدہ سے کم نہیں رہا تھا بیٹے کی اجانک گمشدگی نے دونوں میاں بیوی کو بے حال کر دیا تھا۔

شاہ زیب نائی ایک دس سالہ بچہ جو کہ اس خوف ناک غریبیت کی وجہ سے اپنا چھوٹا بھائی کھو چکا تھا ڈراؤ اور سہا ہوا اپنی ماں کے ہمراہ غلام رسول کے گھر میں داخل ہوا۔

غلام رسول کی بیوی بستر پر کسی لعش کی طرح پڑی اپنے بیٹے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی غلام رسول پریشان حال صدمے سے چور بیٹھے تھے اور اپنی منماک آنکھوں سے دروازے کو گھورے جا رہے تھے۔ ان کی بے چینی نگاہوں کو اب بھی اپنے بیٹے بیمار کا انتظار تھا۔

”شیدہ..... شیدہ“ غلام رسول کی بیوی کو بکا رہتے ہوئے کمرے میں وہ داخل ہوئی مگر غلام رسول کو کچھ کٹھنک گئی۔ غلام رسول بے جاں لہجے میں بولے ”کیا بات ہے؟“

وہ شاہ زیب کو بازو سے پکڑ کر بولی۔ ”میں کم بخت نے پہلے کچھ نہیں بتایا بیمار کے بارے میں۔“ بیمار کا نام سن کر غلام رسول کے منہ میں وحشت پیدا ہو گئی وہ اٹھ کر بولے۔ ”بیمار کے متعلق کیا جانتا ہے؟“ آپ پوچھیں اس سے ”وہ شاہ زیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

غلام رسول تیزی سے شاہ زیب کی طرف بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر گڑگڑائے ”کہاں ہے بیمار بتاؤ بیٹے۔“ شاہ زیب بہت زیادہ خوف زدہ تھا، اس کا وجود کانپ رہا تھا وہ حراساں نگاہوں سے غلام رسول کو گھورنے لگا۔ ”بتاؤ بیٹے“ غلام رسول التجا کرتے ہوئے بولے۔ شاہ زیب ہٹکایا۔ ”وہ اور وہ بیمار کو ریاست چاچا لے گئے تھے اس شام، میں نے خود دیکھا تھا۔“

”ریاست چاچا لے گئے تھے۔“ غلام رسول حیرت سے بڑبڑائے۔ ”مگر کیوں؟“ غلام رسول نے اس سوال کے ساتھ ہی اس کو چھوڑ ڈالا۔

”مم..... میں نہیں جانتا“ وہ بیوی مشکل سے ہٹکایا

اور رونے لگا۔ شاہ زیب کی ماں ایک تھپڑ اس کے منہ پر مار کر بولی۔ ”اس کم بخت نے بھی ابھی بتایا ہے، پہلے بول پڑتا تو اچھا تھا۔“ ریاست کا نام سن کر غلام رسول کے دماغ میں بہت سے سوالات اٹھنے لگے۔ ریاست کو بھی اس نے اسی دن سے قصبہ میں نہیں دیکھا تھا جب سے بیمار غائب تھا۔ بیمار گمشدگی کے ساتھ ریاست کی قصبہ سے عدم موجودگی کو کسی شخص نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر یہ غور طلب بات تھی۔

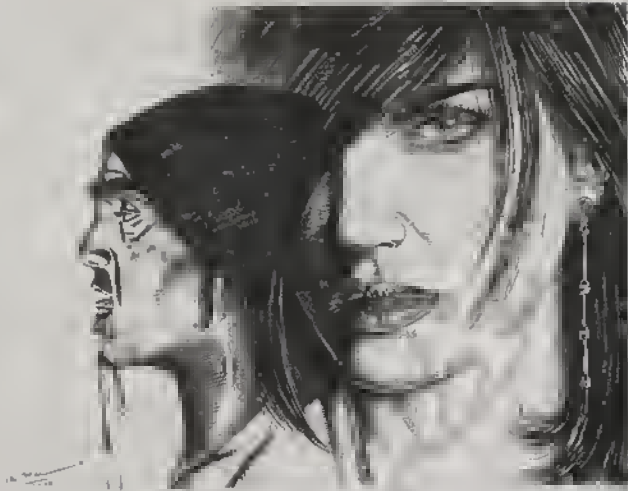
غلام رسول اپنے آپ کو کون سے لگے کہ انہیں اس بات پر غور کرنا چاہئے تھا۔ مگر وہ غم سے اس قدر منہ حال تھے اپنی کسی بات کا ہوش کہاں تھا۔ وہ فوراً اٹھے اور تھانے چلے گئے اور اپنا سارا مسئلہ بیان کیا۔ انسپٹر نے بڑے جمل سے کہا۔ ”غلام رسول تم سمیت سارا قصبہ جانتا ہے کہ ریاست ایک بہت اچھا انسان ہے۔ قصبہ میں کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے گھر میں، بند ہو کر کئی دن چلے کاٹا رہتا ہے۔ لیکن قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے، ہمیں شک ہے تو ابھی تمہارا شک دور کئے دیے ہیں اٹھو۔“

یہ کہہ کر انسپٹر اپنے دو ماتحت پولیس اہل کاروں اور غلام رسول کے ہمراہ ریاست کے گھر پہنچا۔ قصبہ کے اور بھی بہت سے لوگ ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپٹر نے دروازہ کو کھٹکھٹایا، دھڑ دھڑایا، مگر جواب نہ دیا، لہذا دروازے کا تالا توڑ کر وہ اندر داخل ہوئے مگر اندر کا منظر ایسا تھا جو سب پر لرزہ طاری کر رہا تھا۔

ریاست اونٹ سے منہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کے اوپر بیمار کا خون آلود وجود اور تھا جس نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ کمرے میں مردہ وجود کی بو پھیلی تھی۔ وہاں ایک لمحہ بھی کھڑے ہونا محال تھا آہٹوں کی آواز سن کر ریاست نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں اور گڑگڑایا ”خدا کے لئے اس سے مجھے بچاؤ، یہ میری جان نہیں چھوڑ رہا۔ میرے وجود سے جدا نہیں ہو رہا، خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔“ وہ اذیت سے رونے لگا۔

یہ منظر ایسا تھا کہ وہاں موجود ہر شخص توبہ استغفار کر رہا تھا غلام رسول خود بھی غم و حیرت میں مبتلا اپنے





## خونی جوکر

ایس حبیب خان - کراچی

رات کا سنناٹا ہر سو مسلط تھا، کمرے میں جان لیوا خاموشی طاری تھی کہ اچانک ایک کھلونے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کھلونے کا وجود بڑھنے لگا پھر اس نے ایک جوکر کا روپ دھار لیا اور اس نے آگے بڑھ کر لڑکی کی گردن دیوچ لی۔

کیا ایسا ہوتا ممکن ہے؟ ایک دل گرفتہ حقیقت جسے پڑھنے والے دنگ رہ جائیں گے

ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور بلیک اسکرین کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔

ناشتے کی میز پر دھوئے جلدی جلدی جوس ختم کیا اور سینڈویچ ہاتھ میں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ دھوا آرام سے اس کی ام بولیں ”نام میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ اور جلدی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

مدمو نے ریموٹ اٹھا یا اور صوفے پر گر کر ٹی وی آن کیا اور بغیر سر اٹھائے فریج فرائز کھانے لگی پھر اس نے چیرا اوپر اٹھا کر اسکرین دیکھی اور دھک سے رہ گئی بے اختیار اس نے خوف سے آنکھیں موند لیں۔ کافی دیر گزرنے کے بعد اس نے ایک آنکھ میں جھیری بنا کر اسکرین کی طرف دیکھا اور لحد بھر میں آنکھ داپس بند کر لی اور بند آنکھوں میں ہی ہاتھ بڑھا کر

ٹی وی فون کر دوں گا مگر مختار کو چھری سے ذبح کرنے کے بعد میں جیسے ہی اسے اٹھانے کے لئے جھکا اسی کا مردہ وجود مجھ سے چمٹ گیا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ اسے خود سے الگ کر سکوں مگر یہ مجھے ہی جانے نہیں دیتا۔ خدا کے لئے اسے مجھ سے الگ کر دو ورنہ میں اس کے منوں ورنی وجود کے بوجھ سے مر جاؤں گا۔ ڈہرو تے ہوئے گڑ گڑانے لگا۔

قبضے کا ہر شخص ریاست کو نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے مہذب چہرے میں کتنا مکروہ چہرہ چھپا تھا۔ وہ کہتے معصوم بچوں کا قاتل تھا مگر قدرت سے جو اسے سزا ملی تھی وہ بہت بڑی اور اذیت ناک اور بھیاں کھی گئی۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ ریاست کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے مگر کچھ باشعور لوگوں نے مشورہ کیا کہ شہر سے اسی عامل کو بلایا جائے جس نے مختار کے لئے تعویذ دیا تھا۔ ریاست کو جو قدرت کی طرف سے سزا ملی تھی اس کے دیکھنے کے لئے درود درود سے لوگ آ رہے تھے۔

ریاست اذیت اور شرمندگی سے سراپا رہا تھا۔ وہ خدا سے اپنی موت کی دعا کر رہا تھا۔ کبھی گنہگاروں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے۔ جس وقت تک شہر والے عامل قبضے میں پہنچے۔ ریاست کا وجود زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ شہر سے آئے ہوئے عامل نے ریاست کا حال دیکھتے ہی کہا۔ ”یہ بچہ یوں کبھی بھی اس شخص کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کا ایک ہی حل ہے اس بچے کی ماں خود اپنے ہاتھوں سے اس بچے کے مردہ وجود کو اس بد بخت سے جدا کرے۔“

بڑی کوشش کے بعد غلام رسول کی بیوی رشیدہ کو ہاں لایا گیا۔ رشیدہ کی حالت بہت خراب تھی مگر وہ سہارا دے کر وہاں لے کر آئے تاہم اپنے لخت جگر کے مردہ وجود کو دیکھ کر وہ تپ آگئی اس نے فری سے اپنے لخت جگر کے بے جان وجود کو ریاست کے مردہ وجود سے جدا کیا اور پیچھے چھوڑ کر روئے گئی۔ اس حیرت ناک واقعہ نے وہاں موجود ہر شخص کو ششدر کر دیا تھا۔ سچ کہتے ہیں قدرت کا انتقام بہت برا ہوتا ہے۔



بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو ریاست کے لئے بدترین سزا بن چکی تھی۔ پولیس اہلکاروں نے بڑی کوشش کی کہ مختار کے ننھے وجود کی گرفت سے ریاست کو چھڑوا سکیں۔ مکروہ ایسا نہ کر سکے۔ یہ انتہائی عبرت ناک منظر تھا جس نے ہر دیکھنے والی آنکھ کو دم بخود کر ڈالا تھا۔ پولیس اہلکار بڑی مشکل سے ریاست اور مختار کے مردہ وجود کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے۔

غلام رسول نے روتے ہوئے ریاست سے پوچھا۔ ”تم نے میرے لخت جگر کو کیوں مارا اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟“ ریاست بڑی مشکل سے بولا۔ ”آج سے تقریباً ایک سال پہلے ایک عورت نے مجھ سے عمل کروایا تھا وہ مفلی عمل اس نے اپنے کسی دشمن کے کم سن بچے کو مردانے کیلئے کروایا تھا مگر میری بد قسمتی کہ عمل میں ذرا سی کوتاہی سے وہ عمل الٹا ہو گیا اور میرا اکلوتا بیٹا ایک پراسرار بیماری کا شکار ہو کر مر گیا۔ مگر میں نے یہی مشہور کر دیا کہ ”میرا بیٹا معمولی بخار کے بگڑ جانے کی وجہ سے فوت ہوا ہے۔“ میری بیوی رات دن بچے کی جدائی میں تڑپتی رہتی آخر اس صدمے نے میری بیوی کی بھی جان لے لی۔ تب میرے دل میں انتقام کی آگ بجھ کر کھڑی ہوئی۔

مجھے جلن ہوئی تھی جب میں دوسرے لوگوں کے بچوں کو جتنے کھیلنے دیکھتا تھا اس لئے میں نے اپنے انتقام کا نشانہ چھوٹے بچوں کو بنانا شروع کر دیا۔ قبضے میں جس جس گھر میں معصوم بچے ہوتے ان میں سے کسی ایک کو اپنے خطرناک عمل کے ذریعے نشانہ بنانے لگا۔

صرف غلام رسول کا گھر ایسا تھا جہاں ایک معصوم بچہ زندہ سلامت تھا اور میرے انتقام کی آگ سے محفوظ تھا کیونکہ غلام رسول شہر میں رہنے والے عامل سے نورانی علم کا تعویذ لائے تھے اور وہ تعویذ تم نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ اس تعویذ کے سامنے میرا مفلی علم بیکار ہو جاتا تھا۔

جب میں کچھ نہ کر سکا تو میں تمہارے بیٹے مختار کو پہلا پھل کر پہلے اپنے گھر لے آیا پھر میں نے اسے بے ہوش کر دیا سوچا تھا کہ اسے قتل کر کے اپنے گھر کے صحن میں

مدھو اپنی مام کے ساتھ رہتی تھی اس کے پاپا اس دنیا سے جا چکے تھے، ماما جی بچھ کر مدھو اپنے فرینڈز کے پاس آ گئی۔ ”اب چلو بھی تمہاری وجہ سے ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔“ اس کے دوستوں نے کہا اور نکلاس لینے چل دئے۔ نکلاس کے بعد وہ لوگ کینٹین میں بیٹھ کر برگر اور کوئلڈ ریک انجوائے کرنے لگے۔

”تم لوگوں نے کل کی نیوز دیکھی؟ مجھے تو اس طرح لوگوں کو ایک دوسرے کو مارنے دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔“ لیش نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سچ میں مجھے بھی بہت برا لگ رہا تھا وہ سب دیکھ کر۔“ روجر نے اس کی تائید کی، پتا نہیں کیوں یہ لوگ بٹے ہوئے ہیں، سب انسان ہیں تو ایک کیوں نہیں ہو جاتے، ہل کر رہیں ہماری طرح، ہمیں دیکھو مدھو، مناشی روجر، لیش مذہب، میں خود، ہم سب الگ ہو کر بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ سدھیر نے افسردہ ہو کر کہا۔

”کم آن گاڑو یہی سی کی کم ٹیشن ہے جو پھر یہ سب باتیں کر رہے ہو۔“ مدھو بولی۔

”تم جیسے ہی لوگ تو ہوتے ہیں جو خود کو کچھ کرتے نہیں دوسروں کو بھی نہیں کرنے دیتے۔“ روجر بولا۔

دیکھنا ہی نہیں ہوا سچ۔“ لیش بولا۔

”ہونا کیا تھا، فیڈر رہی جیتا اینڈی کو اسٹریٹ سیٹس سے ہرا دیا ہے۔“ سدھیر بولا اور پھر سچ کی باتوں میں سب گم ہو گئے آخر ان کے فوریٹ فیڈر رکھا تھا۔ ”بھئی میں نے تم لوگوں کو ایک ضروری بات کے لئے بلایا ہے۔“ روجر نے مناشی سدھیر اور لیش سے کہا۔ ”وودن بعد فرسٹ اپریل ہے اور اب کی بار ہم مدھو کو فوٹو بنائیں گے، پچھلے سال دیکھا تھا اس اکیلی نے ہم سب کو فوٹو بنایا تھا۔ اب اس کی باری ہے۔“

”گڈ اینڈ یا روجر۔“ مناشی بولی اور پھر وہ پلاننگ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے مدھو کو کال کی کہ ”اپنی مام سے پریشن لے لو وودن بعد شو ہے اور پاسز آگئے ہیں۔ ہم سب جائیں گے۔“ مدھو نے اپنی مام

سے پریشن لے لی۔

روجر جب روم میں داخل ہوا تو اسے وہاں کا ماحول بہت عجیب لگا۔ ایک طرف بچک شوکا جو کہ بیٹھا تھا مگر اس کے آگے آگ جلی ہوئی تھی اور وہ انسانی کو پڑی پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ ایک دم سے اس نے آنکھیں کھولیں تو روجر اچھل گیا۔ ”آئی ایم سوری! شاید میں غلط ٹینٹ میں آ گیا ہوں۔“ اور واپس ملٹنے لگا۔ ”مظہر! تم ان سب سے ڈر رہے ہو، یہ کچھ نہیں میرا ذاتی سامان ہے تم بولو تمہیں کیا کام ہے۔“

”کیا تم جادو کرتے ہو؟“ روجر نے پوچھا۔ ”جہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا چاہئے اپنا کام بتاؤ۔“ اور پھر روجر نے اس سے اپنی فرینڈز کو ڈرانے کا کام طے کر لیا۔

”گھڑو شو ہے کس کا؟ راک کنسرٹ؟ مدھو نے ایک سیٹنڈ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ تو آ کر ہی پتہ چلے گا۔“ ”اٹس سر پرائز۔“ ہاں اس بات کی گارنٹی ہے کہ مزہ بہت آنے والا ہے۔ سدھیر نے آنکھ مارے ہوئے اپنے دوستوں کو دیکھ کر کہا تو سب سکرانے لگے۔ مدھو نے کار کے ٹشے میں سے بڑا ایڈا ”بچک شو“ لکھا ہوا دیکھا تو منہ بنا کر بولی۔ ”تم لوگ بھی حد کرتے ہو، وودوہ پیتے بچوں کی حرکت کی ہے تم نے بچک شو دیکھنے کی عمر ہے تمہاری؟ یہ سر پرائز تھا؟ نیم آن یو گاڑو۔“ ہم نے کب کہا کہ یہ سر پرائز ہے۔ وہ تو ابھی آئے گا، وہ سب انڈر جا کر سیٹوں پر بیٹھ گئے اور شو شروع ہو گیا۔ ایک دو آئٹم کے بعد پردہ گر گیا۔ مدھو بوریٹ سے جمائیاں لینے لگی پھر پردہ اٹھا تو وہاں ”جوکر“ نمودار ہوئے اور لوگوں کے دل بھلانے لگے۔ جمائی لیتی مدھو کا منہ جوکر زکوڈ دیکھ کر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ خوف کی جھرجھریاں اسے سر سے پیر تک محسوس ہونے لگیں وہ ایک دم سیٹ سے اٹھ کر بھاگی اور باہر نکل آئی۔

”جوکر سے مدھو کی روح فنا ہو جاتی تھی اور یہ خوف بچپن سے تھا اس کے کھلونوں میں بھی کوئی جوکر نہیں تھا۔ جوکر کو دیکھ کر اسے ایک انجانا خوف گھیر لیتا کہ

جوکر سے مار ڈالے گا۔ اس کے چہرے کے رنگوں سے اس کو گھبراہٹ ہوتی تھی کیوں؟ یہ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا وہ کسی فلم کے سین میں بھی جوکر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی تھی یہاں تو سچ سچ کے جوکر تھے اسے اپنے فرینڈز پر غصہ آ رہا تھا۔ ”بھلا ایسا مذاق بھی کوئی کرنے کا ہے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ میں جوکر سے کتنا ڈرتی ہوں۔“ وہ روتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی اور سیٹ سے نیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں مدھو کے فرینڈز گاڑی سے کچھ دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ ”کیوں روجر اس پر اتنا کدقت کب آئے گا؟“ سب نے کہا۔ ”بس یہ بلو آ گیا۔“ روجر بولا اور سب ہنسنے لگے۔

اور مدھو کی آنکھیں بند نہیں اچانک اسے اپنی ران پر کسی کی انگلیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں وہ بھی مناشی ہوئی مگر پھر اس نے سوچا کار کا گیٹ تو کھلا ہی نہیں اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر اپنی ران پر گئی۔ وہاں ایک ہاتھ تھا جس نے ”سفید و سناٹہ“ پہنا ہوا تھا اس نے چونک کر نظریں اوپر کیں تو اس کی ٹی گم ہو گئی سامنے جیتا جانتا جوکر اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔

گھرے گھرے رنگوں والا گول ناک، مہنجاسر وہ پورا منہ کھول کر ہنسا تو اس نے چیخیں مارنی شروع کر دیں۔ اسے لگ رہا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا اس نے ایک جھٹکے سے دوڑنا کھولا اور بے تحاشا تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا وہ اندھا دھند دوڑ رہی تھی اور پارکنگ سے نکل کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا جوکر اس کے پیچھے آ رہا تھا اس نے دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھا اور بائیں طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی راستہ نیچے کی طرف ہو گیا دوڑتے دوڑتے وہ ایک زبردست طریقے سے منہ سے بل گری کوئی چیز تھی جو اس کے پیروں سے نکل رہی تھی اس کا منہ مٹی میں اٹ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو روڈ کی ایک شدید لہر اس کے پیروں میں دوڑ گئی۔ مدھو نے نیچے دیکھا وہاں زمین پر سریے پڑے تھے۔ اس کو دور سے قدموں کی آواز آئی تھی۔ اس نے گھبرا کر ایک سریا اٹھایا اور ایک طرف اڑو بیٹھ گئی۔ اس

کے آگے چھوٹی سے چھڑی تھی جس سے وہ کچھ حد تک چھب گئی تھی۔ جیسے ہی وہ جوکر قریب آیا تو مدھو وارلٹ ہوئی اس جوکر کی بیٹھ اس کی طرف تھی اس نے اٹھ کر ایک بھر پور وار اس کے سر پر کیا وہ اپنا سر پکڑ کر گھوما اور مدھو کو دیکھتے ہوئے لہرا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مدھو دھڑکیں مار مار کر رونا شروع ہوئی اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اتنے میں اس کے فرینڈز بھی وہاں پہنچ گئے مناشی نے مدھو کو سنبھالا اور روجر زمین پر پڑے جوکر کو کھینچ لے گا۔ ”اوہ شٹ!“ وہ زور سے بولا سدھیر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی۔ ”یہ تو مر گیا۔“ اس کا یہ کہنا تھا کہ سب کو سانپ سوگ گیا۔

”میں نے اس کو جان بوجھ کر نہیں مارا، میں نے ڈر کر اس کو بھگانے کے ارادے سے مارا تھا، مجھے کیا پتہ تھا یہ مر جائے گا!“ مدھو نے روتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو اس بات کو، اب یہ سوچو کرنا کیا ہے؟“ مناشی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ہمیں اس کو ٹھکانے لگانا ہوگا ورنہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ہم سب لاک اپ میں ہوں گے۔ لیش کہنے لگا۔

پھر ان لوگوں نے وہیں گڑھا کھودا اور اس مرے ہوئے جوکر کو مٹی میں دبا دیا۔

مدھو کی حالت قبل رحم ہو رہی تھی مناشی کا دل اسے دیکھ کر کٹ رہا تھا اس کو خود سمیت روجر، لیش اور سدھیر پر غصہ آ رہا تھا۔ ”ہم سب نے انتہائی بے ہودہ مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ مدھو پلیز ہمیں معاف کر دو۔“ اس نے مدھو سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

”وہ جوکر تھا کون؟“ ”اسی بچک شو میں کام کرتا تھا، اچھا ہوا جب میں نے اس سے بات کی تھی تو اس وقت وہ اکیلا تھا ورنہ ہمیں لینے کے ویسے پڑ جاتے۔“ روجر بولا۔

مدھو نے اپنے فرینڈز سے بات چیت بند کر دی۔ کافی دنوں تک ان لوگوں نے مدھو کو سنایا اور معافی مانگی جب کہیں جا کر مدھو نے انہیں معاف

January 2013

Dar Dığest 8

وہیاباغل نہیں ہے۔ مرنے کے بعد بھلا کوئی واپس کیسے

”ویسٹو پلینز مجھے چھوڑ دو۔“ زو جڑ لڑ لڑایا۔



”چھوڑ دوں؟ تو میں نے بکڑا کب ہے؟“ روچڑچڑائیں مارتا رہا مگر کسی کو کچھ سنائی نہ دیا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا جب تک بہت دیر ہو چکی تھی روچڑکی لاش! اسے لاش کہنا غلط تھا لوگوں کا خوف سے دم نکل رہا تھا اسے دیکھ کر ایک حادثہ قرار دے دیا گیا۔ جم والوں پر کیس فائل ہو گیا مگر مدعو اور سدھیر دونوں خاموش تھے مدعو نے خوف زدہ انداز سے سدھیر کی جانب دیکھا جو کہ کسی سوچ میں گم تھا۔

”سدھیر آج تم کاج نہیں جا رہے؟“ ماں نے پوچھا۔ ”نہیں ماں آج کلاس نہیں تھی کوئی اس لئے آج نہیں جا رہا۔“

”تو ٹھیک ہے آج تمہارے چا کو جانا تھا اب تم ذرا سچت کا کام دیکھ لیتا۔“ ماں نے کہا۔

”جی اچھا ماں سدھیر نے کہا اور کمرے سے نکل کر اوپر جانے لگا۔ اوپر کی منزل پر کمرے بنائے جا رہے تھے مزدور اپنا کام کر رہے تھے سدھیر ایک طرف کرسی ڈال کر اپنا پیٹھ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا۔ ڈیڑھ بجے کے وقت مزدور کھانا کھانے چلے گئے سدھیر بھی اٹھ کر نیچے جانے لگا ہی تھا کہ کھٹ..... کھٹ کی آواز آئی اس نے سانسے دیکھا تو ایک مزدور اکیلا سر یوں کے بیچ میں ہتھوڑا لے کر پیٹ رہا تھا۔ ”کیوں صاحب آپ نہیں گئے کھانا کھانے؟“ سدھیر نے اسے مخاطب کیا۔

وہ مزدور سر جھکائے ہتھوڑا چلائے جا رہا تھا۔ سدھیر اس کے قریب گیا۔ ”میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔“ وہ مزدور پلٹا اور ہتھوڑے کا وار سدھیر کے منہ پر کیا سدھیر کا جیڑا ٹوٹ گیا وہ زمین پر جا پڑا۔ سدھیر نے اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں مزدور کی جگہ وہی جو کھڑا تھا جسے مدعو نے مارتا تھا سدھیر کے دماغ میں مدعو کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”تم مانویانہ مانوس سدھیر ایک وقت آئے گا جب تم میری تائید کرو گے۔“ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی وہ کھٹ کر آگے بڑھنا چاہ رہا تھا مگر گھسٹ بھی نہیں پار تھا۔ خوفناک رنگوں سے سچے چہرے کے ساتھ وہ

جو کہ سدھیر کے قریب آیا اور مسکراتے ہوئے گردن ہلا کر بولا۔ ”دو!.... دو! اور دو ہور ہا ہے؟“ اور سدھیر کے ٹوٹے ہوئے جیڑے پر ہاتھ پھیرنے لگا تو اس کے درد میں اور اضافہ ہو گیا۔

”مجھے تو کچھ درد ہی محسوس نہیں ہوا تھا، بس ایک دھماکہ ہوا تھا سر پر اور بس!“ جو کہ تاج تاج کر باتیں کرنے لگا چلو میں تمہیں بھی درد سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جو کہ نے سدھیر کو دونوں ہاتھوں پر فضا میں بلند کیا اور سانسے ٹھہرے سر یوں کی جانب اچھال دیا۔ سدھیر سر یوں پر گرا اور سرے اس کے جسم کے آ رہا ہو گئے سدھیر چند لمحوں کا پھر خنقا ہو گیا اس کی چھرا میں لگا ہیں آخری وقت تک اسی جو کہ پر تھیں۔

مدعو کو سدھیر کی موت کی اطلاع ملی تو اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ ”مناسکی، روچڑ، سدھیر! اب میری باری ہے۔“ یہ کہہ کر مدعو دو حارٹس مارنے لگی اس کی بام بھاگتی ہوئی آئیں۔

”نہیں بیٹا! ایسے نہیں روتے، بہت کرو بھگوان کی یہ ہی مرضی تھی میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری فیلنگز مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ماں آپ سمجھ نہیں رہی ہیں بات وہ نہیں ہے۔“ مدعو روتے ہوئے بولی۔

”تو کیا بات ہے؟“ ماں نے پوچھا تو مدعو نے انہیں شردع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ جسے سن کر مدھو کی ماں سکتے میں آ گئیں۔

”اوہ نو! یہ تم نے کیا کر دیا“ ”مروڑ“ اور اتنی بڑی بات تم اب بتا رہی ہو؟“ ماں غصہ کرنے لگیں۔ ”اب ہو گئی ناں غلطی! ماں اب میں کیا کروں؟“ مدعو نے روتے ہوئے کہا۔

”بیٹا رو نہیں، دراصل تم نے اس بات کا اتنا اثر لے لیا ہے کہ تم نے اپنے دوستوں کی موت کو بھی اس سے جوڑ دیا ہے تمہیں پیچھ کی ضرورت ہے، ہم کل ہی تمہاری آئی کی پاس چلتے ہیں کچھ دن وہاں رہو گی تو سب بھول جاؤ گی اوکے؟“ انہوں نے مدھو کو بابر سے لپٹاتے ہوئے کہا تو مدھو مسکراتے لگی۔

جہاز نے فیک آف کیا تو مدھو نے سکون کا سانس لیا۔ دوسرے شہر پہنچ کر مدھو کی جان میں جان آگئی تھی پچھلے دنوں وہ بہت زیادہ پریشان اور خوف زدہ رہی تھی اوپر سے اس کے بیٹ فریڈرک کی جدائی، یہ سب سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تیر پورٹ پر آئی روزی نے ان کا والہانہ استقبال کیا ان کے شوہر کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے جبکہ وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے مائیکل کے ساتھ رہتی تھیں مدھو نے مائیکل کو گود میں اٹھایا اور پل دی، آئی روزی اور اس کی ماں پیچھے آ رہی تھی مدھو سب بھول کر زندگی میں گم ہو گئی، دن آرام سے کٹنے لگے۔

صبح کے وقت مدھو نے جوس پی کر گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور برتن اٹھانے لگی۔ ”مدھو“ آئی روزی کی آواز آئی۔

”جی آئی!“ مدھو بولی۔

آئی بچن سے نکل کر آئیں تو ان کے ہاتھ میں جسنے کا ڈبہ تھا۔ ”بیٹا اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو یہ باکس اسٹور روم میں رکھ دو۔“ آئی نے کہا۔

آئی زحمت کیسی؟ لائیں اور پھر مدھو نے باکس لیا اور اسٹور روم کا دروازہ کھول کر بیڑھیاں اترنے لگی۔ باکس کو ایک سائیز پر رکھ کر مدھو جیسے ہی ملکی دھب سے کوئی چیز اس کے سامنے گری۔ مدھو کی ایک دم بیچ نکل گئی وہ بھی کوئی سامان ہے اس نے زمین پر گری چیز کو اٹھایا تو اس کی ٹم ہو گئی وہ ایک ”جوکر“ تھا۔

مدھو نے اسے زور سے اچھال کر درد پھینک دیا اور بھاگ کر بیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل آئی اور دروازہ بند کر کے پشت سے فیک لگا کر زور زور سے سانس لینے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل حق سے اچھل کر باہر نکل پڑے گا بڑی مشکل سے وہ اپنے روم میں آئی۔

ہوئی اس نے کھینچ کر نکال کر جود دیکھا تو سن ہو گئی یہ وہی ”جوکر“ تھا جو نیچے اسٹور روم میں تھا یہ یہاں کیسے آیا یہ سوال شدت سے مدھو کے ذہن میں گونجنے لگا۔ اس نے جوکر دور اچھال کر پھینک دیا اور اندر چلی گئی۔

رات کھانے کی ٹیبل پر مدھو خاموش تھی۔ ”کیوں مدھو نہ زینہ نہیں آ رہا بیٹا؟ تمہارا فوٹ اسٹو بنایا ہے میں نے خاص طور سے تمہارے لئے۔“ آئی روزی نے کہا۔

”نہیں آئی ڈر بہت لہذہ ہے۔ وہ دراصل میں نے اور مائیکل نے شام میں پیڑا آؤڈر کر لیا تھا۔“ مدھو نے کہا اور چھری سے اسٹوکاٹنے لگی۔ متراس کا ذہن جو کر کی طرف ہی تھا۔

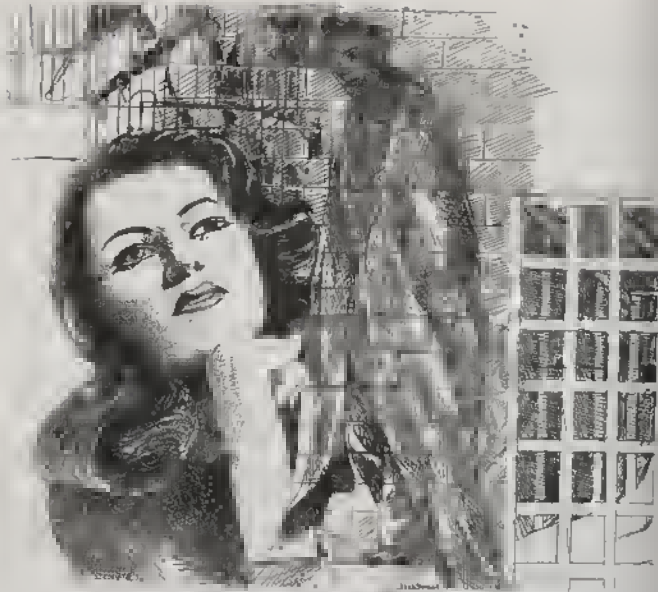
آکھ کھلنے پر مدھو کو حلق میں کانٹے پڑے محسوس ہو رہے تھے اس نے اٹھ کر سائیز سے گلاس اٹھایا مگر وہ بالکل خالی تھا۔ وہ جھنجھلاتی ہوئی اٹھی اور بچن میں فریج کھول کر بوسل نکال لی پھر گلاس میں پانی بھر کر پینے لگی۔ پانی کا گلاس ابھی بھی اس کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا پانی اس کے حلق سے نیچے اتر رہا تھا اور وہ فریج کے اوپر دیکھنے لگی ایک دم گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پکنا چور ہو گیا۔ فریج کے اوپر وہی ”جوکر“ بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیلی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

مدھو نے زور دار بیچ ماری اس کی آواز سن کر آئی روزی اور ماں دونوں آگئیں بچن میں مدھو نیچے ایک کونے میں کھٹی بیٹھی ہوئی تھی وہ کانپ رہی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ ”کیا ہوا مدھو؟“ ماں نے مدھو کو لپٹاتے ہوئے کہا۔

”وہ، وہ، وہاں“ مدھو نے انگلی فریج کی طرف کرتے ہوئے کہا اس کی آنکھیں ابھی بند تھیں۔

”وہاں کچھ نہیں ہے! بیٹا۔“ آئی نے کہا۔

”ماں! بچ..... بچ..... بچ..... جوکر فریج“ مدھو کے منہ سے الفاظ نکل رہے تھے۔



## آسیبی معمر

محمد وارث آصف - وال بھراں

کمرے کے وسط میں بیٹھے قاری صاحب نے قرآنی آیات کا ورد شروع کیا تو کوئی پندرہ منٹ بعد کمرے میں چند ہیولے نمودار ہوئے اور پھر وہ ہیولے ایک ٹھوس وجود دھار کر سامنے آ گئے، اور وہ ہمکلام ہوئے۔

خوف دہراں پھیلاتی جسم دجاں پر کچی طاری کرتی تا قابل فراموش دلخراش کہانی

تھے۔ وہ اکلوتا بھائی تھا اور صرف ایک ہی بہن تھی جو کہ شادی شدہ تھی۔ آصف کی عمر 22 سال تھی۔ ماں باپ کے بعد اسے اس کے چچا نے پالا پوسا تھا اور شادی کر کے اب اس کے کندھوں پر ذمہ داریاں ڈال دی تھیں۔ اپنی بوی کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سخت حیرانگی ہوئی۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس

آصف جب اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس نے اپنی بوی نکلیں کو دروازے پر ہی بدحواسی کے عالم میں اپنا منظر پایا۔ آصف اس وقت کام سے واپس آیا تھا۔ وہ مسرتوں کے ساتھ دیہاڑی کا کام کرتا تھا۔ اسے گھر آتے آتے اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس کی ابھی ایک سال پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کئی سال پہلے اس کو چھوڑ کر راہی عدم ہو چکے

اپنی سانس روکی گمراہ واز بھر مٹی آ رہی تھی۔ اس کا دم نکلنے لگا وہ ایک دم ابھی تو ایک دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھوں کے گرد تارے ناچنے لگے پھر اندھیرا چھا گیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ٹنکی کے نیچے ہے اور بے دھیانی میں اس کا سر زور سے ٹکرایا تھا وہ اپنا سر پکڑے پکڑے ٹنکی کے نیچے سے گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی نکلی تو کسی نے کس کر اس کے بال پکڑ لئے اس کی جھنجھکی اٹھی اور پھر وہ گھٹنٹی گھٹنٹی چھت کے کونے پر آ کر گر گئی۔ جو کہ خوف ناک انداز سے اس کے سامنے کھڑا تھا پھر اس کا دمان کھلا اور وہ بولا۔ ”اتنی آسان موت نہیں ملے گی تجھے۔“ اور مدحو کے سینے پر اپنا پنجہ رکھ کر اس کو پیچھے دھکیل دیا۔

مدحو جیتی ہوئی نیچے گرتی چلی گئی پھر دھب کی آواز کے ساتھ سوسنگ پول کے کنارے پکے فرش پر پیچھے گری، اس کے جسم کے نیچے خون کا تالاب بننے لگا۔ جو کہ لکھ بھر میں چھت سے غائب ہو کر نیچے آن موجود تھا۔ مدحو کا خون آس پاس پھیل کر سوسنگ پول میں گرنے لگا۔ سوسنگ پول کا پانی سرخ ہونے لگا مدحو جھکے لے لے کر تڑپ رہی تھی۔ وہ جو کہ اس کے پاس آباوراکڑو بیٹھ کر رونے لگا پھر ایک دم قہقہے لگانے لگا۔ پھر اس نے اپنے سفید دستانے کے ہاتھ گھمائے تو ایک ہاتھ کے انگوٹھے پر آگ کا شعلہ جل اٹھا، اس نے تڑپتی مدحو کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی سے کہا۔ ”گڈبائے“ اور مدحو کی پھٹی ہوئی ٹی شرٹ میں آگ بھڑک اٹھی وہ زندہ تھی مگر مزاحمت بھی نہ کری اور زندہ جلتے جلتے اذیت ناک موت کا شکار بن گئی۔

ان سب میں مدحو کا کوئی قصور نہ تھا مگر اس کے دوستوں کے ایک مذاق کی وجہ سے اس کی زندگی کے سب سے بڑے خوف نے حقیقت کا روپ لے کر اس کی جان لے لی اور یوں اس کا خوف سچ ثابت ہو گیا کہ ”جو کہ اسے ماروے گا۔“



بالکل خالی تھا۔ ”بیٹا پرانی باتوں اور یادوں کو انور کرنے کی کوشش کرو۔“ اور اسے اٹھا کر اس کے روم میں لے آئیں اور بیڈ پر لٹا کر جانے لگیں تو مدحو نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا ”مام! پلیز مجھے اکلیا چھوڑ کر مت جائیں۔“ ”مدحو بیٹا اپنے ذرا کا مقابلہ تمہیں خود کرنا ہے۔“ مام نے اس کے سر پر ہاتھ پیچھے ہٹے ہوئے کہا۔

”مام بس آج آخری بار“ آپ میرے ساتھ سو جائیں، پھر میں آپ کو کبھی بھی تنگ نہیں کروں گی۔“ مدحو نے بے جا رنگی سے اپنی مام کی جانب آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو مام کو مدحو پر اس وقت بے اعتبار ترس آیا۔ ”اوکے مائی چائلڈ ایڈوش۔“ پھر مام مدحو کے برابر میں لیٹ گئیں۔

انہیں فکر تھی کہ مدحو اس خوف سے کیسے باہر آئے گی پھر انہوں نے دیکھا کہ مدحو سو گئی ہے تو وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنے روم میں آ گئیں۔ ”جب مدحو صبح اٹھے گی تو اسے بتاؤں گی کہ تم بے کار میں ڈر رہی تھیں، رات بھر بالکل اکیلی سوئی تھیں تم۔“ اور مسکرا کر سونے لگیں مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

رات کا جانے کون سا پر تھا جب مدحو کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی اس نے گردن لے کر مام کو دیکھا چاہا مگر وہ سن ہو گئی کیونکہ برابر والے تکیے پر مام کے بجائے ”جو کہ“ لیٹا جس رہا تھا۔ مدحو کو کرنٹ سا لگا اور وہ اچھل کر بستر سے نیچے کود گئی اس نے بھاننا چاہا تو جو کہرنے پیچھے سے اس کی ٹی شرٹ پکڑ لی، اس نے زور لگایا تو ٹی شرٹ چرچر کر کے پھٹتی چلی گئی۔ مدحو نے اس کی پرواہ نہ کی اور بھائی چلی گئی کمرے سے نکل کر اسے سامنے سیزھیاں نظر آئیں وہ بے ساختہ اس پر چڑھ گئی سیزھیاں چھت پر جا کر ختم ہوئیں چھت پر پہنچ کر مدحو ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سامنے اسے پانی کی بڑی ٹنکی نظر آئی تو نو راجھک کر اس کے نیچے گھس کر اکڑ بیٹھ گئی وہاں گھس اندھیرا تھا۔ چند لمحوں بعد

اس کو اپنے سانسوں کے علاوہ بھی آواز سنائی دی اس نے

تھی۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا نگین اس سے لپٹ گئی اور سکنے لگی۔ بیوی کے اس طرح کے عمل نے اس کے دل میں طرح طرح کے دوسوے اور باتیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اس نے جھٹ پوچھا۔ ”نگین..... کیا ہوا؟“ خیر تو ہے نا..... تم دو کیوں رہی ہو؟ مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے.....؟“

مگر اس کی بیوی صرف اس سے لپٹی روئے جاری تھی۔

اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں کا آپس میں کبھی جھگڑا تک نہیں ہوا تھا۔ وہ ہلکی خوشی زندگی گزار رہے تھے مگر آج جیسا اس نے سوچا۔ ”ضرور کوئی اہم بات ہوگی۔“ اس نے استفسار کیا تو نگین نے انگلی کا اشارہ اپنے گھر کے کمرے کی جانب کیا اور ڈرتے ہوئے بولی۔ ”وہ..... وہ..... وہ کمرے میں.....!“ خوف کے مارے اس پر جیسے کیکیا پھٹ طاری تھی اور اس کی وجہ سے اس کے منہ سے صحیح الفاظ بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔

آصف نے حیرانگی سے کمرے کی طرف دیکھا جس کی جانب نگین نے اشارہ کیا تھا۔ تمام گھر میں اندھیرا تھا کیونکہ اس جگہ بجلی نہیں تھی۔ آصف کے ذہن میں کئی باتیں آئیں، اس نے جلدی سے کمرے کی جانب قدم بڑھایا مگر اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے بولی۔ ”نہیں..... ادھر مت جانا۔“

”کیا مطلب.....؟ کیوں نا جاؤں ادھر اور مجھے بتاؤ تو سہی ہوا ہے کیا آخر؟..... نہ تم مجھے کچھ بتا رہی ہو، نہ کمرے میں جانے دے رہی ہو، آخر ایسا ہے کیا ادھر.....؟“

”..... وہ میں کھانا پکا رہی تھی کہ مجھے یاد آیا کہ سالن میں دھنیا بھی ڈالنا ہے اور میں دھنیا لینے کمرے میں گئی تو مجھے کمرے میں جا کر ویسی خوشبو محسوس ہوئی جیسے کمرے کے جسم اور کنپریں پر ڈالی جاتی ہے..... میں سخت حیران ہوئی خوشبو بہت واضح تھی اور ایسے محسوس ہو رہی تھی کہ جیسے اندر کمرے میں ابھی ابھی کسی کو کفن

دے کر اسے خوشبو سے نہلا یا گیا ہو۔ میں اسے وہم کا نام بھی نہیں دے سکتی کیونکہ خوشبو مجھے برابر آتی رہی، میں نے جیسے ہی دھنیا والا ڈبہ اٹھانا چاہا تو مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کہ یا تو کوئی چار پائی پر بیٹھا ہو یا پھر اٹھا ہو کیونکہ ہماری جو چار پائیاں ہیں ان پر بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر وہ آواز دیتی ہیں بس اسی سے مجھے خوف محسوس ہوا اور میں بھاگتی ہوئی یہاں آ گئی ہوں۔“ نگین نے اسے جب تفصیل سے آگاہ کیا تو اس لمحے خوف کی ایک سرور اس کی ریزہ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

اسے اپنی بیوی پر اعتبار تھا وہ ہمیشہ بات کو پرکھ کر ہی بولتی تھی۔ اسے بھی اندھیرے سے ڈر سا محسوس ہوا مگر یکدم اس نے سارے ڈر کو ختم کیا اور بیوی کو دلا سہ دیتے ہوئے بولا۔ ”اوه..... اتنی سی بات پر تم ڈر گئی کچھ بھی نہیں یہاں..... تم کو صرف وہم ہوا ہے اور دہی مجھے تم چونکا گھر میں اکیلی رہتی ہو اسی لئے اکثر اوقات ایسا ہو جاتا ہے اور تمہیں اک خاص بات بتاؤں..... یہ جو تم ہر وقت خوفناک کہانیوں کے رسالے پڑھتی ہونا، یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے بھی۔ اب چلو شاہاش! مجھے پانی پلا دو..... سخت پیاس لگی ہے۔“

آصف کی اس بات سے نگین کو شرمندہ ہونا پڑا کیونکہ واقعی وہ خوفناک کہانیوں والے رسالے بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ آصف کے آنے سے اس کے ذہن میں جو رشتہ قائم ہو گیا اور وہ اس کے لئے گھرے سے پانی لینے چلی گئی۔

آصف کمرے میں داخل ہوا تو اسے کسی بو کا احساس نہ ہوا، وہ کافی دیر تک کمرے میں کھڑا ہا پھر اپنی بیوی سے بولا۔ ”مجھے تو کوئی بو محسوس نہیں ہو رہی..... کہیں گئی وہ مردوں والی بو۔“

نگین کمرے میں آئی اور اس نے سونگھا تو اسے بھی کوئی بو محسوس نہ ہوئی۔ وہ سخت حیران ہوئی مگر پھر مزید شرمندگی سے بچنے کے لئے اس نے آصف سے کہا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے؟“ وہ کھانا کھاتے ہیں۔“ اور وہ دونوں کھانے پر جت گئے۔

آصف دوسرے دن عصر کے وقت ہی واپس آیا۔ جب شام ہونے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے گھر کے دونوں کمروں کے دروازے بند کر دیئے کیونکہ وہاں توں میں اکثر لوگ شام کے وقت کمروں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ وہ نماز پڑھنے چلا گیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ گھر آیا اور کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو یکایک اس کی ناک میں عجیب سی خوشبو عود کر آئی۔ اس نے تیزی سے سونگھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ خوشبو تو وہی ہے جو مرنے کے کفن پر لگاتے ہیں۔ خوشبو بڑی واضح تھی اور نگین نے بالکل سچ کہا تھا۔ اس نے تیزی سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

وہ سخت پریشان ہو گیا۔ وہ کافی عرصے سے اس گھر میں تھا۔ اس کے والدین بھی اسی گھر میں انہی کمروں میں رہے تھے مگر کبھی بھی ایسا کچھ نہ ہوا تھا تو پھر اب ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اسے پریشانی کے ساتھ ساتھ خوف بھی لاحق ہو گیا اس نے سوچا کہ ”اسے ضرور کسی اللہ والے سے اس بابت مشورہ کرنا چاہئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ان کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے۔“

”اس نے اس قسم کے کئی قصے سن رکھے تھے۔ بہر حال وہ جتنا سوچتا گیا اتنا ہی الجھتا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ مزید قہقہے کے لئے کمرے میں آیا تو اب اسے کوئی بھی خوشبو محسوس نہ ہوئی۔ اس نے کئی بار زور زور سے سونگھا مگر خوشبو ہوتی تو محسوس ہوتی۔ وہ اس اجنبی پر سخت حیران ہوا۔ شام کو اس نے واضح خوشبو سونگھی تھی مگر اب نہیں تھی اور کل نگین نے اسے شام کے بعد اسی نام کا بتایا تھا جس نام سے آج محسوس ہوئی تھی۔ اسے اتنا ہٹا تو جھل گیا کہ خوشبو اس وقت آتی ہے جب اندھیرا مکمل پھیل جاتا ہے اور پھر کچھ دیر بعد خوشبو ناپید ہو جاتی ہے مگر سوال یہ تھا کہ یہ خوشبو آخر آتی کیوں ہے؟ اور چند لمحے کے لئے کیوں ہوتی ہے؟ پوری رات کے لئے کیوں نہیں اور صرف اسی وقت کیوں؟“ اس کی ضرور کوئی نہ کوئی بڑی وجہ ہوگی۔ اس نے سوچا۔ ”مجھے مزید دیر لگے بنا اس مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔“

اسے یاد آیا کہ جس مدرسے میں وہ کام کرنے جاتا ہے اس مسجد کے امام صاحب کافی نیک اور اس قسم کے کاموں کے باہر ہیں۔ کام کے دوران وہ کئی مزدوروں سے اس قسم کی کچھ باتیں بھی سن چکا تھا۔ ضرور وہ اس مسئلے کو حل کریں گے۔

رات اس نے کاناٹوں پر گزاری۔ صبح اس نے کام پر جاتے ہوئے مسٹری کو راہ میں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا تو مسٹری نے بھی اسے وہی مشورہ دیا کہ تم جیسے ہی پہنچو اسی وقت قاری صاحب سے مشورہ کر لینا۔ آصف جیسے ہی مدرسہ میں پہنچا باقی مزدور اور مسٹری تو کام کی سیٹنگ کرنے لگے مگر وہ سیدھا مدرسے سے ملحقہ مسجد میں چلا گیا۔ وہاں بچے پڑھتے بھی تھے۔ اس نے ایک بچہ سے قاری صاحب کا پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ ایک گھنٹہ میں آجائیں گے۔ تو اس نے سوچا جب قاری صاحب آجائیں گے تو ان سے بات ہوگی۔ تاہم گزرتا گیا پھر کھانے کے لئے کام بند کیا گیا۔ کھانا آرام سے کھانے کے بعد وہ سیدھا قاری صاحب کے پاس گیا جو کہ اپنے کمرے میں موجود تھے۔

کمرے کے دروازے پر اس نے چپل اتاری اور اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا دھانے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاں..... یو لو کیا بات ہے؟“ قاری صاحب نے دریافت کیا۔

”قاری صاحب دراصل میں ایک کام سے حاضر ہوا ہوں۔“

”کون سا کام؟“

”قاری صاحب کچھ پراسرار مسئلہ ان دنوں ہمارے گھر میں رونما ہو رہا ہے اس لئے آپ سے مدد لینا تھی۔“

”پراسرار مسئلہ.....؟“ قاری صاحب نے چوہکتے ہوئے کہا۔ ”کیا مسئلہ ہے.....؟“

پھر آصف نے ان کو تفصیل سے تمام باتوں



سے آگاہ کیا جو تکلیف اور اس کے ساتھ روٹا ہو چکا تھا۔ قاری صاحب نہایت توجہ اور دھیان سے اس کی باتیں سنتے رہے۔

جب آصف انہیں باتوں سے آگاہ کر چکا تو وہ بولے۔ ”اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔!“

”جی قاری صاحب! ہم بہت پریشان ہیں۔ میں چونکہ گھر پر اکثر اوقات نہیں ہوتا اور بیوی اکیلی ہوتی ہے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں اکیلے میں اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ بن جائے اس لئے مجھے مستری نور احمد نے آپ کا بتلایا اور میں امید لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ قاری صاحب ہمیں اس پریشانی سے نجات دلائیں، ہم پر آپ کا یہ احسان ہوگا؟“

آصف نے عاجزی سے کہا۔

”تم فکر مت کرو۔۔۔ انشاء اللہ اس مسئلے کا حل نکل آئے گا لیکن اس سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا گھر میں جنت ہیں یا کوئی تعویذ وغیرہ اور تم نے جو خوشبو کا ذکر کیا ہے وہ اکثر اوقات کالے جادو کی کارستانی ہوتی ہے۔“

آصف یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ اسے اچانک پریشانی نے آگھیرا اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کا منہ لنگ گیا۔ کالے جادو کے بارے میں اس نے کئی باتیں سن رکھی تھیں جنہیں ذہن میں دہراتے وقت وہ خوف سے لرز رہا تھا۔

قاری صاحب نے اس کے لٹکے ہوئے منہ کو دیکھ کر کہا۔

”آصف۔۔۔ اتنی جلدی کالا جادو اثر نہیں کرتا۔۔۔ اسے اثر کرنے میں ٹائم لگتا ہے شکر کرو کہ تم وقت پر آ گئے۔ اب تم ایسا کرو کہ جب یہاں سے گھر جانا تو آدھ پاؤ گوشت لیتے جانا، رات جب سوئے لگو تو اس کمرے میں جہاں یہ شکایت ہے کسی خالی پلیٹ میں رکھ دینا اور پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے سو جانا۔ رات کو اس کمرے میں بالکل مت جانا۔۔۔ صبح اٹھ کر کمرے میں دیکھنا۔ اگر گوشت اسی طرح پڑا رہے جیسے تم نے رکھا

تھا تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ گھر میں جنت نہیں ہیں کوئی اور مسئلہ ہے۔۔۔ اگر گوشت غائب ہو اور خالی پلیٹ پڑی ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ہیں۔ ٹھیک ہے اب تم جاؤ چیک کرو اور ہاں نمازی خاص پابندی کیا کرو۔“

آصف نے تمام باتیں ذہن نشین کر لیں اور قاری صاحب سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آ گیا اور کام پر لگ گیا۔ شام کا ٹائم اس نے جیسے جیسے کر کے پاس کیا، جب کام سے چھٹی ہوئی تو اس نے گھر آتے ہوئے بازار سے پاؤ گوشت لے لیا اور اپنے پکانے کے لئے اور آدھا کمرے میں رکھنے کے لئے۔ گھر آ کر اس نے اپنی بیوی کو ساری داستان بتائی اور رات کا کھانا کھا کر اس نے ڈرتے ڈرتے گوشت خالی پلیٹ میں رکھ کر کمرے میں ایک جگہ میز پر رکھ دیا اور دل میں ہزار سوچیں لے سو گیا۔

سویرے آئے کچھ چلتے ہی وہ کمرے میں آن وار ہوا۔ اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ پلیٹ میں ذرہ بھر بھی گوشت نہ تھا اور خالی پلیٹ اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں کمرے میں ایک گہری نظر دوڑائی اور پلیٹ اٹھا کر باہر آ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس سے بہانہ کر دیا کہ ”ہوسکتا ہے کوئی وغیرہ گوشت کھا گئی ہو کیونکہ گوشت کو ہم نے ایسے ہی رکھ دیا تھا۔“

اس نے مزید تسلی کے لئے بیوی سے کہا کہ ”ایک مرتبہ گوشت غائب ہونے سے وہ کوئی رات قائم نہیں کر سکتا۔ آج چونکہ جمعہ ہے اور کام سے چھٹی ہے اس لئے میں قاری صاحب کے پاس نہیں جاؤں گا بلکہ آج رات بھر گوشت رکھوں گا اور ایسی جگہ رکھوں گا جہاں بلی وغیرہ نہ پہنچ سکے۔ اگر اگلی صبح بھی یہی حال ہے تو پھر ہفتہ کو تو ویسے بھی کام پر جانا ہے لہذا میں قاری صاحب کو بتلا دوں گا۔“

یہ سن کر بیوی مطمئن ہوئی مگر سارا دن آفت

کے دماغ میں بے شمار پریشانی اور دوسے بننے اور بچنے رہے۔ شام میں وہ بھر گوشت لایا اور اک جگہ سے اوپن جگہ پر پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیا۔ ذرے سے جب اٹھا اور کمرے میں آیا تو پلیٹ اوندمی ہوئی اور گوشت غائب تھا۔ اس نے پھر اسے بلی کا ترشہ ہی کہا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر واقعی جنت ہے کھاتے تو پلیٹ تو ادھر ہی رہتی۔ جنت کے لئے کوئی کام مشکل ہے بھلا۔ بننے والے دن میٹرٹل نہ ہونے کی وجہ سے وہ کام پر نہ جاسکے۔

شام کو وہ بھر گوشت لایا اور اسی طرح کمرے میں رکھ دیا۔ رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا جب اس کی آنکھ ایک ٹھٹکے سے کھلی۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کی چار پائی کے نیچے سے کوئی چھوٹی بکری گزری ہے۔

اس نے تیزی سے نیچے جھک کر دیکھا مگر وہاں بکری تو کیا بکری کا سایہ بھی موجود نہ تھا۔ اس نے تیزی سے ادھر ادھر گردن گھمائی مگر کچھ بھی نہ تھا۔ چاند کی چاندنی میں اسے ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ حقیقت میں ڈر گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس کے دماغ میں خوف کا سحر چھانے لگا۔ اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو بڑے آرام سے چار پائی پر سو رہی تھی۔

وہ تیزی سے اٹھا اور گھڑے میں سے پانی گھاس میں اتر لیا کر ایک ہی سانس میں پی گیا۔ چند لمبے تک وہ اس واقعے پر غور کرتا رہا۔ کسی بھی حالت میں اسے وہ بات قائم نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس نے چار پائی آنکھوں سے بکری کے نیچے کو دیکھا تھا کہ اچانک چار پائی کو گواہ پر اٹھتا ہوا دیکھا پھر چار پائی نیچے آ گئی۔ اس کا دل حلق میں آ گیا تھا اور پسینہ اس کے ماتھے پر ٹپک رہا تھا۔ ”اس سے پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ گوشت کا غائب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی اس کمرے میں کوئی آسب مقبوض ہے۔“

انہی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اس

کی بیوی والی چار پائی تین سے چار فٹ اور پھر ہوا میں بلند ہوئی اور تیزی سے ہوا میں ہی الٹ گئی۔ اس کی بیوی دھڑام سے زمین پر گری تو ایک بھیاںک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ وہ تیزی سے بیوی کی جانب لپکا۔ چار پائی ابھی تک فضا میں اسی طرح سفلت اور اٹلی ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے بھاگ کر بیوی کو زمین سے اٹھایا اور ایک جھٹکے سے چار پائی سے دور لے آیا۔ اس کی بیوی نے ایک ٹھٹک شکاف چیخ ماری اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ رونے لگی۔

اچانک چار پائی دھڑام سے زمین پر گری تو ان دونوں کے منہ سے چیخ نکلی۔ آصف نے بیوی کو اٹھایا اور تقریباً دوڑتا ہوا مکان کے دروازے سے باہر آ گیا۔ اس کا دل خوف سے ایسے اچھل رہا تھا کہ جیسے ابھی باہر نکل آئے گا۔ پسینے سے اس کے سارے کپڑے بھگ چکے تھے۔ وہ بری طرح سے ایسے ہانپ رہا تھا کہ جیسے وہ میلوں کا سفر دوڑ کر طے کر کے آیا ہو۔ اس کی بیوی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ تھر تھر کاہ رہی تھی۔ اس کی پٹلی پٹلی نگاہیں دروازے کی جانب مرکوز تھیں۔ اچانک ان کو برتنوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ برتنوں کے گرنے کی آواز خاصی بلند تھی اور برتن ایسے گر رہے تھے کہ جیسے ان کو کوئی جان بوجھ کر زمین پر پٹ رہا ہو۔

آصف نے بیوی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مکان سے دور لے آیا۔ اس کے کانوں میں برتنوں کے ٹوٹنے کی ہلکی ہلکی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ خوف سے وہ خوشنکاح بھونچکاں رہ گئے تھے۔ ان کی زبان جیسے لنگ ہو گئی تھی۔ ”آؤ۔۔۔ چچا کے گھر چلے ہیں۔“ آصف کے منہ سے مشکل یہی الفاظ ادا ہوئے اور تکین اس سے چٹ کر چلنے لگی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے چچا کے گھر کے پاس تھے۔ وہ تیزی سے گھر میں داخل ہو گئے۔ ان کی بدحوای دیکھ کر گھر والے گھبرا گئے اور پھر چچا بولے۔

”آصف بٹا۔۔۔ تم اس وقت تکین کیا ہوا

خیریت ہے نا۔۔۔؟“

یہ سن کر تین روئے لگی اور چچی کے گلے لگ گئی۔  
تین۔۔۔ تین۔۔۔ ٹپکی کیا ہوا۔۔۔ خیریت تو ہے نا۔۔۔  
اتنی رات گئے۔۔۔ چچی اس کی پیٹھ پر چھکی دیتے ہوئے  
اسے دلا سر دے لگیں۔

”میں تمہارا آپس میں جھگڑا تو نہیں ہوا۔۔۔“  
اب کی بار اس کے چچانے اس سے پوچھا تو آصف  
بول۔۔۔ ”نہیں چچا۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے، کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اتنے میں  
آصف کے چچا زاد بھائی اٹھ گئے اور وہ بھی ان کو اس وقت  
اور تین کو روک دیکھ کر فکر مند ہو گئے اور ان کے ارد گرد  
آنکھیں ملنے ہوئے بیٹھ گئے سب نے ان سے اس  
وقت آنے کی وجہ پوچھی تو آصف نے الف سے لے کر  
ی تک ان کو سب کچھ بتا دیا۔

یہ سن کر سب سکتے میں آ گئے۔ چچی نے آصف  
کو ڈانٹا کہ تم نے ہم کو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اگر تم لوگوں  
کو کچھ ہو جاتا تو پھر۔۔۔

چچانے آصف سے کہا۔ ”صبح ہی صبح ہم قاری  
صاحب کے پاس جائیں گے۔“

رات سکون سے گزر گئی۔ صبح کی نماز پڑھ کر  
چچا اور آصف قاری صاحب کے پاس مناد بھرے  
پہنچ گئے قاری صاحب اس وقت ناشتہ کر رہے تھے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر قاری صاحب نے ان سے اتنی  
صبح آنے کا مقصد پوچھا تو آصف نے ان کو بتایا۔

آپ نے مجھے گھر میں گوشت رکھنے کا کہا تو میں نے  
لگا تار تین دن گوشت رکھا۔ دو دن تو میں نے یہ سمجھا

کہ شاید کوئی بلی وغیرہ کھا گئی ہوگی کیونکہ ہمارے گھر  
اکثر بلی بھی آتی رہتی ہے پھر تیسرے دن رات کو بارہ

بچے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ اور پھر اس نے سارا  
واقعہ سنا دیا۔

”ہوں۔۔۔! تم نے غلطی کی کہ متواتر تین دن  
گوشت رکھا۔ اس سے جنات مشتعل ہو گئے اور انہوں  
نے یہ حال کیا۔ شکر کرو کہ تم لوگ وہاں سے بھاگ گئے

ورنہ تم کو بھی نقصان کا اندیشہ تھا۔ اب معاملہ واقعی  
ہے، ہم گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ میں تمہاری ضرورت مند  
گا۔ تم لوگ تھوڑی دیر بیٹھو۔۔۔ میں ساتھ چلا ہوں۔

”جی۔۔۔ جی ٹھیک ہے۔“ اس کے چچا  
کہا۔ ”کافی ٹیک انسان ہیں۔ اور تم سبکیں  
کرتے ہو نا۔۔۔“

”جی چچا۔“ آصف بولا۔  
تھوڑی دیر بعد قاری صاحب اپنی موٹر سائیکل  
پر اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر واپس گھر کی طرف  
وئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آصف کے گھر کے

تھے۔ قاری صاحب نے آصف سے آسب والا  
پوچھا اور ان سے کہا۔ ”دونوں ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ  
مجھ سے ملنا۔۔۔ اب آپ لوگ جائیں مجھے پڑھنا  
کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا اور انشاء اللہ تمام حالات

تابو میں آجائیں گے۔“ آصف نے اس کمرے  
نشاندہی کی اور وہ چچا کے گھر چلے گئے۔

قاری صاحب کمرے میں کچھ قرآنی آیات  
پڑھتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے نئی آن  
کر کے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر اک چمک

دارتھ لگا کر بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ تک وہ  
الٹی پڑتے رہے۔ پھر اچانک بلب جلنا اور کچھ  
شروع ہو گیا اور چھت والا پتکھا بھی تیز رفتار سے

لگا۔ قاری صاحب جان گئے کہ اب جنات آ گئے  
اور ان کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جنات  
ہزار طریقے سے ان کو ڈرانے اور غل سے باز رہنے

کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور پڑھائی  
ہونے پر جنات مجرموں کی سی صورت بنائے قاری  
صاحب کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

وہ تعداد میں کل چھ تھے۔ ایک مرد تھا ایک  
عورت اور باقی چار بچے تھے۔ قاری صاحب نے ان  
دیکھا اور پھر کمرے کی اس حال کو دیکھا۔ ان جنات

کمرے کی ہر چیز توڑ ڈالی تھی۔ برتن ہر جگہ پھیلے  
پڑے تھے اور ٹوٹے ہوئے تھے۔ کمرے کو دیکھ کر

آپ کا بیٹا نفرت ہوا مگر سلام ہے آپ کے جذبے کو کہ

”مجھے افسوس ہے کہ کینوں کی نادانی کی وجہ سے

آپ کا بیٹا نفرت ہوا مگر سلام ہے آپ کے جذبے کو کہ

آپ کا بیٹا نفرت ہوا مگر سلام ہے آپ کے جذبے کو کہ

آپ کا بیٹا نفرت ہوا مگر سلام ہے آپ کے جذبے کو کہ

آپ نے اسے اللہ کی رضا جانا۔۔۔ میں آپ سے ان کی  
طرف سے دل کی گہرائی سے معذرت چاہتا ہوں۔۔۔

آپ ان کو محاف کر دیں اور میری گزارش ہے کہ اس  
کے بعد آپ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کو کوئی  
نقصان پہنچے باقیہ رہیں۔

”ٹھیک ہے قاری صاحب! ہم حضرت سلیمان  
کی قسم کھاتے ہیں کہ اس کے بعد ان کو کوئی بھی گزند نہیں  
پہنچائیں گے اور آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ

آپ ہم کو اس جگہ سے بے دخل نہ کریں کیونکہ ہم کافی  
عرصے سے یہاں رہتے ہیں ہمارے خاندان کی یادیں  
اس گھر سے وابستہ ہیں۔ خدا کے واسطے ہم پر اتنا کرم تو

لازی کریں۔“  
یہ کہہ کر سب بچے مرد اور عورتیں منت کرنے  
لگے تو قاری صاحب کو ترس آ گیا۔ انہوں نے اس شرط

پر ان کو اس جگہ رہنے دی کہ وہ کبھی بھی کبھی بھی حالت  
میں نہ تو ان کے سامنے آئیں گے اور نہ ہی ان کو اس  
بات کی بھینک بھی پڑنے دیں گے کہ آیا وہ اس گھر کا

حصہ ہیں۔“ قاری صاحب! اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔“  
انہوں نے دعا دی اور پھر وہ سب نظروں سے اوجھل  
ہو گئے۔

قاری صاحب کمرے سے باہر نکلے تو گیٹ پر  
آصف اور اس کے چچا کو اپنا منتظر پایا۔ ”سنائیں قاری  
صاحب۔۔۔ شکر ہے کہ آپ سلامت ہیں۔“ آصف

کے چچانے بے صبری سے کہا۔  
”ہاں۔۔۔ سارا مسئلہ حل ہو گیا، اب تم لوگ  
آرام سے گھر میں رہ سکتے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم کو یہ

میرا وعدہ ہے اور ہاں یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے اسے بھول  
جاؤ۔ اب یہ گھر ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ قاری صاحب

آصف کو ٹپکی دے کر اور خوش خبری سنا کر چل دیئے۔ اس  
کے بعد آصف اور اس کی بیوی اس گھر میں رہنے لگے۔  
مگر کبھی بھی ان کو کچھ نہ ہوا۔

”ہاں۔۔۔ سارا مسئلہ حل ہو گیا، اب تم لوگ  
آرام سے گھر میں رہ سکتے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم کو یہ

میرا وعدہ ہے اور ہاں یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے اسے بھول  
جاؤ۔ اب یہ گھر ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ قاری صاحب

آصف کو ٹپکی دے کر اور خوش خبری سنا کر چل دیئے۔ اس  
کے بعد آصف اور اس کی بیوی اس گھر میں رہنے لگے۔  
مگر کبھی بھی ان کو کچھ نہ ہوا۔

”ہاں۔۔۔ سارا مسئلہ حل ہو گیا، اب تم لوگ  
آرام سے گھر میں رہ سکتے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم کو یہ

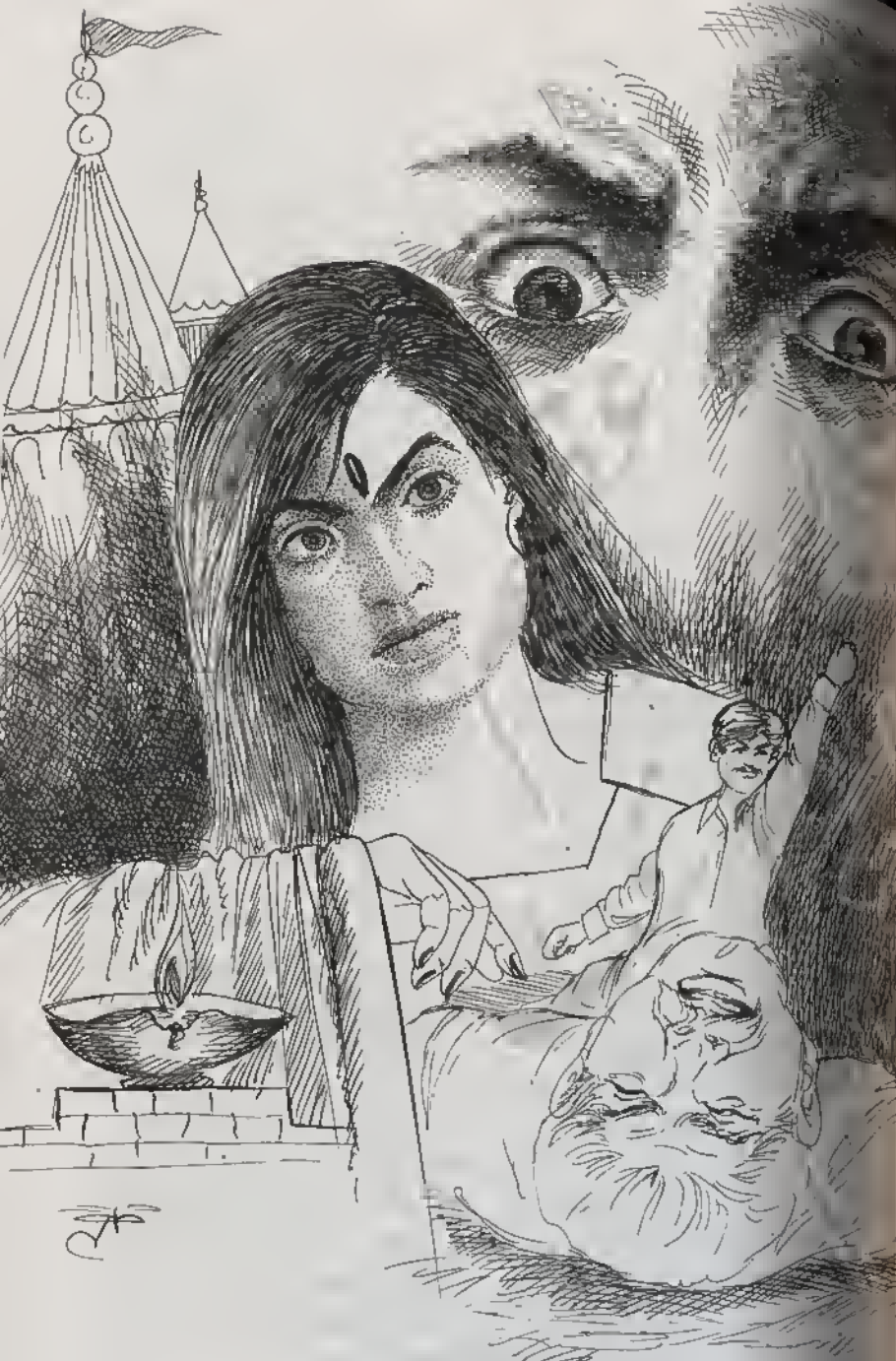
میرا وعدہ ہے اور ہاں یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے اسے بھول  
جاؤ۔ اب یہ گھر ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ قاری صاحب





اجانك لڑكي كو عقب ميں آھٹ محسوس ھوئي اس نہ پلٹ كہ ديكھا تو خوف سے اس پر كپكپي طاري ھوگئي كيونكہ عقب ميں ايك انساني ڈھانچہ كھڑا تھا، اس كى استخواني كھوپڑى گردن كے بجائے اس كے ھاتھ ميں موجود تھي۔

دل و دماغ پروھٹ طاري كرتي رات كے پر ھول ماحول ميں جنم لينے والي ايك خوفناك كہاني



**مقامی** اخبار كے دفتر ميں كام كرتے ھوئے مجھے دوسرا سال تھا۔ ميرى رہائش چو برجى كے قريب واقع آبادى شام نگر ميں تھي جہاں ميں كرائے كے ايك مكان ميں چار ھوتا تھا۔ تنہا اس لئے كہ ميرى ابھي شادي نہيں ھوئي تھي اور والد ميں ملتان ميں رھتے تھے۔ بنيادي طور پر ميں ايك كہاني نو ليس ھوں ليكن اس زمانے ميں مصنف كو اس كى تخليق كا اتنا معاوضہ نہيں ملتا تھا جس سے وہ آسودگى كى زندگى بسر كرتا جبكہ مجھے اپنى شادي كے لئے بھي كچھ رقم جمع كرنا تھي اور گھريلو اخراجات كے لئے والد ميں كو بھي روپے بيجتے تھے۔ اخبار ميں ڈيوٹی دينے كے بعد مجھے جتنا بھي وقت ملتا اس ميں ناول لكھتا تھا۔ ناول نو ليس سے ميں اپنے اخراجات پورے كرتا اور تنخواہ پوري كى پوري گھر بچ ديا كرتا تھا۔

دفتر ميں ميرى ڈيوٹی تديل ھوتى رھتي تھي۔ دسبر ميں ميرى ڈيوٹی شام چھ بجے سے رات دو بجے تيك كى ھوگئي۔ اخبار كا دفتر فاطمہ جناح روڈ پر شاہدين بلڈنگ كے پاس تھا۔ ميرے پاس اپنى سواري نہيں تھي۔ ميں مئي بس كے ذريعے چو برجى چوك سے مزنگ چوگى كے راستے دفتر جايا كرتا تھا ليكن اب مجھے

رات كے دو بجے دفتر سے واپس آنا پڑتا تھا اور اس وقت مئي بس دستياب نہ ھوتى تھي۔ گليل تنخواہ ميں، ميں روزانہ ركشا ٹيكسي كا كرايہ ادا كرنے كا متحمل نہيں ھوسكا تھا۔ اتفاق سے رات كى شفٹ كرنے والے ساتھیوں ميں سے كوئي بھي چو برجى كى طرف رھنے والا نہ تھا۔ ايك دوست فيروز پور روڈ پر سنيما سے كچھ آگے رھتا تھا۔ اس كے پاس موٹر سائيكل تھي مگر اس نے مزنگ چوگى سے اچھرہ كى طرف جانا ھوتا تھا۔ چنانچہ وہ اكثر مجھے مزنگ چوگى پر چھوڑ ديا كرتا تھا وہاں سے ميں پيدل بى چو برجى كى طرف چل ديتا۔ كسي بھي وہ موڈ ميں ھوتا تو مجھے ميرے گھر تيك پہنچا ديا كرتا تھا۔

19 دسبر كى وہ رات ميں آج تيك فراموش نہيں كر سكا۔ اس رات فاضل ڈيوٹی پر نہيں آيا تھا۔ اس نے فون پر دفتر ميں اطلاع كر دى تھي كہ اس كى والدہ شديداً بيمار ھيں۔ ميں پریشان ھوگيا كہ اب مجھے مزنگ چوگى تيك پيدل جانا پڑے گا ليكن ميں نے زيادہ دير تيك پریشانی كودھن پر مسلط نہ رھنے ديا۔ دفتر كے گرم كمرے ميں مجھے معلوم نہ ھوسكا كہ باہر موسم تديل ھو چكا ھے۔ دو بجے شفٹ ختم ھوئي۔ باہر آيا تو آسمان پر بادل چھائے ھوئے تھے اور سرد ھوا ميں چل رہى تھي۔ ميں



نے سوچا آج رکشا کروں لیکن اتفاق سے رکشا بھی نہ مل سکا اور میں پیدل ہی چل پڑا۔

سردہوا کے پیٹروں سے بچنے کے لئے میں نے کوٹ کے کار کھڑے کر کے چہرے پر مظریٹ لیا تھا جبکہ سرپردہوانی ٹوٹی بھی تھی۔ مزگ چوکی پر بھی کوئی رکشا نہ مل سکا۔ حالانکہ عام طور پر وہاں ایک دور کٹے موجود رہتے تھے اور چائے کا ایک اسٹال بھی تین بجے تک کھلا رہتا تھا لیکن آج سردی کی شدت کے باعث اسٹال بھی بند تھا اور پولیس کے وہ سپاہی بھی غائب تھے جو روزانہ وہاں ڈیوٹی دیتے نظر آیا کرتے تھے۔ چوک سے میں چورجی جانے والی سڑک پر آ گیا۔ قبرستان کی حدود شروع ہوتے ہی ہلکی ہلکی بوند باندی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تاکہ بارش تیز ہونے سے پہلے پہلے چورجی کے قریب پہنچ جاؤں اور وہاں بارش سے بچنے کے لئے کسی دکان کے شید کا سہارا لے سکوں۔

سڑک کے دونوں جانب قبرستان تھا۔ ابھی میں نے نصف قبرستان بھی عبور نہ کیا تھا کہ بارش یکدم تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس علاقے کی بجلی بند ہو گئی۔ اسٹریٹ لائٹ بجتے ہی وہاں بہت اندھیرا پھیل گیا۔ میں بائیں جانب کے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ فٹ پاتھ کی دوسری جانب قبریں تھیں۔ کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ تیز بارش ہوا کے پیٹروں کے ساتھ میرے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔ میں ایک اونچی قبر کے سرہانے درخت کے نیچے رک کر بارش کا زور ٹوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ میری آنکھیں اندھیرے سے کچھ مانوس ہو گئی تھیں اور چند قدم تک میں دیکھ سکتا تھا۔

دفعتاً مجھے ہوا اور بارش کے شور میں رونے کی آوازیں سنائی دیں اور میں چونک پڑا۔ وہ آوازیں بائیں جانب قبرستان سے آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی عورتیں تین کر کے رو رہی ہوں۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ لیکن کچھ نہ دکھائی دیا۔ قبرستان میں گھٹے درختوں کے سبب ادھر گہری تاریکی مچی تھی

سو جا کر رات کے ڈھائی بجے تاریک قبرستان میں عورتیں کبھی آئیں اور بارش کے دوران کیوں رو رہی ہیں جبکہ انہیں بارش سے بچاؤ کی تدابیر کرنی چاہیے۔ اگر وہ عورتیں کسی میت کے ساتھ وہاں آئی تھیں تو اس وقت میت کو لانے کی کیا جتنی اور اگر یہ امر عجیبی اسی وقت ہی تدفین ضروری تھی تو عورتوں کو ساتھ لاسنے کی کیا ضرورت تھی۔

رونے کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اب ایک میرے ذہن کے کسی گوشے میں خیال آیا کہ روئے والی بدرو میں تو نہیں یہ خیال آتے ہی مجھ پر یکدم خوف طاری ہو گیا اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اتنے شدید موسم اور تاریکی میں رونے والی بدرو میں ہی ہو سکتی ہیں۔

بارش کم ہونے کی بجائے اور تیز ہوتی جا رہی تھی لیکن اب میں بدروحوں کے خوف سے وہاں ٹھہرا نہ جا رہا تھا۔ میرا لباس بارش سے بھیگ چکا تھا جوتوں میں بھی پانی جمع ہو گیا تھا اور سر سے سرد ہوا کے پیٹروں میری ننگی جمار سے تھے۔ میں نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا اور اسی لمحے بدروحوں کے رونے کا شور یکدم ختم گیا جیسے کسی کھلونے کی چابی ختم ہونے پر کھلوا یکدم رک جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے عقب میں چھپاک چھپاک کی آواز سنائی دی جیسے کوئی پانی میں چل رہا ہو۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا اور چونک پڑا۔

پانچ چھ قدم پیچھے فٹ پاتھ پر پھیلے پانی میں چل ہوا ایک آدمی میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھتری تھی جو اس نے سر پر تان رکھی تھی۔ چھتری کے سائے میں اس کا چہرہ مکمل تاریکی میں پوشیدہ تھا۔ شاید اس نے میری طرح چہرے پر مظریٹ لپیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ اب میں وہاں تنہا نہیں۔ شاید وہ آدمی بھی مزگ چوکی کی طرف سے آ رہا تھا اور اسے بھی کوئی سواری دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ بھی

چورجی کی طرف جا رہا ہے میں اس کے ساتھ چل دوں گا۔ اگر وہ چورجی چوک تک نہ بھی آئے تو قبرستان کے احاطہ پر شروع ہونے والی آبادی میں تو جائے گا۔ وہ آدمی درخت کے نیچے میرے قریب آ کر آدھان زیادہ اندھیرا تھا۔ اس نے شلوار کش کے اوپر سیاہ رنگ کی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ "بہت سردی ہے آج!" وہ ایک لمحے بعد بولا جیسے مجھ سے مخاطب ہو۔ "کجنت بارش نے بھی آج ہی ہوتا تھا۔"

"جی ہاں۔ اوپر سے تیز ہوا نے غضب ڈھا رکھا ہے۔" میں نے اخلافاً کسکراتے ہوئے کہا۔ "میری تو بھلی جی جا رہی ہے۔"

"اوہ۔ آپ تو مکمل طور پر بھیگے ہوئے ہیں۔"

اس کی چونکی ہوئی آواز سنائی دی۔ "جانا کہاں ہے آپ نے؟"

"شام نگر۔ اسلامیہ کالونی میں۔" میں نے بتایا۔

"حیرت ہے کہ آپ چھتری لئے بغیر چل پڑے۔ کہیں آپ اخباری ملازم تو نہیں ہیں؟" اس نے میری نفل میں دبا ہوا بیگ اخبار دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا خیال درست ہے۔ میں اخبار کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔ بنیادی طور پر اسٹوری رائٹر ہوں۔"

"اچھا تو آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔ کمال ہے۔"

وہ ہنسا۔ "مگر یہاں کھڑے کھڑے تو آپ کو نوٹہ ہو جائے گا اور آپ کل نہ ڈیوٹی پر جا سکیں گے اور نہ کہانیاں لکھ سکیں گے۔ بارش کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب رکے۔ فی الحال تو تیز ہوتی جا رہی ہے۔"

"آپ کہاں تک جا رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ مگر فی الحال میرے ساتھ آئیں۔ کسی قبر کے پیچھے کے نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے چھتری میرے اوپر کرتے ہوئے کہا چونکہ بدروحوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں اور وہ شریف ہمدرد بھی میرے ساتھ

تھا، اس لئے میں بلا خوف اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ میرے پہلو میں چل رہا تھا۔ چھتری ہم دونوں کے سروں کو بارش سے بچا رہی تھی۔ ہم قبرستان میں داخل ہوئے تو بجی زمین پر پھنچے ہوئے تھے۔ تاریکی کے سبب مجھے دو قدم سے زیادہ کی چیز نظر نہ آ رہی تھی۔ دس بارہ قدم چل کر میں رک گیا۔

"یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔" میں نے اس آدمی سے کہا۔ "کہاں بیٹھنا ہے۔"

"بس۔ وہ سائے چھپر والی قبر ہے۔ آئیے۔ میرے پیچھے پیچھے آ جائیں۔" وہ قدم بڑھا رہا تھا۔ میں نے سائے دیکھا لیکن مجھے چھپر والی قبر نظر نہ آئی۔ نہ جانے اسے کیسے نظر آ رہی تھی۔ بہر حال میں احتیاط سے اس کے پیچھے قدم اٹھا رہا تھا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔" میں نے چلے چلے پوچھا۔

"کہیں بیٹھتے ہیں۔ پھر تپلی سے تعارف کراؤں گا۔ ناصر صاحب!" اس نے رک کے بغیر کہا۔

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے ذہن کو حیرت کا جھٹکا لگا اور میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اب تک کی بات چیت کے دوران اسے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں نے بارش کے سبب جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ آدمی غائب تھا اور میں بلند چوتھے والی ایک قبر کے سرہانے کھڑا تھا جس کا سفید سنگی کتبہ ہلکا ہلکا دھکا کی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ قبر کے پہلو سے گزر کر میری طرف پہنچ چکا ہے اور تاریکی کے سبب نظر نہیں آ رہا۔

"کہاں چلے گئے جناب۔۔۔" میں نے اسے پکارا۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے گھبرا کر ذرا زور سے اسے آواز دی۔ "بھائی صاحب۔ آپ کہاں ہیں؟"

اس بار بھی اس نے جواب نہ دیا اور دوسرے ہی لمحے ایک بار پھر مجھے بدروحوں کے رونے کا شور سنائی

دینے لگا۔ رونے اور مین کرنے کی پراسرار آوازیں سن کر مجھ پر ایک بار پھر دہشت طاری ہوئی اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں نے بدحواس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن قریب کی قبروں کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میرے اندازے کے مطابق میں سڑک سے وہاں تک تقریباً تیس قدم اندر چکا تھا۔ بدروحوں کے رونے کی آوازیں میرے عقب سے برابر آ رہی تھیں۔ خوف سے میرا بدن لرزنے لگا اور شدید سردی کے باوجود مجھے پسینے آنے لگا۔

”بھائی صاحب.....!“ میں خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں زور سے چیخا۔

لیکن اس اجنبی ہمدرد کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ نجانے وہ مجھے قبرستان کے وسط میں چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بارش کی بوچھاڑ میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ بدروحوں کے رونے کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر دہشت بعد مجھے بائیں جانب کچھ فاصلے پر کسی چراغ کی لودکھائی دی جو تھر تھری رہی تھی۔

”اس طرف آ جائیں مصنف صاحب.....“

”چراغ کی سمت سے اس آدمی کی آواز آئی۔ مجھے اس آواز سے کچھ حوصلہ ہوا اور میں چراغ کی لوکی طرف بڑھنے لگا۔ اونچی نیچی قبروں کے آس پاس گزرتے ہوئے میں نے ابھی خاصے قدموں کا فاصلہ طے کر لیا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ چراغ اب بھی مجھ سے اتنے ہی فاصلے پر تھا جتنے پہلی بار دکھائی دیا تھا۔ بدروحوں کے رونے کا شور مسلسل سنائی دے رہا تھا جیسے وہ بھی روتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں۔ یہ احساس ہونے پر خوف سے میرے قدم بھاری ہو گئے اور پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ میں چلا یا۔ ”ابھی کتنی دور ہو بھائی.....؟“

اس شخص کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور اسی لمحے چراغ کی لو غائب ہو گئی۔ شاید ہوا سے جھج گیا تھا۔ اب میں پھر اندھیرے میں تھا۔ میں نے تاریکی میں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہاں میرے سامنے اور دائیں بائیں کئی درخت ہیں۔ میرے قدموں سے آگے ایک پختہ قبر تھی اور دائیں بائیں بھی قبریں تھیں۔ بدروحوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک بادل زور سے گر جا اور میرے ملنے سے بے ساختہ چیخ نکلی گئی۔ میرے پیچھے پر بدروحوں کے رونے کا شور یکدم بند ہو گیا۔

”یہ نامراد خواہ خواہ ہمارے درمیان آ بیٹا۔“ میرے عقب سے کسی کی غصیلی آواز ابھری۔

اور میری آنکھیں لرزنے لگیں۔ میں نے پلیٹ کر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ حقیقتاً کسی بدروح کی آواز تھی جس نے مجھے نامراد کہا تھا۔ ”ہوسکتا ہے کسی کا مہمان ہو.....“ ایک اور آواز سنائی دی۔

اور خوف سے میری سانسیں رکنے لگیں۔ وہ آواز بھی میرے عقب سے ابھری تھی مگر مجھ میں پلیٹ کر دیکھنے کی طاقت نہ تھی۔

”نامر صاحب۔ ادھر دائیں جانب آ جائیں۔“ ایک دھکوں بعد مجھے اجنبی ہمدرد کی آواز سنائی دی۔

میں نے دائیں جانب دیکھا لیکن ادھر بھی تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے دائیں جانب بڑھا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک زور سے بجلی چمکی اور ایک لمحے کے لئے سارا قبرستان روشنی ہو گیا۔ اس ثانیہ میں میری نظر دو قدم آگے کھڑے اجنبی ہمدرد پر پڑی اور خوف کے مارے پھر میری جی نکل گئی۔ اس شخص کے چہرے سے مظہر ہوا تھا جیسی اس کا چہرہ۔ خدا کی پناہ اتنا خوفناک چہرہ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کسی مردے کا چہرہ تھا۔ گوشت پوست سے محروم وہ کسی انسانی ڈھانچے کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔

اس آدمی کے چہرے پر منہ ناک اور آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے اور کھوپڑی کی ہڈی میں پٹیائی سے ذرا اوپر دراڑ تھی۔ میں نے پلیٹ کر بھاگنے کی کوشش

کی لیکن کچھ میں میرا پاؤں پھسل گیا اور میری پھر چیخ نکلی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ میں منہ کے بل کچھڑ میں گر جا، کسی نے مجھے کمر سے تھام کر گرنے سے بچا لیا۔ حقیقتاً وہ اس اجنبی کے ہاتھ تھے جو مردہ تھا۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ ہاتھ کھڑکیوں کے نیچے تھے۔

”گھبراؤ نہیں یار..... میں یہاں ہوں.....“ مجھے مروے کی آواز سنائی دی اور اس کے استخوانی ہاتھ میری کمر سے ہٹ گئے۔

”خت..... تم..... تم کون ہو.....!“ میں دہشت سے ہکلا یا۔

”میں تمہاری طرح انسان ہوں یار، کوئی بلا تو نہیں۔“ اندھیرے میں مجھے اس کی خوفناک ہنسی سنائی دی۔

”م..... م..... مگر..... تم..... تو..... تو.....!“

میں ہکلا نے لگا۔

”ہاں! میں مروہ ہوں۔ لیکن ہوں تو انسان ہی ہوں۔ وہ دوبارہ ہنسنا۔“ آؤ۔ یہ قریب ہی میرا گھر ہے۔“

ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا ہاتھ اس کے نیچے کی ہڈیوں میں آتا تو میں پوری قوت سے چیخا۔ ”نہیں..... نہیں.....“

اسی لمحے اس نے مجھے اپنی جانب کھینچا اور میرے حواس جواب دے گئے۔ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟ اس کا اندازہ نہیں البتہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بڑی تاریکی میں پایا۔ ظاہر ہے تاریکی میں گھڑی پر وقت نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اور بجلی بات تو یہ ہے کہ دل و دماغ پر چھائی ہوئی دہشت کے سبب مجھے وقت دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ خود کو اندھیرے میں نرم زمین پر پا کر مجھے گزشتہ واقعات یاد آ گئے تھے اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ میں اپنی طرف تک نہ دیکھ سکتا تھا۔ پھر یہ محسوس کر کے میرا خوف اور بڑھ گیا کہ میں خشک زمین پر لیٹا تھا جبکہ قبرستان میں

میرے آس پاس بارش کا پانی اور کچھ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے لباس پر ہاتھ پھیرا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا لباس بالکل خشک تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے نہ بارش ہوئی تھی اور نہ ہی بیچھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن میرے دل نے کہا کہ خواب ہوتا تو میں اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا سو رہا تھا جبکہ میں بجلی زمین پر دراز تھا اور وہاں اندھیرا بھی تھا۔ البتہ مجھے کسی قسم کی کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ نہ بارش اور ہوا کا شور اور نہ بدروحوں کے رونے کی آوازیں۔ وہاں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ میں زمین پر ہتھیلیاں لگا کر اٹھ بیٹھا۔

ٹھیک اسی لمحے بائیں جانب روشنی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس جانب دیکھا اور خوف سے تھر تھر کاہنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چراغ زمین سے پانچ فٹ کی بلندی پر معلق تھا۔ دیہ کیل کا دیا تھا جس کی لوساکت تھی اور وہ تیرتا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا تو دہشت کے مارے میری چیخ نکلی گئی۔ میں اس وقت ایک گہرے اور کشادہ غار میں موجود تھا اور دائیں جانب ایک مردے کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اس کی استخوانی کھوپڑی سے میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی مردہ تھا جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا اور میں خوف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

”ہوش کرو مسٹر ناصر.....!“ اس مردے کے چہرے نے حرکت کی اور آواز سنائی دی۔ ”محموظ جگہ پر ہو.....“

”یہ..... یہ..... کون سی جگہ ہے.....؟“ میں نے یہ ہشکل پوچھا۔

”یہ میرا گھر ہے۔ میری آخری آرام گاہ.....“ مردے نے ہنس کر کہا۔

”م..... مگر..... تم..... تم کون ہو.....“ میں ہکلا یا۔

”آج سے چالیس برس پہلے مجھے آصف کے نام سے پکارا جاتا تھا۔“ مردے کی آواز میں حسرت تھی۔ میں نے خوف کے باوجود حیرت محسوس کی۔ چالیس برس پہلے 1940ء تھا۔ گویا وہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے گردن کھٹا کر چراغ کی طرف دیکھا اور میرے روٹنے لگے کھڑے ہو گئے۔ چراغ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر دکا ہوا تھا لیکن اب وہ ہاؤس میں معلق نہیں تھا بلکہ ایک کفن پوش عورت کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اس نوجوان عورت کا چہرہ برف کی مانند سفید تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے جان تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں اور وہ خود بھی ساکت کھڑی تھی۔ یقیناً وہ کوئی بدروح تھی۔ اسے دیکھ کر ایک بار پھر وحشت کے مارے مجھ پر کچھ بھاری ہو گئی۔

”یہ..... یہ..... کون..... ہے.....؟“ میں مردے کی طرف دیکھ کر خوف سے ٹھکھکیا یا جس نے اپنا نام آصف بتایا تھا۔

مردہ حرکت میں آیا اور اس کی ہڈیاں کھڑکھڑانے لگیں۔ وہ بائیں جانب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور مجھے اس کا گہرا سانس سنائی دیا۔ پھر اس کی آواز گونجی۔

”اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں دوست۔ یہ ایک بدروح ہے جو بہت مدت سے خون کی پیاسی ہے۔“ ”کک..... کیا.....!“ میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز خارج ہوئی۔

”گھبراؤ مت یار..... یہ تمہارا خون نہیں پیئے گی۔“ مردے نے ہنس کر کہا۔ ”یہ تو اپنے دشمن کے خون کی پیاسی ہے جس نے اسے ہلاک کرنے کے بعد چٹا میں جلانے کی بجائے یونہی زمین میں دبا دیا تھا مگر چیلوں اور گدھوں نے اسے مٹی سے نکال کر اپنی غذا بنالیا تھا کیونکہ اسے صرف ایک فٹ کی گہرائی میں دفن کیا گیا تھا اور پہلی رات ہی بارش سے اوپر کی مٹی بہہ گئی تھی بہر حال اس کے بارے میں تمہیں میں بعد میں بتاؤں گا.....“

اس کی بات سن کر میرا خوف کم ہو گیا اور مجھے حیرت ہونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر گردن پیش کا جائزہ لیا اور مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ اسے غار سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔ چھت فرش سے آٹھ دس فٹ بلند تھی اور اس میں جا بجا کڑیوں کے چالے تھے ہوئے تھے۔ کہیں بھی کوئی سوراخ یا شکاف نہ تھا اس کے باوجود وہاں بالکل گھٹن تھی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اسی بات پر تھی کہ میرا بارش میں بھیگا ہوا لباس کیوں کر خشک ہوا تھا۔

”تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے۔“ میں نے ہمت کر کے مردے سے پوچھا۔ ”تمہیں میرے نام کا کیسے علم ہوا۔؟“

”صرف نام.....!“ وہ خوفناک انداز میں ہنسا اور میں کانپ کر رہ گیا۔ ”میں تو تمہارے والدین تک کا نام جانتا ہوں ناصر۔“ مجھے عرصہ سے کسی کہانی نویس کا انتظار تھا۔ تم گزشتہ کئی راتوں سے اس سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ تمہاری خدمات حاصل کی جائیں۔“

مردے کی بات سن کر میری حیرت بڑھ گئی اور میں سوچنے لگا کہ وہ مردہ مجھ سے کسی قسم کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں کتنی دیر سے وہاں موجود ہوں۔ یہ دیکھنے کے لئے میں نے اپنی رست وراج پر نظر ڈالی لیکن اس کی سونیاں ساکت تھیں۔ وہ پونے تین بجے سے بندھی۔ میں نے مردے سے وقت کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن وہ خود ہی بول پڑا۔

”مرنے کے بعد وقت کی کوئی پہچان اور اہمیت نہیں رہتی مسٹر ناصر..... اس لئے تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہئے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو.....؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم میری آپ بیتی لکھو اور شائع کراؤ تاکہ پڑھنے والوں کو عبرت حاصل

”مردے نے کہا۔“ ”وہ! میرے پاس تو کاغذ نہیں ہے۔“ میں نے چونک کر کہنے لگا۔ ”کھرجا کر لکھ لینا یار.....!“ اس نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

”نی الجال یہ توجہ سے سن لو۔ پھر کاغذ پر منتقل کر لینا۔“

”کیا تمہاری آپ بیتی کا شائع ہونا ضروری ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں۔ اس کی اشاعت تمہارے لئے مشکل تو نہیں ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”جب تمہارے بھوٹے ہال کہانیاں شائع ہو سکتی ہیں تو میری آپ بیتی تو پھر بھی سو فیصد جچی ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو مطمئن رہو۔ میں تمہارے وقت کی پوری پوری قیمت ادا کروں گا۔ پبلیشر سے ملنے والے معاوضہ سے کئی گنا زیادہ معاوضہ دوں گا۔ لیکن تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تم کسی قطع قلم پر یہ ادا نہ سنانے کے بغیر صرف وہی لکھو گے جو میں تمہیں بتاؤں گا۔ ورنہ تمہیں مناف نہیں کیا جائے گا۔؟“

اس کی دھمکی سن کر میرا دل لرزنے لگا۔ میں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”بہتر۔ لیکن میرا لباس کیسے خشک ہوا.....“

”ان چکروں میں دماغ مت الجھاؤ میا۔“ اس کے لہجے سے ناگواری محسوس تھی۔ ”توجہ سے میری بات سنو اور دماغ میں محفوظ کرتے جاؤ۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے چراغ والی کفن پوش بدروح کی طرف دیکھا اور خوف زدہ ہو کر دوبارہ مردے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہنے لگا۔

”آج سے چالیس سال پہلے میری عمر تیس برس تھی اور میں سنت نگر میں رہتا تھا۔ ہمارے پڑوس میں کئی ہندو خاندان آباد تھے۔ محلے میں ان کی دکانیں تھیں۔ میں کنوارہ تھا اور محلے کی ایک ہندو دھندیزہ راکھی سے بیاہ کر رہا تھا۔ راکھی بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میرے

والدین بھی راکھی کو پسند کرتے تھے لیکن راکھی کے والدین کڑی قسم کے ہندو تھے۔ اس لئے جب انہیں راکھی اور میری محبت کا علم ہوا تو وہ میرے دشمن بن گئے لیکن علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت کے سبب وہ مکمل کر دہشتی نہ کر سکتے تھے۔ میں ان دنوں پنجاب لاہوری میں کلرک تھا اور راکھی گلرز کا بیج ایف اے کی طالبہ تھی۔ ہم دونوں کی ملاقات بس اسٹاپ پر ہوتی تھی۔

لیکن راکھی اور میری محبت کا علم ہونے پر اس کے والدین نے راکھی کو کلرک سے ہٹالیا اور اس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی بہانے دوسرے تیسرے روز مجھ سے مل لیتی۔ ان خفیہ ملاقاتوں کا بھی اس کے والدین کو علم ہو گیا۔ تب انہوں نے شام لال سے ساز باز کر کے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ شام لال سنت نگر میں ہندوؤں کے مندر کا پروہت تھا۔ اس کے پاس بڑی شیطانی طاقتیں تھیں اور ہندو اسے بہت بڑا جادوگر سمجھتے تھے۔

ایک دن راکھی کا والد میرے دفتر آ کر مجھ سے ملا۔ میں نے اخلاقیات کی خوب آؤ بھگت کی۔ وہ بڑی دکاری سے کہنے لگا۔

”آصف۔ تم بہت اچھے نوجوان ہو۔ میں تمہارے اخلاق سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ راکھی تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن میں اپنے مذہبی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتے تو تمہیں تھوڑی سی قربانی دینا پڑے گی۔“

میں نے جوش میں آ کر کہا کہ۔ ”میں راکھی کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ جان دے کر تم کیسے شادی کر سکو گے۔ اس کے لئے تمہیں اپنے مذہب کی قربانی دینا پڑے گی۔ تمہیں ہندو بننا ہوگا۔“

میں نے دل میں سوچا۔ اگر میں کچھ دنوں کے لئے ہندو بن جاؤ تو کیا حرج ہے۔ شادی کے بعد دوبارہ مسلمان بن جاؤں گا۔



”ٹھیک ہے۔ میں راکھی کی خاطر مذہب تبدیل کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ میں نے ایک لمحہ بعد کہا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ میں نے مندر کے پروہت سے بات کی ہے۔ تمہیں اس کے پاس جانا ہوگا لیکن اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ تمہارے والدین اور رشتہ دار کبھی بھی پسند نہیں کریں گے کہ تم اپنا دین تبدیل کرو۔“

”آپ بے فکر ہیں۔ میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے جواباً کہا۔ ”کیا مذہب تبدیل کرنے کے لئے کوئی خاص طریقہ کار ہے؟“

”ہاں۔۔۔ اسی میں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ تم یوں کرو کہ دفتر سے آج ہی ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔ رات دس بجے تم مندر چلے جانا اور وہاں شام لال پروہت سے ملنا۔ لیکن اپنے گھر میں یہ بتانا کہ تم سرکاری کام سے ایک ہفتے کے لئے پشاور جا رہے ہو۔۔۔۔۔“

یہ ہدایات دینے کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ آخر کار میری دلی تمنا پوری ہو گئی اور راکھی کے والدین راضی ہو گئے۔

میں نے اسی روز دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی اور گھر آ کر بتایا کہ میں سرکاری کام سے ایک ہفتے کے لئے پشاور جا رہا ہوں۔ پھر رات کے ساڑھے نو بجے میں ایک بریف کیس میں کپڑوں کے دو جوڑے رکھ کر گھر سے نکل آیا۔ سردیوں کا موسم تھا اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ میں ہندوؤں کے مندر پہنچا تو مندر کا دروازہ بند تھا۔ دستک دینے پر ایک بچاری نے دروازہ کھولا۔

”مجھے مہاراج شام لال سے ملنا ہے۔ میرا نام آصف ہے۔“ میں نے بچاری کو بتایا۔

”آؤ۔۔۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ بچاری نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

میں اندر داخل ہوا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

مندر میں اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ بچاری مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ پوچھا والے ہال کمرے کے بائیں جانب مڑنے کے بعد ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں مندر کا بڑا بچاری یا پردہیت شام لال موجود تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بچاری کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔

”ہاں! تو تم راکھی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔“ بچاری نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”مذہب کی تبدیلی کے لئے تمہیں چھوٹا سا سفر کرنا پڑے گا۔ کیا تم تیار ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں اسی مقصد کے لئے تو آیا ہوں پنڈت جی۔۔۔۔۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کہاں جانا ہوگا؟“

”کوٹ رادھا کشن۔۔۔۔۔!“ وہ بولا۔ ”وہاں سونا گھاٹ پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔“

”سونا گھاٹ؟ کیا وہاں دھوبی کپڑے دھوتے ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بالکل۔ وہ ہندوؤں کا بہت پرانا مرگھٹ ہے۔ کوٹ رادھا کشن کی مغربی سمت میں آبادی سے ایک میل کے فاصلے پر۔“ اس نے بتایا۔

”بہت بہتر۔۔۔۔۔ آپ کب آئیں گے اور مجھے کس وقت جانا چاہئے؟“

”تم ابھی رات نہ ہو جاؤ۔ بارہ ایک بجے تک پہنچ جاؤ گے۔ رات وہاں کے مندر میں گزار لینا یا کسی مسجد میں۔ مندر میں جاؤ تو وہاں کے مہا بچاری کو میرا حوالہ دینا، وہ تمہیں مندر میں ٹھہرائے گا۔ کل رات ٹھیک نو بجے سونا گھاٹ کے مرگھٹ پہنچ جانا۔ میں سیدھا وہیں آؤں گا۔“

میں اس کی ہدایات لے کر وہاں سے چل پڑا۔ لاری اڑے پہنچ کر میں نے کوٹ رادھا کشن جانے والی بس پکڑی جس نے ساڑھے بارہ بجے مجھے

منزل پر پہنچا دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مندر کہاں ہے۔ اس وقت سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے اور گلیاں سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ وہاں مجھے کوئی شخص نہ ملا جس سے میں مندر کا پتہ پوچھتا۔ چنانچہ میں نے مسجد میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا جو مجھے اتفاقاً نظر آئی تھی۔ مسجد میں اس وقت پیش امام کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی اپنے حجرے میں سو رہا تھا۔

میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور مسجد کے ایک کونے میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ جلد ہی مجھے نیند آگئی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے مجھے پیش امام نے جگایا اور مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں اپنے ایک عزیز سے ملنے آیا تھا لیکن تاریکی کے سبب اس کا گھر تلاش نہیں کر سکا تھا اس لئے یہاں آ کر سونگیا۔ اب دن کے اجالے میں ان کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔۔۔“

اسے مطمئن کرنے کے بعد میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرا بریف کیس امانتاً اپنے پاس رکھ لے، عزیز کا گھر تلاش کرنے کے بعد لے جاؤں گا۔ بریف کیس پیش امام کے حوالے کرنے کے بعد میں مسجد سے روانہ ہونے لگا تو پیش امام نے کہا۔

”بیٹا۔ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ نماز تو پڑھ لو۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں ہر نماز یہ سوچ کر ادا کرتا ہوں کہ شاید یہ میری آخری عبادت ہو۔“

میں رک گیا۔ میں نے وہاں جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی لیکن نماز کے دوران میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا کہ میں اپنے خدا کو چھوڑ کر ہندوؤں کے دیوتاؤں کا بچاری بننے والا ہوں۔ بہر حال نماز کے بعد میں مسجد سے لاری اڑے پر آیا۔ وہاں ہول مکمل چکے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نو بجے تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر سارا دن آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا۔ رات آٹھ بجے میں نے ہوٹل سے کھانا کھایا اور قصبے سے باہر نکل آیا۔

میں مغرب کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک میل کے فاصلے پر سونا گھاٹ کا قدیم مرگھٹ تھا۔ دن کے وقت میں نے قصبے کے ایک ہندو کا مندر سے اس مرگھٹ کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ سوڑھ سوڑھ سال پرانا مرگھٹ تھا جہاں ہندو اپنے مردے جلایا کرتے تھے مگر پچیس پچیس برس پہلے قصبے کے قرب مشرق کی طرف نیا مرگھٹ بن گیا تھا۔ اس کے باوجود مغربی سمت چھتے گاؤں سونا گھاٹ کے قریب پڑتے تھے، وہاں کے ہندو اب بھی اسی مرگھٹ پر اپنے مردوں کی چتا جلاتے تھے۔

میں آرام آرام سے چلتا ہوا ساڑھے آٹھ بجے ہی سونا گھاٹ کے مرگھٹ پہنچ گیا۔

سردیوں کی تاریک رات میں سونا گھاٹ کا مرگھٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں چلتا ہوا میں اس چوترے کے قریب جا پہنچا۔ جہاں مردے کے لئے چتا جلائی جاتی تھی۔

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور میرے اعصاب پر انجانا سا خوف طاری ہونے لگا۔ میرے چاروں طرف دور تک جلی ہوئی ہڈیوں کے ادھم ادھم ٹپکے پھیلے ہوئے تھے، فضا میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید ایک دو دن پہلے وہاں کسی کی چتا جلائی گئی تھی جس کی سڑاؤ ابھی تک باقی تھی۔ میں نے ناک پر درمال باندھ لیا اور سردی سے ہاتھوں کو ٹھنکھانے سے بچانے کے لئے ہاتھ کوٹ کی میٹھیوں میں ڈال لئے۔

شام لال نے نوبت وہاں آنا تھا اور ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے وہاں بیٹھنے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہ تھی چنانچہ میں دقت گزارنے اور سردی کا احساس زائل کرنے کے لئے ٹھیلے لگا لیکن چندہرے پس منٹ بعد ہی شلوار میں میری ٹانگیں بری طرح ٹھنکھانیں اور میں تھکاوٹ محسوس کرنے لگا نوبت تو میں بے تاب سے قصبے کی طرف دیکھنے لگا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساڑھے نو بج گئے اور شام لال نہ آیا تو مجھے



دروازہ کھل گیا اور اندر بالکی بنکی روشنی دکھائی دی لیکن دروازہ کھولنے والا کوئی نہ تھا۔ شام لال نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

”تم اندر جاؤ۔۔۔۔۔۔ تین کمرے چھوڑ کر چوتھے کمرے میں داخل ہو جانا۔ وہاں تمہیں جو کچھ پینے کو دیا جائے، خاموشی سے پی لیتا۔ پھر دیو کی پاؤں پر سر رکھ کر اپنے کچھلے گناہوں کی معافی مانگنا۔ جب تک دیو یہ تمہیں معاف نہ کر دے کمرے سے باہر نہ آنا۔“

اس کی ہدایت سن کر میں سمجھ گیا کہ اب میرا مذہب تبدیل ہونے والا ہے۔ دیو سے گناہوں کی معافی مانگنے کا مطلب تھا کہ میں اس کا بچاری بن گیا ہوں اور اسے خدا تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے شام لال سے کہا۔

”پنڈت جی۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو تو آپ اصلاح کر دیں۔“

”بے فکر ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں گا۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”لیکن چونکہ مذہب تم نے تبدیل کرنا ہے۔ اس لئے پہلے تم تنہا اندر جاؤ گے۔ مندر کا بچاری تمہاری رہنمائی کرے گا۔“

”وہ اندر کس جگہ ملے گا۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے چوکتے ہوئے پوچھا۔

”پوچھا پاؤں والے کمرے کے باہر وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ شاہاں۔۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔۔“

میں نے طویل سانس لیا اور پلٹ کر اس غار کی طرف دیکھا جس سے گزر کر ہم یہاں پہنچے تھے لیکن مجھے شدید حیرت ہوئی۔ وہاں کوئی غار یا نیلہ نہیں تھا۔ دور تک

ناہوار میدان دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے وہ غار کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اسی لمحے شام لال نے سختی سے کہا۔

”جاؤ نا۔ دیر ہو رہی ہے۔“

میں حیرت و خوف میں مبتلا آگے بڑھا اور مندر کے زینے چڑھ کر دروازے پر پہنچ گیا۔

مندر میں داخل ہو کر میں دو قدم ہی چلا تھا کہ

پچھلے سے دروازے کی چڑھا ہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور گھبرا گیا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہاں ایک انسانی ڈھانچا کھڑا حرکت کر رہا تھا۔ شاید اسی نے

دروازہ بند کیا تھا۔ اسے دیکھ کر خوف سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے سہم کر سامنے دیکھا۔ یہ

ایک راہداری تھی جس میں دائیں بائیں کمروں کے دروازے بند نظر آ رہے تھے۔ آگے جا کر راہداری

بائیں جانب مڑتی تھی۔ میں لرزے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ راہداری کے موڑ پر ایک طاقتور میں دیا مثل

رہا تھا کمرہ موڑ کی دوسری جانب تھا۔ میں خوف زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا موڑ کی دوسری جانب

پہنچا لیکن ادھر کا منظر دیکھتے ہی خوف کے مارے میری چیخ نکلی گئی۔ سامنے ایک بڑے سے دروازے کے باہر

کف نمالاس میں ایک انتہائی کمزور شکل کا بوڑھا کھڑا میری طرف سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس

کے گھٹے سر پر بالوں کی چکی لیٹ اس کے دائیں کان کے قریب لٹک رہی تھی اور گلے میں سیاہ رنگ کا پتلا

مگر لباس ہار کی طرح موجود تھا لیکن وہ سانپ زندہ تھا اور کلپار رہا تھا۔

شام لال نے کہا تھا کہ مندر کا مہا بچاری میرا منتظر ہوگا۔ یقیناً وہی مہا بچاری تھا۔ میں خوف زدہ ہو کر رک گیا۔

”آؤ نئے بچاری۔ نیا دھرم مبارک ہو۔“ اس کے کمزور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ابھرتی۔

میں خوف سے لرزتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے پلٹ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور پلٹ کر

مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈگمگاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ہال کمرہ تھا۔ طاقتور میں دیئے جل

رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی سنہری کرسی پر دیو کی بابت رکھا تھا جس کے کئی ہاتھ تھے۔

کمرے میں لوہان کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بائیں جانب ایک گائے کا مجسمہ کھڑا تھا۔ اس کی پچھلی دونوں

ناٹگوں کے درمیان فرش پر مٹی کا ایک پیالہ رکھا تھا۔

میرے اندر آتے ہی پراسرار قسم کی آوازیں بلند ہوئی۔ وہ آوازیں چاروں طرف سے آرہی تھیں۔ لگتا تھا بہت سے لوگ سمجھ جا رہے ہیں لیکن وہاں

مہا بچاری اور میرے سوا کوئی ڈی روح موجود نہ تھا۔ میں دہشت زدہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ

لے رہا تھا۔ مہا بچاری گائے کے مجسمے کے قریب پہنچا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔ پتھر کی بنی ہوئی گائے پیشاب کر رہی تھی اور وہ پیشاب نیچے رکھے

ہوئے پیالے میں گر رہا تھا۔ پیالہ بھر گیا تو بچاری نے گائے کی پشت سے ہاتھ ہٹایا اور اس کا پیشاب گزنا بند

ہو گیا۔ بچاری نے جھک کر پیشاب سے بھرا پیالہ اٹھایا اور میرے قریب آ گیا۔

”بچاری! یہ پاک امرت پی لو اور دیو کی قدموں میں جھک جاؤ۔“ اس نے پیالہ میری طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے کھن آنے لگی۔ گائے کا پیشاب میں کیسے پی

سکتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں نے دروازے کی طرف رخ کیا لیکن ادھر دیکھ کر میری

ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی شدید سرد لرہ دوڑ لگی۔ وہاں ایک انسانی ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اس کے استخوانی ہاتھ میں

ایک زندہ سیاہ ناگ کلپار رہا تھا۔ آنکھوں کے گڑھے تاریک تھے لیکن اس کا چہرہ میری جانب تھا جیسے وہ مجھے

دیکھ رہا ہو۔ ”بچاری۔ پاک امرت پی لو۔ اس سے تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔“ مہا بچاری نے دوبارہ کہا۔

لیکن میں نے اب بھی کوئی حرکت نہ کی۔ خوف سے میرا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میں گائے کا پیشاب

نہیں پینا چاہتا تھا۔ میں نے صرف راکھی کو حاصل کرنے کے لئے مصنوعی طور پر مذہب تبدیل کرنے کا سوچا تھا

لیکن گائے کا پیشاب پینے سے میں مستقل طور پر ہندو بن جاتا۔

”لو۔۔۔۔۔۔ تم اسے اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔۔۔۔۔۔“

بچاری نے پیالہ ڈھانچہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بچاری!“ اس ڈھانچے کی کڑکٹی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ”پاک امرت پینے سے انکار کرنا باپ ہے۔

نہیں پیو گے تو میرے جیسا بن جاؤ گے۔ خوشی پی جاؤ ورنہ دیو کی تم سے ناراض ہو کر تم پر اپنا قہر نازل

کر دے گی۔۔۔۔۔۔“ مہا بچاری نے دوبارہ پیالہ میرے چہرے کی

طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”پی لو نا میرے بچے!“ میں نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اس پر

ڈھانچا میری طرف بڑھتا ہوا غرایا۔ ”ٹھہرو! اس کی گردن دیو چٹا ہوں۔۔۔۔۔۔“

اس کے ساتھ ہی وہاں روشنی پھیل گئی۔ ایک لمحہ کے لئے میری آنکھیں چندھیا سی

گئیں۔ پھر مجھے آس پاس کا منظر دکھائی دینے لگا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں اس وقت ایک کمرے میں

موجود تھا اور سنت مگر کے مندر کا مہا بچاری شام لال میرے سامنے کھڑا کمزور انداز میں مسکرا رہا تھا۔ کمرے

میں اس کے غلام موہن کی کھوپڑی ہوا میں معلق تھی اور اس کی آنکھوں سے خارج ہونے والی روشنی میرے

سینے پر پڑ رہی تھی۔ ”تم ہندو بن چکے ہو آصف!“ شام لال نے مجھے مخاطب کیا۔ ”آج سے تمہارا نام شکر ہے۔“

”کیا اب راکھی سے میری شادی ہو جائے گی پنڈت جی۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔۔۔۔۔۔ وہ بولا۔۔۔۔۔۔ راکھی کو حاصل کرنے کے لئے

تمہیں کچھ عرصہ یہاں گزارنا ہوگا۔“ ”یہ کون سی جگہ ہے۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سنت مگر کا مندر ہے۔ دیوتاؤں نے تمہیں اپنی طاقت سے یہاں پہنچایا ہے۔“ اس نے بتایا۔

اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ”کیا واقعی؟“ ”میری بات پر شک کرنا گناہ ہے شکر۔۔۔۔۔۔“

شام لال نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ دیو نے



جہیں میری غلامی میں دیا ہے۔ میں نے اس سے معذرت کی اور کہا۔ میں رانگی سے لٹنے کیلئے بے قرار ہوں پنڈت جی، مجھے اس سے ایک بار تو ملو دیں۔ ”انتظار کرو؟ وہ بولا۔“

”اس کمرے میں تمہیں چلے کاٹنا ہے۔ چالیس دن تک تم یہاں سے باہر نہیں جاسکو گے۔ اس دوران اگر تم نے کمرے سے نکلنے کی کوشش کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ جہیں یہاں کھانا ملتا رہے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے موہن کی کھوپڑی کی طرف دیکھا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”موہن!“

”کیا حکم ہے میرے آقا۔۔۔؟“ کھوپڑی سے آواز خارج ہوئی۔

”شکراب تمہاری قبول میں ہے۔ اس کی نگرانی کرنا اور اسے باہر نہ جانے دینا۔“ شیام لال نے اسے حکم دیا۔

”بہت بہتر میرے آقا۔۔۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔“ کھوپڑی سے آواز آئی۔

تب شیام لال پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ کمرے کے فرش پر ایک دری پھیٹی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ موہن کی کھوپڑی سے نکلنے والی روشنی میں میں نے وقت دیکھنے کے لئے اپنی رست واپس پر نظر ڈالی تو وہ بندی تھی۔ اسی لمحے کھوپڑی کی آنکھیں بچھ گئیں اور کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ مجھے ہنسنے بیٹھے نیند آنے لگی اور میں دری پر لیٹ کر سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میرے قریب ہی کھانا اور پانی کا پیالہ رکھا تھا۔ کھانا دیکھ کر مجھے شدید ہلکے کا احساس ہوا۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا تھا۔ شاید باہرون ہو چکا تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور پانی پیا۔ لیکن نہ جانے کھانے میں کیا اثر تھا کہ دو منٹ بعد مجھے دوبارہ نیند آنے لگی اور میں پھر سو گیا۔ دوبارہ بیدار ہوا تو میرے قریب تازہ کھانا رکھا تھا۔ میں نے کھانا کھایا جس سے مجھے دوبارہ نیند آگئی۔

نجانے کتنا عرصہ گزر گیا۔ میں جب بھی بیدار ہوتا۔ تازہ کھانا موجود ملتا اور اسے کھانے سے مجھے دوبارہ نیند آ جاتی۔ میری گھڑی بند تھی اور مجھے ہمیشہ یہی احساس ہوتا کہ باہر دن کا وقت ہے جس کے سبب کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا ہے۔ ایک بار بیدار ہونے پر میں نے کمرے سے نکلنے کا ارادہ کیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسی لمحے دروازے کے پاس موہن کی کھوپڑی نمودار ہوئی۔

”خبردار شکر۔ باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں رحم نہیں کروں گا۔“ اس سے آواز خارج ہوئی۔

اور میں خوف زدہ ہو کر واپس دری پر جا بیٹھا۔ موہن کی کھوپڑی عتاب ہو گئی۔ میں اپنی بے بسی پر کڑھتا ہوا کھانا کھانے لگا۔

میں نے دوبارہ کمرے سے باہر جانے کی کوشش نہ کی۔ میری شیو بڑھی جارہی تھی اور جب میری داڑھی میرے سینے تک لمبی ہو گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کمرے میں مجھے کئی ماہ گزر چکے ہیں میں نے ایک بار پھر کمرے سے نکلنے کی کوشش کی لیکن موہن کی خوفناک کھوپڑی نمودار ہو گئی اور اس کی دھمکی سن کر میں مزید کئی ماہ تک باہر نکلنے کی کوشش نہ کر سکا۔ اس دوران مسلسل وہاں قید رہنے سے میرا جسم کمزور ہوتا چلا گیا۔ ہڈیاں نکل آئیں لیکن اعصابی کمزوری محسوس نہ ہوئی۔ شاید اس کھانے کی تاثیر تھی جو مجھے کمرے میں ملتا تھا۔

ایک دفعہ میں بیدار ہوا تو حسب معمول کمرے میں کھانا موجود نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اسی لمحے مجھے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں کنفن میں لپٹی ہوئی ایک روح کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا اور پھر میرے حواس پر خوف طاری ہونے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ بدروح کمرے میں کیوں آئی ہے۔ بدروح میری طرف بڑھی تو میں خوف سے چیختا ہوا اٹھ کر بھاگا اور کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ میرے بدن پر دہشت کے مارے کچکی طاری ہو گئی۔

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں میرے محبوب۔“ بدروح نے اپنی جگہ رک کر بڑے پیار سے مجھے مخاطب کیا۔

اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ آواز مجھے شناسا محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کنفن میں پوشیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ دوبارہ میری طرف بڑھی۔

”ٹھنک۔۔۔۔۔ ٹھنک۔۔۔۔۔ ٹھنک۔۔۔۔۔!“ میں چیخا۔ ”کون۔۔۔۔۔ ہوتا۔۔۔۔۔!“

”میں تمہاری رانگی ہوں آصف۔“ بدروح نے رک کر کہا۔

اور چہرے سے کنفن کا پلو ہٹا دیا۔ اس کی شکل دیکھ کر میں چکر گیا۔ وہ خوبصورت چہرہ رانگی کا ہی تھا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ شیام لال کی کوئی شیطانی حرکت نہ ہو۔ وہ دوبارہ میری طرف بڑھی۔

”تم رانگی نہیں ہو۔۔۔۔۔ وہ تو زندہ ہے۔ تم بدروح ہو۔۔۔۔۔“ میں چلایا۔

”تم دو سال سے یہاں قید ہو۔ تمہیں کیا پتہ کہ باہر کیا کچھ ہو چکا ہے؟“ وہ مسکرائی۔ ”شیام لال نے تمہیں دھوکا دیا۔ تمہاری گمشدگی کے ایک ہفتہ بعد مجھے میرے والدین نے بتایا کہ تم ہندو بن چکے ہو اور شیام لال کی قید میں ہو۔ اس پر میں بہت چیختی چلائی میرے والدین نے بتایا کہ تم نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا ہے تاکہ میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے انہیں راضی کر سکو، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے والد نے تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لئے کوئی چکر چلایا ہے۔ میں نے ان سے بغاوت کر دی کہ وہ جب تک مجھے حقیقت نہیں بتائیں گے، میں ان کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔ وہ میری شادی اپنے خاندان کے ایک لڑکے سے کرانا چاہتے تھے جو بہت بڑا تاجر تھا میری ضد دیکھ کر میری ماں نے یہ راز بتایا کہ میرا باپ تم سے ملنے تمہارے دفتر گیا تھا اس نے مہا بچاری شیام لال کو بھاری نذرانہ دے کر اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ

آصف کو کچھ عرصہ کے لئے غائب کر دے۔

میں نے اپنے باپ سے کہا کہ مجھے اس کی سازش کا علم ہو چکا ہے اور میں شادی کروں گی تو آصف سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔ میں تمہارے والدین کو حقیقت حال سے باخبر کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے مکمل طور پر گھر میں قید کر دیا گیا۔ ادھر میرے رشتے کے امیدوار تاجر کا تقاضہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جلد شادی کی جائے۔ میرے والد تاجر کی دولت حاصل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا اور پھر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ تب میں نے اپنی نئی شرط بتائی کہ مجھے ایک ہفتہ کے لئے آزادانہ سوچنے کی مہلت دی جائے اور میری نظر بندی ختم کر دی جائے۔ والد کو خدشہ تھا کہ بھاگ جاؤں گی یا تمہارے والدین کو صورت حال سے مطلع کرنے کی کوشش کروں گی لیکن میں نے انہیں یقین دلانے کے لئے دیوی کی قسم کھائی۔ والد کی حد تک مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اس شرط کے ساتھ میری نظر بندی ختم کر دی کہ میں ان کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جاؤں گی اور کسی اہم ضرورت سے باہر جانا لازمی ہو گیا تو ایک مسلح محافظ میرے ساتھ ہوگا۔

دو دن بعد میں نے خریداری کا بہانہ کر کے والد سے باہر جانے کی اجازت مانگی اور انہوں نے اپنا ایک آدمی میری نگرانی کے لئے ساتھ بھیج دیا۔ میں تانگے میں اتار کر کی طرف روانہ ہوئی لیکن میرے ارادے اور تھے۔ اتار کر چوک پر اتارے ہی میں دوڑ کر مسلم مسجد میں گھس گئی اور پیش امام سے درخواست کی مجھے مسلمان بناوے۔ اس نے مجھے کلمہ پڑھایا اور میں مسلمان ہو گئی۔ اتنے میں میرا محافظ بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں اس کے ساتھ واپس گھر آئی۔ والد نے پوچھ گچھ کی تو میں نے کہا۔

”میں مسلمان ہو چکی ہوں۔ اب میں کسی ہندو سے شادی نہیں کر سکتی۔“

میرے والد نے کہا کہ مذہب صرف کلمہ پڑھ

لینے سے تبدیل نہیں ہو جاتا اور مسلمان ہو جانے کے باوجود میری آصف سے شادی نہیں ہو سکے گی کیونکہ وہ ہندو بن چکا ہے۔ میرے امیدوار تاجر کے والدین کو میرے مسلمان ہونے کا پتہ چلا تو انہوں نے میرا رشتہ لینے سے انکار کر دیا اور اپنے بیٹے کی کہیں اور شادی کر دی۔ میرے والد نے مجھے اپنے مذہب پر لانے کے لئے شام لال سے بات کی اور شام لال نے انا سے کہا کہ ایک جفتے کے لئے مجھے اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ چنانچہ مجھے مندر پینچا دیا گیا یہاں شام لال نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔

شام لال نے مجھے مندر کے تہ خانے میں قید کر دیا اور اپنی شیطانی خواہشات پوری کرنے کے لئے مجھے اپنی پراسرار طاقتوں سے ڈرانے کا حکم شروع کر دیا لیکن میں نے تہہ کر لیا تھا کہ اس کے ناپاک عزائم پورے نہیں ہونے دوں گی۔ مسلمان ہونے کے بعد میں نے گھر کی ایک نوکرانی کے ذریعے نماز کی کتاب منگوائی تھی پاکت ساڑ کی وہ کتاب میں نے اپنے لباس میں چھپا رکھی تھی اس میں نماز کے علاوہ چند صورتیں اور کچھ وعامیں بھی تھیں۔ تہہ خانے کی تنہائی میں پوری کتاب میں نے یاد کر لی اور میرا خوف دور ہو گیا۔ میں وقت بے وقت نماز پڑھتی رہتی مجھے رات اور دن کا پتہ نہ تھا۔

شام لال دوسرے تیسرے روز آتا اور مجھے گناہ کی ترغیب دیتا لیکن میں نفرت سے تھوک دیتی۔ مجھے ڈرانے و بھگانے کے لئے اس نے انسانی ڈھانچوں اور مردوں کو بھینچنے کا سلسلہ شروع کیا لیکن میں خوف زدہ ہونے کی بجائے کوئی سورت یا کلمہ شریف پڑھ کر خود پر دم کر لیتی اور وہ میرے قریب آنے سے باز رہتے۔ مندر کا ایک پجاری مجھے تین وقت کھانا دیتا تھا لیکن نہ تو وہ مجھ سے کوئی بات کرتا اور نہ میرے کسی سوال کا جواب دیتا۔

ایک دن میں لٹی ہوئی تھی اور گری کے سبب

میں نے بلاؤز اتار کر ساڑھی کے پلو سے سینہ ڈھانپا ہوا تھا لیکن میری بے خیالی میں کسی طرح میرا سینہ کھنگا ہو گیا۔ جس کا مجھے علم نہ ہوسکا تھا۔ اس دوران پجاری کھانا لے کر تہہ خانے میں آیا تو اس کی نظر میرے سینے پر پڑ گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں چمک محسوس کی اور مجھے احساس ہوا کہ اس کی نگاہیں میرے سینے پر جمی ہیں۔ جب مجھے پتا چلا کہ میرے سینے سے ساڑھی کا پلو ہٹا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے سینہ ڈھانپا اور اٹھ بیٹھی۔

”کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتادیا کرو۔۔۔“ وہ پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں سمجھ گئی کہ میرا شباب دیکھ کر اس میں یہ تبدیلی آئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس پجاری سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اگلی بار وہ کھانا لایا تو میں نے ہنس ہنس کر اس سے باتیں کیں۔ وہ بھی بہت خوش ہوا۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے کچھ معلومات حاصل کر لیں۔ شام لال نے میرے وہاں آنے کے تیسرے دن ہی میرے والدین کو اس پجاری کے ہاتھ اطلاع بھجوائی تھی کہ میں نے مندر میں ویوی کی مورتی کو گرا دیا تھا اور ویوی نے ناراض ہو کر مجھ پر اپنا قہر نازل کر دیا جس سے میں جل کر اڑھ ہو گئی۔ میرے والدین نے رو دھو کر صبر کر لیا اور اپنی عزت کے خوف سے معاملہ پولیس میں لے جانے سے گریز کیا۔

دوسرے روز میں نے پجاری سے کہا کہ میں اسے پسند کرنے لگی ہوں۔ اگر وہ مجھے کسی طرح وہاں سے نکال لے جائے تو میں اس سے شادی کر لوں گی۔ پجاری پہلے تو شام لال اور اس کی پراسرار قوتوں کے خوف سے آمادہ نہ ہوا۔ لیکن میں اگلے دو دن اسے اپنے ناز و انداز دکھانے اور ہلکی ہلکی جھٹکیوں سے اسے بھانپا تو وہ راضی ہو گیا۔ اس پجاری کا نام رمیش تھا۔

ایک دن شام لال تہہ خانے میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور وہ بہت نشے میں تھا۔ اس نے مجھ پر بحرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے شراب کی بوتل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور وہ بے

ہوش ہو گیا۔ اس کی چیخ سن کر وہ پجاری کمرے میں آیا۔ شام لال کو بے ہوش دیکھ کر بولا۔

”راکھی موقع اچھا ہے۔ تم فرار ہو جاؤ۔ بعد میں میں بھی آ جاؤں گا۔ اس طرح شام لال کو کبھی علم نہ ہو سکے گا کہ میں نے تمہاری مدد کی ہے اور تم میرے گھر میں چھپی ہوئی ہو۔ لیکن تم اوپر کے راستے سے نہیں جاسکتی کیونکہ وہاں دوسرے پجاری تمہیں دیکھ لیں گے۔“

رمیش کا گھر قلعہ ویدارنگھ میں تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں دریائے راوی کے بند پر اس کا انتظار کروں، اس وقت رات کے دس بجے ہیں اور وہ بارہ بجے تک میرے پاس پہنچ جائے گا۔ مجھ سے کمرے سے نکال کر تہہ خانے کے ایک خفیہ دروازے پر لایا۔ یہ ایک طویل اور اندھیرا غار تھا جس کا اختتام مندر کی مغربی جانب شام لال کے ذاتی مکان میں ہوتا تھا جس میں اس کا چھوٹا بھائی رہتا تھا۔ میں اس غار میں داخل ہوئی اور خدا کو یاد کرتی ہوئی چلنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد میں غار کے اختتام پر پہنچی۔ آگے زینے تھے۔ میں زینے چڑھ کر ایک دروازے تک جا پہنچی۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔

اب میں ایک نیم تاریک کمرے میں تھی جو خالی تھا۔ دوسرے کمرے کی روشنی دیوار میں واقع کھڑکی کے ذریعے اندر آ رہی تھی۔ جو نصف کھلی تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر آئی یہاں برآمدہ تھا۔ برآمدے سے آگے صحن ویران پڑا تھا اور صحن کا دروازہ بند تھا۔ میں نے صحن کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے چلنے لگی کئی کا اختتام کچار راوی روڈ پر ہوا۔ پجاری رمیش نے مجھے راستہ سچھا دیا تھا۔ یہ سڑک ساہو کلاں سے ہوتی ہوئی بندر روڈ پر پہنچتی تھی۔ اس وقت سڑک سنیان پڑی تھی۔ کچار راستہ تھا میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے والدین سے شدید نفرت ہو چکی تھی اور میں جانتی تھی کہ اگر میں گھر گئی تو

شاید شام لال وہاں پہنچ جائے۔ رمیش سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں نے صرف شام لال کی قید سے آزاد ہونے کے لئے اسے محبت کا فریب دیا تھا اور اب میں عارضی طور پر اس کی پناہ حاصل کرنا چاہتی تھی میرا ارادہ تھا کہ اس کی مدد سے ہمیں شام لال کی قید سے آزاد کرادیں گی یا تمہارے والدین کو مطلع کروں گی تاکہ وہ پولیس کی مدد سے تمہیں آزاد کرانکیں۔

میں ساندہ جانے والی سڑک پر آ کر بندر روڈ کی طرف روانہ ہو گئی جہاں راوی کے کنارے مجھے رمیش کا انتظار کرنا تھا۔ ساہو کلاں سے گزر کر میں بندر روڈ پر پہنچی۔ راتے میں مجھے کسی نے نہ دیکھا۔ ایک تو کافی رات ہو چکی تھی۔ میں نے سڑک کر اس کی اور بند پر چڑھ کر دوسری جانب اتر گئی جہاں راوی بہہ رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا اورانی کافی فاصلے پر تھا۔ میں بندے اتر کر مزید آگے جانے کی بجائے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر رمیش کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا میرے اندازے کے مطابق بارہ بج چکے تھے لیکن رمیش ابھی تک نہیں آتا تھا۔ میں اٹھ کر بے تابی سے ٹپٹپٹ لگی۔ میرے پاس کوئی گرم لباس نہ تھا۔ بدن برص ایک ساڑھی تھی جس میں میرا جسم چھڑھرتا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے عقب میں ایک انسانی ڈھانچا کھڑا تھا۔ اس کی استخوانی کھوپڑی گروں کی بجائے اس کے ہاتھ پر رکھی تھی اور کھوپڑی کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ میں خوف زدہ ہو گئی۔ یہ وہی ڈھانچا تھا جو تہہ خانے میں مجھے ڈرانے آتا تھا۔

”رمیش کا انتظار فضول ہے راکھی۔۔۔“ اچانک کھوپڑی سے ایک آواز خارج ہوئی۔ ”وہ نہیں آئے گا۔“ ”کک۔۔۔ کیوں؟“ میں خوف سے بھٹائی۔

اسی لمحے میرا پاؤں عقب میں کسی پتھر سے ٹکرایا۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک بھاری پتھر پڑا تھا۔ میں پتھر کی دوسری جانب گر گئی۔ ڈھانچہ میری طرف

ہوئی دلوار کے ساتھ ایک طرف بڑھ گئی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ جس طرف میں چل رہی تھی ادھر

”شیام لال کے ہاتھوں سے بچنا ناممکن ہے  
راحمی۔“ وہ غرایا۔ ”تمہاری آخری وقت آپہنچا ہے۔“  
میں سمجھ گئی کہ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

چند منٹ بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو شیام لال  
نظر نہ آیا۔ میں نے رک کر اس کے قدموں کی آغوش  
سننے کی کوشش کی لیکن فضا پر مکمل خاموشی طاری تھی۔  
میں دوڑنے کی بجائے ہانپتی ہوئی تیز تیز قدموں سے  
چلنے لگی۔ چند منٹ بعد میں نے رک کر آس پاس  
کا جائزہ لیا تو حیران رہ گئی۔ میرے سامنے وہی مرگھٹ  
تھا جہاں سے میں نے دوڑنا شروع کیا تھا۔ تقدیر مجھے  
بھٹکا کر پھر وہیں لے آئی تھی۔ میری ہمت جواب دینے  
لگی اور میں قدرت کی قسم نظر لینی پر بے اختیار روئے لگی  
۔ مگر اسی لمحے مجھے عقب سے ایک شفقت آمیز آواز  
سنائی دی۔



”ہمت نہ ہارو ماری..... یہ بڑی ہے۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا اور چونک پڑی۔ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ایک سادھو کھڑا تھا۔ وہ بے حد بلا پتلا اور کمرور سا تھا۔

”میرے پیچھے آؤ۔ میں تمہیں محفوظ جگہ پر پہنچا دوں گا۔“ وہ دوبارہ نرم لہجے میں بولا۔

معصیت کی اس گھڑی میں مجھے وہ سادھو ایک بڑا سہارا محسوس ہوا اور میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کا رخ مرگھٹ کی مغربی جانب تھا۔ اس کی موجودگی سے میری ڈھارس بندھی۔ شاید قدرت کو میری حالت پر رحم آ گیا تھا اور اس نے میری امداد کے لئے اس سادھو کو بھیج دیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ چلنے کے بعد وہ ایک اونچے سے نیلے کے پاس پہنچا۔

”اس ٹیلے کی دوسری طرف میری کنیا ہے۔“ وہ چلتے چلتے بولا۔

میں اس کے پیچھے قدم اٹھاتی ہوئی نیلے کی دوسری جانب پہنچی۔ وہاں چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں چراغ جل رہا تھا۔

”چلو۔۔۔۔۔ اندر جا کر آرام کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ سادھو نے جھونپڑی کے دروازے کے سامنے رک کر کہا۔

میں جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اندر فرش پر گھاس پھوس بچھا ہوا تھا۔ بائیں جانب ایک چراغ لکڑی کی تختی پر رکھا جل رہا تھا۔ وہ تختی دیوار میں مسمی ہوئی تھی۔ میں نے طمیان کا سانس لیا اور گھاس پر لیٹ گئی۔ چند منٹ میں ہی میرے اعصاب پرسکون ہو گئے اور مجھے نیند آ گئی۔ ابھی میری پوری طرح آنکھ نہ لگی تھی کہ مجھے باہر سے سادھو کی چیخ سنائی دی اور میں اچھل پڑی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا تو خوف سے کانپ اٹھی۔ باہر چند گز کے فاصلے پر سادھو زمین پر گرا ہوا لیٹ رہا تھا اور سیاہ رنگ کا ایک ریچھ اسے چیرنے پھاڑنے میں مصروف تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا کہ میں اس مہربان سادھو کو ریچھ سے بچاؤں۔ میں لرزتی

ہوئی دیکھتی رہی اور میری آنکھوں کے سامنے سادھو نے ترچے ہوئے دم توڑ دیا۔ غور و خیر سے دیکھنے کے لئے اسے بری طرح چیر پھاڑا لایا تھا۔ میں پیچھے ہٹنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے ریچھ کو جھونپڑی کی سمت بڑھتے دیکھا اور خوف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ یقیناً وہ ریچھ اب مجھے شکار کرنا چاہتا تھا۔ جھونپڑی میں اپنا بچاؤ نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں باہر نکل کر ایک طرف دوڑ پڑی۔

اس خوفی جانور نے رخ بدلا اور میرے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں دوڑتی ہوئی مدد کے لئے چلائی گئی۔

”یہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا کیا۔“ پیچھے سے شام لال کی غضب ناک آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریچھ میرے قریب آ چکا تھا۔ میں وحشت سے بے جان ہو کر گر پڑی۔ میں نے شام لال کی قہر آلودہ آواز سنی۔

”ناحش! اپنا دھرم تبدیل کر کے تو سمجھتی تھی کہ میری روحانی طاقتوں کا مقابلہ کر کے اپنے محبوب کو میری قید سے آزاد کرالے گی۔ میں تجھے نفٹ کر ڈالوں گا۔“

میں نے تیزی سے سنبھل کر ریچھ کی طرف دیکھا اور میرے حواس جواب دے گئے۔ شام لال کی آواز یقیناً ریچھ کے منہ سے نکلی تھی کیونکہ اس وقت وہی میرے قریب کھڑا ہنپتا ہوا مجھے اپنی غوغاؤں لگا ہوں سے گھور رہا تھا۔ میں اب مزید بھاگنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کے اگلے دونوں پنجے میرے بدن سے صرف چھ انچ کے فاصلے پر تھے۔ مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس ریچھ کے گرد سفید دھواں سا بھیل گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ ریچھ دھواں میں گم ہو گیا۔ پھر دھواں غائب ہو گیا اور وہاں ریچھ کی بجائے شام لال کا ناپاک وجود دکھائی دینے لگا جس کے ہاتھ میں کرپان نظر آ رہی تھی۔ اس نے کرپان والا ہاتھ بلند کیا اور میں نے انفرادی طور پر بچنے کے لئے کروٹ لینے کی کوشش کی مگر اس نے فوراً ہی وار کر دیا۔

میرے پہلو میں گہرا گھاؤ آیا میں درو کی شدت سے چیخنے اور ترچے لگی اور شام لال وحشیانہ انداز میں بار بار وار کرنے لگا۔ چھٹے یا ساتویں وار کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ شام لال کرپان سے زمین کو بدھ رہا تھا اور قریب ہی میرا خون آلودہ جسم پڑا تھا۔ میں نے شام لال کو لکڑا لیکن اسے میری آواز نہ سنائی دی۔ مجھے اب اس سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس سے انتقام لینے کے لئے بے تاب تھی مگر میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا کہ میں اس پر وار کر سکتی۔ اس نے زمین پر چھ سات انچ گہرا گڑھا کھودا اور میرے زخمی جسم کو اس میں لٹا کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ پھر وہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے چائنا جا لیکن کوئی قوت مجھے وہیں رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

اسی لمحے مجھے بوڑھا سادھو دکھائی دیا جو میرے قریب کھڑا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ”بابا۔۔۔ کیا تم زندہ ہو۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ تمہاری طرح میں بھی اب صرف روح ہوں۔“ سادھو نے کہا۔ ”شام لال نے میرے جسم کو ہلاک کر دیا ہے۔“

”میں اس شیطان سے انتقام لینا اور اس کی قید سے اپنے محبوب کو آزاد کرنا چاہتی ہوں بابا۔“ میں نے خواہش ظاہر کی۔

”میر کر وہ بی۔۔۔!“ سادھو نے شفقت سے کہا۔ ”شام لال شیطان طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے تم اپنے محبوب کو آزاد نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنی طاقت کا اور اپنی انتظام کر رکھا ہے۔ تمہیں اس کے مرنے کا انتظار کرنا ہو گا۔“

سادھو مجھے اپنی کنیا میں لے گیا۔ اس کا جسم کنیا کے باہر پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا ہونے کے باوجود مجھے دن کا سا اجالا محسوس ہو رہا تھا اور میں ہر شے دیکھ سکتی

تھی۔ میں نے سادھو سے کہا کہ ”میں شام لال کے مرنے کا انتظام نہیں کر سکتی اور ابھی اس کے پیچھے جانا چاہتی ہوں۔“ سادھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس جسم نہیں ہے۔ جسم کے بغیر تم اس کی شیطانی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ تمہارے محبوب کی نگرانی پر مامور مہمن کی کھوپڑی تمہیں مندر کے اس کمرے میں داخل نہیں ہونے دے گی جہاں وہ قید ہے۔ اگر تو وہاں گئی تو ہو سکتا ہے کہ شام لال تجھے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنالے۔“

مجبوراً مجھے مبر کرنا پڑا۔ اسی رات بارش ہو گئی۔ صبح ہوئی تو میں اس دیرانے میں گئی جہاں شام لال نے میری لاش دبا لی تھی لیکن اب وہاں چیلیں اور کوئے میری لاش پر موج اڑا رہے تھے۔ بارش نے میری لاش سے مٹی بہا دی تھی سادھو کا جسم بھی مردار خور پرندوں کی غذا بن چکا تھا۔ میں ڈیڑھ سال تک اس دیرانے میں سادھو کی روح کے ساتھ بھٹکتی رہی۔ میں تم سے ملنے کے لئے بے تاب تھی لیکن مجبور تھی۔

آج صبح سادھو نے مجھے خوشخبری سنائی کہ شام لال مر گیا ہے اور میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ چنانچہ میں یہاں آ گئی۔ آؤ باہر چلیں۔“ راگھی کی بات ختم ہوئی تو میں نے فرط مسرت سے بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”تمہیں میرے محبوب! تم مجھے اپنے ناپاک ہاتھ مت لگاؤ۔ تم ہندو ہو اور میں مسلمان۔ اب تمہارا میرا ملاپ تمہاری موت کے بعد ہی ہو سکے گا۔“ اس نے کہا۔ راگھی کی بات سن کر میرے دل پر خوف سا لگا اور شدت غم سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”راگھی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے صرف تمہیں پانے کے لئے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے تمہاری خاطر ہی ساری مصیبتیں جھیلی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے اور تمہارے اسی جذبے نے مجھے اب تک تمہارے پیار کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر میں کیا کروں میرے

محبوب! میرے دین میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی بے دین اور مشرک کو اپنا بدن چھونے کی اجازت دوں۔ میں نے تو شیام لال کا ہاتھ میری اپنے جسم سے مس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”آصف! یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی۔ میں اب بھی تمہیں دل کی گھبراہٹوں سے چاہتی ہوں کیونکہ محبت جسموں کا نہیں روحوں کے ملاپ کا نام ہے اور تم ابھی زندہ ہو۔ تم اپنے گھر جاؤ اور دنیاوی دلچسپیوں میں حصہ لو۔ میں ہمیشہ تمہارے قریب رہوں گی۔“

”میں اب جی کر کیا کروں گا راکھی۔“ میں نے  
افسردگیا سے کہا۔ ”تمہارے بغیر میرے لئے اپنے میں  
کوئی کشش نہیں ہے۔ میں خود کو ہلاک کر کے تمہارے  
ساتھ رہوں گا۔“

”نہیں آصف۔ خودکشی حرام ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”مرنے کے بعد بھی صرف اسی صورت میں تم مجھے پاسکو گے کہ تمہارا خاتمہ ایمان پر ہو اور تمہاری موت حرام نہ ہو۔ جاؤ۔ دوبارہ مسلمان ہو کر خدا تعالیٰ سے توبہ استغفار کرو اور اپنی طبعی زندگی پوری کرو۔“

اس نے دروازہ کھولا اور میں باہر نکل آیا۔ نصف رات کا عمل تھا اور مندر پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ باہر کوئی بچاری موجود نہ تھا۔ میں اس کے ساتھ مندر سے باہر آیا۔ وہ مجھے میرے گھر تک چھوڑنے آئی۔

”آصف! میں اب چلتی ہوں لیکن میری التجا ہے کہ مجھ تک پہنچنے کے لئے حرام موت کا سہارا مت لینا۔“

اتنا کہہ کر وہ گلی میں اچھلی تارکی میں روپوش ہو گئی۔ میں گھر جانے کی بجائے وہیں سے پلٹا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ مسجد کا دروازہ بند تھا۔ میں امام مسجد کے انتظار میں بیٹھنے لگا۔ فجر کی اذان کا وقت ہوا تو امام مسجد وہاں آ پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

”مولوی صاحب! کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں! میں آصف ہوں۔ دین محمد کا بیٹا۔ تیسری گلی میں ہمارا گھر ہے۔“

”مم..... مکر..... مکرتم تو سر کے لئے  
شاید.....“ وہ بکھلایا۔ ”تمہاری عاتبانہ نماز جنازہ مکر  
نے ہی پڑھائی تھی۔“

”نہیں! میں زندہ تھا۔ دو سال تک میں ایک شیطان کی قید میں رہا۔ اب آزادی نصیب ہوگی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ انڈر جیل میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔“

مولوی کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے مسجد کا دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ مسجد میں داخل ہونے لگا تھا کہ مجھے کوئی خیال آیا اور میں رک گیا۔

”مولوی صاحب۔ میں اندر نہیں آ سکتا۔ میں ناپاک ہوں۔“ میں نے اس سے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ اس نے پلٹ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔۔۔ میں نے دس سال پہلے اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیا تھا۔ اب میں مسلمان ہونے آیا ہوں۔“

مولوی ایک لمحے کے لئے پریشان ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”اچھا..... تم اندر آؤ۔ وضو کرو۔ پھر میں تمہیں کلمہ پڑھاتا ہوں۔“

وہ وضو کر کے مسجد کے صحن میں ہی بیٹھ گیا۔  
میں نے بھی وضو کیا۔ پھر اس کے سامنے خدا کی  
 وحدانیت کا اقرار اور حضور پاک ﷺ کی نبوت کی گواہی  
 کے لئے کلمہ پڑھا۔

”لو۔ خدا کے فضل سے اب تم مسلمان ہو۔“  
مولوی نے کہا۔ ”لیکن تم اب تک کہاں تھے  
اور ہندو کیوں بنے تھے۔“

میں نے مختصر انہیں شام لال کے بارے میں بتایا۔ مولوی کے ساتھ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں گھر پہنچا۔ مولوی سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میری ماں میری جدائی کے صدمے سے ایک سال پہلے فوت ہوئی تھی۔ صرف باپ زندہ تھا۔ والد صاحب نے مجھے دیکھا تو مجھ سے لٹ کر رونے لگے۔ میں بھی رو رہا تھا۔

جس دالے بھاگے آئے۔ وہ سب مجھے زندہ باز  
جرات تھے۔ میں نے کسی سے شام لال یا رانگی کا تذکرہ  
کیا۔ سب سے یہی کہا کہ پشاور میں مجھے پولیس نے  
چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ دو سال کی سزا ہوئی  
اور میں جیل میں رہا۔

والد صاحب سے پتا چلا کہ راجھی کے والدین  
بہت سکون کر کے ہریانہ چلے گئے تھے۔ میں اسی شام  
بہار میں جتا ہو گیا۔ اس کا سبب غالباً غذا اور آب و ہوا  
کی تبدیلی تھی۔ دو برس تک میں مندر کے تنگ تاریک  
کمرے میں ایسی مخصوص غذا کھاتا رہا تھا جس میں  
خواب آرد و دوا شامل ہوتی تھی اور وہ غذا کھاتے ہی مجھے

خدا آجاتی تھی۔ غذا کی تبدیلی سے میں بیمار پڑا تو مرض بڑھتا گیا۔ والد صاحب نے اپنی بھاپ سے بڑھ کر میرا علاج کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک مہینے میں ہی ہڈیوں کا تجزیر کر رہ گیا اور پھر کیا دن میری روح نے میرے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے یہاں دفن دیا گیا۔

بہلی رات ہی راکھی کی روح آ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔  
بہت جذباتی ملاقات ہوئی۔ میری موت قدرتی تھی لیکن  
اسے شام لال نے قتل کساتھا۔ وہ روزانہ یہاں مجھ سے

ملنے آئی ہے لیکن اب تک وہ اپنے قاتل سے انتقام لینے کے لئے بے چین ہے اور اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جس روز محشر تمام مرنے والے زندہ کئے جائیں گے۔“

مردے کی آب پتی سن کر میں نے کفن پوش عورت کی طرف دیکھا جس نے چراغ اٹھا رکھا تھا۔

مقصود یہی تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں کتنی بڑی غلطی کی تھی۔“ وہ بولا۔ ”میں دنیا کو بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ محبت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن ایک مادی وجود کو پانے کے لئے اپنے خالق حقیقی کی وحدانیت سے انکار کرنا بدترین گناہ ہے محبت و رحوں کا ملاپ ہے جو زندگی میں نہ بھی مرنے کے بعد ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن خدا سے پھرنے والے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ یعنی نہ خدا ہی ملانہ وصال صغیم۔ اور یہی میری زندگی کا عبرتناک پہلو ہے جس پر میں قیامت تک شرمندہ رہوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ پتھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری استدعا ہے کہ تم میری آپ بیتی ضرور شائع کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں گے اور میرے حق میں دعا کریں گے۔ اب تم بتاؤ کہ میں تمہارے وقت کا کیا معاوضہ ادا کروں۔“

”نہیں میرے دوست!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہاری آپ بیتی پڑھ کر دوچار آدمی راہ راست پر آجائیں تو یہ میرے لئے سب سے بڑا معاوضہ ہوگا۔“

”شکریہ۔ آؤ میں تمہیں باہر چھوڑ آؤں۔ بارش رک چکی ہے۔“ اس نے قریب آ کر نری سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

نہ جانے اس بار مجھے اس سے کیوں خوف محسوس نہ ہوا تھا۔ جو نبی اس نے ہاتھ پکڑا، حرام سمجھ گیا اور وہاں گہری تاریکی پھیل گئی۔ میں نے راکھی کی روح کی طرف دیکھا لیکن اندھیرے کے سبب وہ مجھے نظر نہ آئی۔ اسی لمحے مرد نے مجھے آگے کھینچا اور میں قدم اٹھانے لگا۔ پانچ چھ منٹ تک اندھیرے کا سفر جاری رہا۔ واپسی میں مجھے اس کا ہیولانک نظر نہ آ رہا تھا۔

”ناصر صاحب!“ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔  
میں نے شروع میں بھی کہا تھا اور اب دوبارہ بھی تنبیہ  
کر رہا ہوں کہ میری آپ بیتی حرف بہ حرف اور کسی کانٹ





## بدروح پیکر

فرید شہزاد - کراچی

اچانک نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تو گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں، آنگن میں بلیاں دوڑا اور غرا رہی تھیں، رات کے پچھلے پھر گمبہر خاموشی میں بلیوں کی غراہٹیں ماحول کو خوفناک بنا رہی تھیں کہ اچانک.....

نفسانی خواہشات کے دلدادہ لوگ کیا واقعی نشان عبرت بن جاتے ہیں۔ ثبوت کہانی میں موجود ہے

والے یہ کہانی ضرور پڑھیں۔ کیونکہ کسی چیز کو بھول جانے کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ میرے پاس کوئی رد عمل نہیں۔ کل بھی تنہا تھا۔ آج بھی تنہا ہوں۔

اکیلا امر کی آخری منزل پر ہوں۔ رات کے کسی پہر نیند ٹوٹ جاتی ہے تو ذہن فوراً اس کی طرف بھٹک جاتا ہے اور وہ اندھیروں کی کوکھ سے چمکتی جگنو کی طرح اپنی جون دکھانے لگتی ہے، تب پچھلی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں، تو کچھ عجیب سا لگتا ہے، پچھتاوا ہوتا ہے کہ زندگی اندھیروں میں بھٹک رہی تھی، برسوں بعد بھی وہ رات اور اس رات کا ناقابل فراموش واقعہ ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا

**انسانی** زندگی انکنت، ناقابل فراموش واقعات اور حادثات سے عبارت ہے۔ بعض واقعات، حادثات اور سائنات اتنے گہمیر ہوتے ہیں کہ ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میری داستان حیات بھی ایسے ہی ایک حادثہ کا عنوان ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری زندگی میں اچانک رونما ہونے والا یہ حادثہ دوسروں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گا کہ نہیں؟

کیونکہ یہ حادثہ، واقعہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے من گھڑت کہانی سمجھ کر نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ کہانی پڑھنے

چھوڑ گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے جب اس درخت کے نیچے پناہ لی تھی تو اس وقت ڈھائی بجے تھے اور ابھی صرف بیس منٹ ہی گزرے تھے۔

میں سوچتا ہوا وہاں سے چورچی کی طرف چل پڑا۔ مگر جتنے جتنے سوا تین بج گئے۔ میں نے گیس پٹر جلا دیا اور بھیکا ہوا لباس اتار کر دوسرا لباس پہن لیا مگر سونے کی بجائے میں نے کافہ قلم سنبھالا اور مردے کی آپ بیتی لکھنے بیٹھ گیا کہ ممکن ہے جس تک بھول جاؤں۔ صبح کے ساڑھے سات بجے میں نے آپ بیتی مکمل کی اور قبرستان سے گھر میں داخل ہونے تک کے واقعات لکھ لئے۔ پھر میں پٹر اور قلم سر ہانے موجود میز پر رکھنے لگا تو میری نظر میز کے وسط میں پڑی اور میں بے اختیار اچھل پڑا۔ وہاں پچاس روپے کے نئے نوٹوں کی ایک گڈی دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً وہ مردے کی طرف سے میرے لئے معاوضہ تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نوٹوں کی گڈی اٹھائی۔ خوشی میں میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور پچاس والے نوٹوں کی گڈی میرے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی۔ مگر نہیں گڈی کی بجائے اصل میں میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پانچ ہزار کی رقم میری سینے بھر کی تنخواہ سے دو گنا تھی۔ میں نے گڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو گڈی کی الٹی سمت میں نوٹ پر سفید دائرے میں نیلی روشنائی سے ایک لفظ لکھا تھا۔ ”آصف“

میرے یقین کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے اتنی بڑی رقم مل گئی تھی اور یہی مردے کی آپ بیتی کے چا ہونے کا ثبوت تھا۔ رقم تو میں نے خرچ کر لی لیکن وہ نوٹ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے جس پر مردے نے اپنا نام لکھا تھا۔ یہ ایک یادگاری نوٹ ہے اور میں نے اس نوٹ کو اس لئے بھی خرچ نہیں کیا کہ ہو سکتا ہے اس آپ بیتی کی اشاعت کے بعد مجھے اس کی سچائی کے لئے کسی کو ثبوت پیش کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔



جہانٹ کے بغیر شائع ہونی چاہئے۔ یہ کوئی خوفناک قصہ نہیں ایک حقیقی اور عبرت انگیز واقعہ ہے اور پڑھنے والوں پر اس کا صحیح تاثر صرف اس صورت میں ممکن ہے جب یہ کسی ترمیم و اضافے اور ردوبدل کے بغیر ان تک پہنچے۔ میں نے تمہارے وقت کا حسب وعدہ معاوضہ ادا کر دیا ہے جو تمہیں گھر پہنچ کر مل جائے گا لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں وعدہ خلافی برداشت نہیں کروں گا۔ کم از کم تمہیں یہ واقعہ دیا مندری سے لکھنا ہوگا۔

”تم بے فکر رہو دوست۔“ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ ”مب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق ہوگا۔“ میں نے کہا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ ٹھیک اسی وقت روشنی پھیل گئی۔ علاقے کی بجلی بحال ہو گئی تھی اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں خود کو اسی درخت کے نیچے پارہا تھا جہاں مردے سے ملاقات ہونے سے چند شتر بارش سے پہلے کے لئے رک گیا تھا۔ قبرستان میں بھی قبائیل چل رہی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میرا لباس بھیگا ہوا تھا حالانکہ چند لمحے پہلے تک خشک تھا۔ میں نے اوھر اوھر دیکھا مردے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ بارش رک چکی تھی اور مجھے پہلے کی طرح سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس صورت حال سے میں ایک بار پھر خوف زدہ ہو گیا اور سوچے لگا کہ کہیں میں نے کوئی بھیاک خواب تو نہیں دیکھا۔

میرے اندازے کے مطابق خشک لباس کے ساتھ کم از کم دو گنہ تک مردے کے ساتھ ایک غار میں اس کی آپ بیتی منسارہا تھا۔ آپ بیتی مجھے یاد تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ میں اب تک پر اسرار واقعات سے دو چار رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی گھڑی میں پر وقت دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ مردے کے غار میں گھڑی کی سوئیاں پونے تین بجے پر ساکت ہو گئی تھیں لیکن اب گھڑی چل رہی تھی اور تین بجتے میں دس منٹ کم تھے۔ گویا صرف پانچ منٹ میں مردہ مجھے اپنی طویل آپ بیتی سنا کر وہاں مجھے واپس



ہے۔ اس سے میرا تعلق کیسے ہوا، جسے پڑھ کر شاید آپ یقین نہ کریں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔

بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اچھے دنوں کی تلاش میں مختلف شہروں میں جا رہے تھے، کچھ عرب ملکوں میں ریال اور دینار بٹور رہے تھے، جب حالات کی تنگ دستی نے گھیرا تنگ کیا تو ایک دن میں نے بھی گاؤں چھوڑ دیا۔ ایک ہی نکلا تھا۔ بڑھنا لکھنا تو دور کی بات کوئی دھنک کا کام دھندا بھی نہیں جانتا تھا۔ میں ایک کسان، ایک ہاری تھا۔ مٹی سونگھ کر زمین کی زرخیزی کے متعلق بتا سکتا تھا۔ لہذا ہزار ہا خرو جو ان تھا۔ میرا صحت مند جسم کسی بھی صنف نازک کے کن انھوں سے دیکھنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ کھیت کھلیانوں میں محنت مزدوری سے صحت قابل رشک تھی۔ شہر کے مختلف چوراہوں پر بھٹکتے بھٹکتے مسکن چورنگی پر سلا ماسے آنا سامنا ہوا گیا۔ وہ اپنی ریڑھی کے قریب درخت کی چھاؤں میں بیٹھا سستا رہا تھا۔ سلا ماسے گاؤں کی پرانی یاری تھی۔ دیکھتے ہی لپٹ گیا۔ پریس میں شناسا مل جانے پر خوشی ہوتی ہے، چائے پیچھے ہوئے اپنا دعایاں کیا تو کہنے لگا۔

”بار تو فکر نہ کر، جو بددلی اپنا بندہ ہے، ٹھکانہ دل جانے گا اور کہیں نہ کہیں دھندے سے بھی لگ جائے گا۔“

سلا ماسی باتوں سے تقویت ملتی۔

فلپینوں سے کافی دور جھکیوں کی ہستی تھی، کبھی یہ علاقہ غیر آباد ویران تھا، دور دور تک کیلر کی جھاڑیاں، اونچے نیچے ناہموار گڑھے تھے، جوں جوں جھکیوں کی ہستی، ہستی گئی جنگل جھاڑیاں کٹیں گئیں، زمین پختہ، بے ترتیب، بے ڈھنگے گھروں کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ دو پہر کا وقت تھا۔ سنان گلیوں میں اداس دو پہر کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایک گلی کے موڑ پر سامنے کی جھکی کے صحن میں نو عمر چھوڑوں کا غول شور مچا رہا تھا، کسی کی بھی عمر جو ابھی کی سرحد سے آگے نہیں تھی۔ یہاں دس روپے کے عوض دی سی آر پر فلم دکھائی جاتی تھی۔ لوگوں کو وقت پر بھرتہ پہنچ جاتا تھا، کبھی کوئی بوڑھا جھکی ہوتی چھت کے نیچے زور زور سے کھانسنے لگتا تو سنانا کا پینے لگتا۔ پھر وہی تھکی خاموشی چھا جاتی۔

سلا ماسے کے ساتھ ندیاں تھکائی کی ویلنیر پر پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اب وہ گاؤں کا ندیاں تھکائی نہیں چو بددلی نذر حسین جنو تھا، پیشہ بدل کر اپنی حیثیت بدل چکا تھا۔ تھکائی تھا مگر تیز دماغ تھا، لین دین کے لوگوں کی سرپرستی میں وسیع و عریض رتبے پر قبضہ کر کے چھوٹی چھوٹی جھکیاں بنا کر چو بددلی بن بیٹھا تھا۔ مجھے بھی ایک جھکی مل گئی۔ پردیس میں ٹھکانہ دل گیا تو بے انتہائی خوشی ہوئی۔ جھکی کیا بھی ساتھ گزری پوشیدہ بھری چار دیواری تھی، در دیوار سے دیرانی برستی تھی، کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی اور کھڑکی کے قریب چوکی موجود تھی، مختصر سی چار دیواری کا آنگن سچ پوچھو تو مجھے اکیلے کے لئے کافی تھا، بھر بھر پیسہ بوسیدہ دیواروں پر کھڑکیوں نے جالے تان دیے تھے، گرد کی دھیز تہ صاف کرنے کیچر بٹورنے میں سارا دن گزار دیتا۔

دوسرے دن چو بددلی نذر حسین جنو کے تواسا سے ایک پلازہ میں چوکیداری مل گئی، اس پلازہ میں ایک دن بعد ٹھکانا پانی آتا تھا، الگ سے ٹانکا لگا ہوا تھا۔ چار چھ فلیٹ ایسے تھے جہاں کین بھر کر پانی پینچتا تھا، کینوں کی کاریں جھاڑ پونچھ یا کرتا تھا۔ تنخواہ کے علاوہ اضافی آمدنی کا ذریعہ پیدا ہوا تو گاؤں کی جنگی ترشی دور ہو گئی۔ گاؤں میں تو اتنی رقم دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔

جھکی پٹی میں نافوسر حدی کا چائے کا کھنکا تھا۔ سرکنڈوں کی چار دیواری پر چٹائیوں کی چھت تھی، بھدی گندی میز کرسیوں پر ٹکلیاں، بھین بھاتی رہتی تھیں۔ صبح سے رات گئے تک وی سی آر پر فلمیں چلتی تھیں۔ شام ڈھلے پلازہ سے آنے کے بعد کھوکھا میں فلمیں دیکھتا۔ پار دوستوں میں وقت گزارتا پھر رات گیارہ بجے کے بعد جھکی میں قدم رکھتا، جونہی جھکی میں داخل ہوتا چھٹی سی کی سی ٹاپیڈ شے کی موجودگی کا احساس دلاتی عجیب سی ٹھکن ہوتی۔ سوچتی نظر دوں سے چاروں طرف دیکھتا اور بتی جلا دیتا۔ جھکی روشن ہو جاتی۔ کبھی کبھی دھندلی دھندلی سی پر چھائیں پلک جھپکتے نظر آتی پھر غائب ہو جاتی۔ سوئے میں قدموں کی چاپ ابھرتی جیسے آنگن میں کوئی چل پھر رہا ہو۔ کبھی کبھی بچن میں بڑوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیتیں،

اچانک خوف سے دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تو محسوس ہوتا جیسے کوئی اندھیرے سے نکل کر سامنے آجائے گا۔ نیند نہ جاتی کبھی نیند میں چو بک کر دیکھتا دیرانی اور پراسرار ناموسی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کمزور بزرگ قسم کا آدمی نہیں جو سہم جاتا۔ ساری حرکتوں کو نظر انداز کر دیتا لیکن بددلی نیند سے بیدار ہونے سے اعصاب میں جھکن، جسم میں تھکاوٹ پیدا ہو جاتا لیکن نیند میں نیند جاٹ ہو جاتی۔

وہ رات بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ تنگ تاریک گلیوں میں بیت جھکی کی تیز ہوائیں جھکی ہوئی رتوں کی طرح بیچ بیچ تھیں۔ جھکی کے پچھوڑے کتے زور زور سے بھوک رہے تھے۔ کھلی کھڑکی سے آدھے چاند کی مدد مدد دیتی تھا ایک ہی جھکی۔ جھکی نیم روشن۔ نیم تاریک تھی، کھڑکی کے قریب چوکی پر گہری نیند سو رہا تھا۔

اچانک دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ گھبرا کر آنکھیں کھلی گئیں جبکہ نیند زور زور سے دیکھا تھا اور نہ ہی کسی مافوق الفطرت شے کے متعلق سوچا تھا، آنگن میں بلیاں دوڑا اور غرا رہی تھیں جیسے آہیں میں جھپٹ رہی ہوں، رات کے پچھلے پہر پراسرار خاموشی میں بلیوں کی غراہٹیں اچانک کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا شبہ ہونے لگتا ہے۔ پہلے تو پتلا کیا پھر پچھلی پچھلی آنکھوں سے دیکھا تو وہی منظر تھا، غیر یقینی مگر یقین کرنا پڑا، چوکی اس کے وجود سے بھری بھری تھی، وہ بازو دیکھی خیار آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس کی موجودگی اچانک سے باعث تھی۔ وہ شبہ جو پچھلے دنوں سے دل دماغ میں پرورش پا رہا تھا یقین میں بدل گیا۔ میں جہاں تھا، غیر شادی شدہ تھا۔ ایک عورت کو مرد کی نظر سے دیکھنے لگا۔ کئی چہرہ شناسا لگتا تو کبھی انہی وہ خوب صورت تھی نہ بد صورت، داہنی رنگ و روپ کی عام عورت تھی۔ اس کی ساری خوب صورتی، ساری دلکشی، ساری جاہلیت سمٹ کر راز گشتی زلفوں میں سما گئی تھی۔ اتنی راز گشتی زلفیں تھیں کہ کر سنے کے نیچے امداس کی رات کی طرح جھپکی ہوئی تھیں۔ کبھی کسی عورت کی اتنی راز گشتی زلفیں نہیں دیکھی تھیں۔ بھر پور بدن کی مکمل عورت تھی مگر اس کی سکراہٹ

میں دیکھنے کے انداز میں مصنوعی پن کا احساس ہوا، گناہ کے چور سائے داخل ہوئی دلی دماغ پر چھا گئی، ہاتھ پکڑا تو پوری کی پوری پکڑ میں آ گئی، کبھی کبھی کی طرح نرم و ملائم لگتی، کبھی تاریل کی طرح سخت، وہ ہی تو زندگی کی کمی پوری ہو گئی، جنون خیز جذبات کو منزل مل گئی۔ پہلی گناہ عورت اور عورت کی مکمل کر گئی، آسودگی اور خوشگوار محسوس سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ صبح جھکی خالی خالی تھی۔

اب ہر رات کا معمول بن گیا۔ رات کے پچھلے پہر خود بخود آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اب وہ انہی نہیں لگتی تھیں۔ نہ گناہ لگتی تھیں۔ راتوں کی نیند چرانے والی بڑی خوب صورت عورت تھی۔ کافرانہ عیشوہ طرازیوں سے چھپڑتی، ہر شب، شب اول کی ہی شدت سے لگتی۔ جاہلیت کی مگر یہ نقطہ عروج پر پہنچ جاتی۔ خود پسندی میں زندگی عطا کرنے والی جیسی دھمی آج بھی تھی۔ اساس کی مٹھی مٹھی جبین ہوتی۔ کبھی کبھی طلسماتی شے کی طرح بھاری بھاری پتھر لگتی۔ اس وقت جسم و جان میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ پکپکا کرہ جاتا۔ دن بھر پلازہ کے گیٹ پر بیٹھا آتی جانی عورتوں کو بھونچتی بھونچتی نظروں سے گھورتا رہتا مگر کوئی چہرہ اس جیسا نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جو بک چب تک پورا خون چوس نہیں لیتی چھوڑتی نہیں۔ وہ جو بک لگی جو چند ہی دنوں میں غیر محسوس طریقے سے میرا خون چوس رہی تھی، ڈھنکی دھنکی تھی جو زانیہ تھیں رہی تھی، میں جو گاؤں کا کمزور جوان تھا۔ سوکھ کر کاٹنا بن گیا۔ کھوکھلے پن سے وہ قدم چلنا مشکل ہو گیا۔ زندگی بے مصرف خالی خالی لگنے لگی۔ چڑچڑاہے پن سے اچھی بات بھی بری لگتی تھی۔ شعور اور اک جو جسم کی کار کوگی کے محتاج ہوتے ہیں مفلوج ہو کر رہ گئے۔ میری حالت سلا ماسے پوشیدہ ہندہ کی۔ راز دار بنے ہی وہی فکر مند سی سوچنے لگا۔ پھر ایک دن ایک عامل کے پاس لے گیا۔ عامل نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں شیشا گیا۔

”تم جس کے ساتھ راتیں گزارتے ہو، وہ انسانی جسم نہیں، بدروح دیکھ رہے، جو انسانی شکل میں خون چوس رہی ہے، تمہاری زندگی پراسرار طاقتوں کی طاقت کے قبضے میں ہے، یہی سلسلہ اور چند دن رہا تو ایک رات

تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی، میری باتوں پر عمل کرو، ورنہ تمہاری مرضی.....

میں ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ عامل کی باتیں سن کر کانپ گیا۔

پھر عامل نے کچھ پڑھ کر مجھ پر چھونکا۔ ایک تعویذ چوکی کے نیچے اپنی طرف کیل سے ٹھونکنے کے لئے دی، ایک سل نما پھرم کر کے دے ہوئے کہا۔

”اپنی چوکی کے نیچے گڑھا کھودو، اس کے کپڑے گڑھے میں ڈال کر اوپر پتھر رکھ دو، پس تمہارا کام ختم.....“

عامل کے آستانے سے نکلے ہی سلا مو اپنے دھندے پر چلا گیا۔ مجھے تعویذ گنڈوں، جھاڑ پھونک کے عمل پر اعتقاد نہیں تھا۔ جلی جیر فقیروں کے بہت سے قصے

کہانیاں سن چکا تھا۔ مگر وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بھروسہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بے دلی سے

آستانہ سے نکلے ہی آسب زدہ جنگی چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ مخالف جنگیوں پر مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ جب شہر لسانی

بنیادوں پر تقسیم ہوا، ایک قومیت کی جگہ مختلف قومیت کا رجحان، ہوتو کہیں ٹھکانا ملنا مشکل ہو جاتا ہے، گلیاں غزروں

میں مکمل قومیتوں میں بدل جاتے ہیں۔ شام کی دہلیز پر رات کی تاریکی اتر رہی تھی، تھکا

تھکا جنگی میں قدم رکھا۔ پراسرار خاموشی در در دیوار سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں بد دل نہیں، ڈر پوک بھی نہیں تھا،

مضبوط اعصاب، قوت ارادی کا پکا تھا، لیکن عامل کی باتوں سے کھوکھلا ہونے محسوس کر رہا تھا۔ کسی دشمن فوج کے

عملے کا ڈر نہیں تھا۔ کسی دہشت گرد کی گولی کا خوف نہیں تھا۔ ایک ایسے دشمن سے سامنا تھا جو یاد و محبت سے قتل

کرنا تھا۔ آنے والے وقت کی ہولناکی کے متعلق سوچ سوچ کر الجھن محسوس کر رہا تھا کہ مقصد میں کامیاب نہ

ہو سکا تو بھلا ک موت واقع ہو سکتی ہے۔ وہ چٹکی رات رنگین بھی تھی۔ ٹھیکن بھی، پورے

چاند کی چاندنی بھیگی ہوئی تھی۔ پچھلے پیر کے سانے میں دور نہیں تھے، زور زور سے بھوک رہے تھے، وہ آتے ہی

عشوہ طرازیوں کا سحر بھونکنے لگی۔ ساڑی چوکی پر بکھری پڑی

تھی۔ میری نظریں ساڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ باتوں باتوں میں چھوٹی سی ٹھری بنا کر سر ہانے رکھ دیا۔ کوئے کی طرف چوکنے اس کے چہرے کے تاثرات پر ڈھتا رہا۔ بڑی مشکل تھی۔ بڑی سخت آزمائش کی گھڑی تھی اور میں اس گھڑی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے توبہ جنگن اگڑائی لیتی ہوئی کروٹ بدلی مودت غنیمت جانا جھٹ ساڑی گڑھے میں گرا کر اوپر پتھر لگا دیا۔ ایک جھکا لگا دھ چوکن پڑی۔

چہرے پر تردد کے آثار جھلک پڑے۔ یکبارگی تڑپ کر انگی پٹٹی پٹٹی نظروں سے چادروں طرف دیکھتی تھامارے لگی۔ ساڑی کی کشد کی تلملائی۔ پھر سفاکی پر آئی۔ جھن میں غرائی بیسوں کی طرح غرائی جھپٹ پڑی۔ تیر

نویسکے ناخنوں سے نوچی کھسوتی میرے چہرے اور بازوؤں کو بڑھان کرنے لگی اس کی دشت ناک و کچھ کر خوف کی لہر

جسم دجال میں دوڑ گئی۔ سراسیمگی سے ہر دار سہتا رہا، بھاؤ کی جدوجہد کرتا رہا اور جب برداشت ناقابل برداشت ہو گئی تو

بھنا گیا، بھر پور طہاش اس کے منہ پر بڑ دیا۔ طہاش پڑے ہی سارا مظنہ ہوا ہو گیا۔ بولکھائی بکا بکا ہو کر خوف سے لاچارگی

سے دیکھنے لگی۔ شکست خوردگی اور پسپائی سے چہرہ جھجھ گیا آواز روندھ گئی، ٹوٹی پھوٹی، اجڑی اجڑی لگنے لگی۔ کبھی

سبھی چوکی کے پائی بیٹھی سسک سسک کر رونے لگی تھی جنگی آنکھوں میں سمندر ابل پڑا۔ جنگی کی پراسرار خاموشی میں اس کی سسکیاں بھر بھر کر بکھری رہیں۔

رات کا سفر جاری رہا۔ دور نہیں کتے وہ رہ کر بھونکتے رہے۔ بہت دیر بعد اپنی برقیٹی کا احساس ہوا تو

حیا سے سٹ گئی۔ چوکی کی چادر نیچے کر بدن پر لپیٹ لی۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ شائینگ بیک سے منے کپڑے نکال

کر دیئے تو تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر بے چارگی سے سمجھوتہ بھری نظریں جھک گئیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ زندگی قدم قدم رواں دوایا تھی۔ اب اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ گھریلو عورت کی طرح

کبھی کبھی سکھ پہنچا دیتی تھی۔ اس دوران کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر گناہ کا طہاش پڑا، تو خواب گراں سے بیدار ہوا کہ گناہ کی سزا فوری تو نہیں

ہو۔ بعد بھی ملتی ہے۔ دنیا ہی میں ملتی ہے۔ یہ سوچتے ہی کانپ گیا۔ معاشرے کی ناپسندیدگی کھٹنے لگی کیونکہ میری زندگی معاشرتی رشتوں سے کٹ گئی تھی کبھی کبھی پاکیزہ جذبات و احساسات کی خلش کھٹکتی کہ غیر شرعی تعلقات

عناوہ ہے۔ جس کی اجازت نہ تو مذہب دیتا ہے اور نہ ہی جذذب پسند کرتی ہے۔ شرعی احکامات کی پابندی کرتے

بڑے ازاد و جی زندگی گزارنا چاہئے۔ بہت دنوں تک ایک ہی زاویے سے سوچنے کے بعد ایک رات اپنے

خفاات کا اظہار کیا تو کھلے میں بائیس آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ہوئی پیار بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

”چھوٹیں بھی، جیسی گزرتی ہے گزرنے دیں، اسی میں بھلائی ہے، ہواؤں کو ٹھنی میں بند نہیں کیا جاسکتا۔“

اس کی مشفق میری سمجھ میں نہیں آئی چپ سا دھلی۔ وقت بوڑھا ہوتا گیا۔ جذباتی کرہاں پر برف جمتی

گئی ان ہی دنوں پلیر لام دین کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ چار سال کویت میں رہ کر کویتی دینار بنوڑا لایا تھا اس وقت جنگی

بی کنڈے کی برقی رو سے رنگین ققوں کی جنگل جنگل کرتی روشنیوں سے روشن تھی۔ کالی بلی عورتیں بے ڈھنگے

پن سے ہڈاؤں سگار کتے بھونٹے انداز سے خراج کر باتیں کر رہی تھیں، ڈھیر سارے بچے دوڑ بھاگ کرتے شور

پا رہے تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد بات آنی، ڈھونگی بے تحاشا ڈھول پیٹ رہے تھے۔ پناؤں کے ساتھ ساتھ

دوائی فارنگ سے جنگی بیٹی گونج رہی تھی۔ جس کے نشے میں بدست میرو قسم کے لڑکے پلوچی فوس کرتے جھوم

رہے تھے۔ وہ بھاگی بھاگی آنی بازو پکڑ کر پھینچتی ہوئی جنگی میں نے گئی، چہرہ کھلا کھلا سا تھا۔ جنگی میں داخل ہوتے ہی بائیس میری گردن میں حائل کر دیں۔ عجیب انداز سے

تھوٹی پیار بھری اداؤں سے کہنے لگی۔

کر جاؤ گی۔“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”پرانی میلی نہیں ہے، مجھے بہت کھلتی ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

میں سمجھا تا رہا، وہ ضد کرتی رہی، میں مناتا رہا، وہ رنجی ناراضگی دکھلاتی رہی، پھر آنکھوں میں سمندر ابل پڑا،

لمحہ اس کے روئے میں عاجزی انکساری کے ساتھ ساتھ رقت آتی گئی، عجیب کشش میں جلتا رہا، آخر اس کی ضد کے

آگے مجبور ہو گیا، چوکی سر کا کچھر ہٹایا یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ برسوں بعد بھی جوں کی توں تھی، ند بیک گئی تھی ند داغ

دھبہ تھا، ساڑی دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی۔ دیوانگی میں تن کے کپڑے نوچ نوچ کر چوکی پر پھینکتی گئی جوں جوں

ساڑی باندھتی تھی چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ وہ چہرہ جو کچھ دیر پہلے شاداب کنول کی طرح تھا۔

شیطان تاثرات سے تنمٹا اٹھا۔ اس قدر بھیا تک ہو گیا کہ نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ آنکھوں میں سانپ

کے آنکھوں جیسی خون آئیز چمک عود کر آ گئی۔ جس نے نظریں ملانے کی تاب چھین لی۔ سر کو جھک دیا تو جوڑا کھل

گیا۔ نظریں چہرے پر بکھر گئیں۔ اتنا ڈراؤنا چہرہ کسی کی کا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا غنیمت پن دیکھ کر میری جگہ کتنا

ہی مضبوط اعصاب کا آدنی ہوتا اور سان خطا ہو جاتے۔ اس کے تھیکے تیور برسوں پیچھے لے گئے۔ میں گم سم حیران

پریشان اٹھی دروازے پر کھڑا تھا۔ ٹھنن زدہ ماحول میں سہا سہا سکتے کے عالم میں ہاتھ پکڑنا چاہا تو شعلہ بار آنکھوں

سے گھوٹتی جھکاؤ کے کرچی پڑی۔ ”چھوڑ دو مجھے، خبردار ہاتھ لگا یا تو.....“ اس کی

اجنبی چیخ کانوں میں گونگی، میں اور ہم گیا۔ پھر وہ جھٹ پٹی چھلاوے کی طرح باہر نکلی۔ شادی

گھر جانے کے بجائے مخالف سمت کی تنگ دتاریک گیوں میں مڑ گئی۔ اس کی تلاش میں بہت دیر تک انہی بے نام

گیوں میں بھٹکتا رہا۔ وہ ایسے غائب ہوئی، جیسے اندھیروں کی کوکھ سے جنم لی تھی، اندھیروں میں ہی ختم ہو گئی۔

ڈھونکی نہیں تھی۔





## سنہری تابوت

ایک اے راحت

قطر نمبر: 8

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے تلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ذاتی حیرت انگیز اور تیر انگیز کہانی

وہ ایک انسانی وجود تھا۔ سفید کفن پہنے ہوئے۔ بالکل پتھرا ہوا ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کفن میں چھپا ہوا تھا۔ میں تو خیر بہت عرصہ سے براسر حالات میں گھری ہوئی تھی اور بے شمار حیرت ناک واقعات سے گزر چکی تھی لیکن سسر صوفیہ کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا۔ اس کے جسم کی لرزشیں قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔

”یہ یہ کوئی مجسمہ ہے۔“ صوفیہ کی آواز ابھری۔

اس سے پہلے کہ میں صوفیہ کی بات کا کوئی جواب دیتی اچانک جسم میں تحریک ہوئی اور پھر وہ آن کی آن میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں ہی اپنی جینیں نہیں روک سکیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے اور دروازے کی طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی لیکن پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ سسر صوفیہ تو اپنے وزن تک کونہ سنبھال سکی اور اگر میں اس کے وزن کونہ سنبھالتی تو دونوں بری طرح نیچے گرے۔

لیکن اس دوران کفن پوش بڑے پروقار انداز میں چلتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے اس عمل نے ہمیں اور حواس باختہ

کر دیا۔ ہماری جان لگی جا رہی تھی۔ کفن پوش چلتا ہوا اپنی اپنی کرسی تک پہنچنا پھر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی کوئی دار آواز ابھری۔

”صوفیہ پر بیٹھ جاؤ۔“ اس آواز نے مزید دھماکہ کیا۔ تاہم مجھ سے پہلے سسر صوفیہ ہم سے قریب کے صوفیہ پر گر پڑی۔ اچانک ہی میری سماعت نے مجھے ایک عجیب سا احساس دلایا۔

یہ آواز اب آواز تو کچھ شناسا سی ہے۔ اس نے پہلے کہ میری کچھ میں کچھ آتا آواز دوبارہ ابھری۔

”نشاء۔ میں دانش ہارون ہوں۔“

ہزار اٹم بٹم پھٹ گئے، ہزاروں آتش فشاں پھٹ گئے تھے، سرخ دھبے ہوا لاوا آسمان تک اچھل گیا تھا۔ شدید زلزلے جیسی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ حالت بری طرح بگڑ گئی۔ سسر صوفیہ نے میری حالت دیکھ کر مجھے جھجھوڑا۔

”نشاء۔ نشاء۔ خود کو سنبھالو۔“

میں خود کو کیا سنبھالتی۔ غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میرے حلق سے پھینچی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اب کہنا چاہتی تھی یا کہنا چاہتی تھی لیکن نقشبند کی تشکیل ہی نہ ہو پاری تھی۔ ہارون دانش کی کونج



آواز دوبارہ ابھری۔

”مجھے اس کی کیفیت کا اندازہ تھامس صوفیہ۔  
کاش یہ مشکل لحاظ ابھی نہ آتے۔ پلیز اسے سنبھالو۔“  
”نشاء۔ نشاء۔“ سسز صوفیہ کی آواز بھٹک لگی  
۔ اس نے میرا سراپے سینے سے لگا کر مجھے بھیج لیا بڑا  
پر محبت لکس تھا جس کا مجھے احساس ہوا۔ اور مس صوفیہ  
سے میں لیٹ گئی۔ میں رونا چاہتی تھی۔ سسکیاں  
لینا چاہتی تھی لیکن کچھ نہیں ہو رہا تھا۔

”سر۔ سر۔ آپ۔“ صوفیہ کی حالت بھی زیادہ  
بہتر نہیں تھی۔

”ہاں۔ میں دانش ہارون ہوں۔“  
”سر آپ۔ انہیں۔ انہیں سنبھالیں۔“ صوفیہ  
نے کہا۔

”نشاء۔ نشاء۔ خود کو سنبھالو بچی۔ غور کرو کچھ  
وجوہات ہی تو ہیں جن کی بنا پر مجھے تم سے یہ عارضی  
دوری اختیار کرنی پڑی ہے۔ درنہ۔ درنہ میری جان۔  
میں یہی تو چاہتا تھا۔ انہیں لحاظ سے تو میں بچ رہا تھا۔“  
”سر آپ انہیں اپنا چہرہ دکھائیں۔ انہیں تسلی  
ہوگی۔“ صوفیہ نے کہا، لیکن دوسری طرف خاموشی طاری  
رہی۔ میری حالت کچھ بہتر ہونے لگی تھی۔ کفن پوش کی  
آواز پھر ابھری۔

”ہمدانی نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ میں نے اسے  
منع کیا تھا۔ خود بھی مصیبت میں پڑا مجھے بھی مشکل میں  
ڈال دیا۔“

”سر آپ کو ہمدانی صاحب کے بارے میں علم  
ہے۔“

”ہاں۔ بس کیا بتاؤں۔ اس نے خود بھی فیصلہ  
کر لیا۔ کاش نشاء تعاون کر لیتی۔ اس قدر بھاگ دوڑ نہ  
کر لیتی۔“

”سر۔ وہ۔۔۔۔۔“ صوفیہ نے کہنا چاہا۔ لیکن دانش  
ہارون نے بات کاٹ دی۔

”غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ میں بھی صحیح فیصلہ  
نہیں کر سکا۔ لیکن ہمدانی۔ خدا اسے زندگی دے۔“

”سر ان پر شدید تشدد کیا گیا ہے۔“

”ہاں۔ مجھے علم ہے بہت برا ہوا ہے۔ پتہ نہیں  
ہمدانی نے کیا سوچا تھا۔“  
”سر۔ آپ پلیز بس نشاء کے بارے میں  
سوچیں۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“  
”کاش۔ میں۔“ دانش ہارون نے جملہ ادھر  
چھوڑ دیا۔

”مجھے ہدایت دیجئے سر، میں کیا کروں۔“  
صوفیہ نے پھر کہا۔ تب ہارون دانش نے کہا۔

”نشاء۔ مجھے تمہاری اس کیفیت کا اندازہ ہے  
لیکن تمہیں علم ہے کہ تینوں میں کارچوک میں ہمیں کیا  
واقعات پیش آئے تھے۔ میں انہیں واقعات کا شکار  
ہوں۔ تمہیں ہمدانی کے بارے میں پتہ چل چکا ہے۔  
اس میں کوئی سپورٹن مجھے بھی پیش آ سکتی ہے۔ مجھے کچھ  
وقت دو۔ میں ان حالات پر قاپو پانے کی کوششوں میں  
مصرف ہوں۔ بس تھوڑے دن اور۔“

میں کیا جواب دیتی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں  
سے اس کفن پوش کو دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں  
اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ میرا باپ ہے یا نہیں۔  
میں تو بری طرح پریشان تھی، ایک عورت، جو میری ماں  
نہیں تھی لیکن جسے میں نے ماں سمجھا تھا۔ پورے آٹھ  
سال تک میں جسے ماں سمجھتی رہی تھی اور ایک مرد جو میرا  
باپ تھا۔ لیکن۔

۔ اس وقت سسز صوفیہ کی آواز ابھری۔

”سر میں تو واقعات سے قطعی لاعلم ہوں۔ میں  
تو یہ بھی نہیں جانتی کہ اب مجھے میرے نام سے کیسے  
واقف ہیں؟“

”مس صوفیہ اس بارے میں اتنا کہوں گا کہ  
اے کے ہمدانی میرا دلیل ہے۔ خدا اسے زندگی دے۔“  
میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور میں اس کے  
بارے میں۔“

”سر۔ میں۔“  
”ہاں میں آپ کی بات کا جواب دے

رہا ہوں۔ ظاہر ہے اس کی وساطت سے میں آپ کے  
بارے میں بھی جانتا ہوں۔“  
”سر۔ نشاء نے میں مجھے اپنے باپ کے  
بارے میں بتایا ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ لیکن کچھ  
باتیں کہنے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔“  
”کہئے۔“

”یہ بچی بڑی عروسیوں کا شکار ہے۔ اس کا باپ  
جو بھی ہو۔ حال میں آپ اس کے سب کچھ ہیں۔ لیکن  
اس وقت بھی یہ آپ کی شفقت سے محروم ہے۔“  
”آپ ٹھیک کہتی ہیں صوفیہ۔ لیکن کفن پوش یہ  
بات کہہ کر خاموش ہوا تو سسز صوفیہ جواب سنبھل گئی  
نہیں۔ پولیس۔“  
”جی سر۔۔۔۔۔ لیکن۔“

”جو کچھ ہے مس صوفیہ وہ انسانی عقل سے  
بہید ہے۔ چند الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جاسکتا ہے نہ  
سمجھایا جاسکتا ہے۔“

”پھر بھی سر۔ نشاء کے لئے کیا کیا جائے۔“  
”بس کچھ مصیبت۔ سارے سسے حل  
ہو جائیں گے۔“

”معاف کیجئے کتنی مصیبت۔ آپ جانتے ہیں  
بس اپنے لئے نہیں نشاء کے لئے یہ سوالات کر رہی ہوں  
اور گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔“

”شاید چند ماہ۔ ہمدانی اگر جلد بازی نہ کرنا  
تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں اور اگر نشاء۔ فیض بابا  
اور آپ پاندمیر سے تعاون کر لیتی تو مجھے آگے کے عمل میں  
آسانیاں ہو جائیں۔“

”وہ کیسے سر؟“

”اے گھر سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہئے تھا۔  
کچھ لوگ میری تاک میں تھے۔ خیر جو ہوتا تھا وہ ہو چکا  
ہے۔ میں نشاء سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

میں اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت میں تھی۔  
مجھے اس شخص پر غصہ آ رہا تھا جو کچھ وقت پہلے تک  
میرا باپ تھا لیکن اب لمحہ سے بے نیاز میری کیفیات

سے بے نیاز صرف اپنی مشکلات بیان کر رہا تھا۔ کفن  
پوش کی آواز پھر ابھری۔  
”اس کے علاوہ صوفیہ کچھ ذمہ داریاں، ہمدانی  
سے تمہارے تعلق کی بنیاد پر، میں تمہارے سپرد  
کرنا چاہتا ہوں۔“  
”جی سر۔“

”کیا تم ان مشکل حالات میں نشاء کا ساتھ  
دے سکو گی۔“

”مجھے کیا کرنا ہو گا سر۔۔۔۔۔“  
”حالات کی سنگینی تمہیں اندازہ ہے۔“  
”کافی حد تک۔“

”اور واقعات کی الجھنوں کا بھی۔“  
”آپ مجھے بتائیے سر۔“  
”تمہیں نشاء کے ساتھ سفر کرنا ہو گا۔“  
”سفر۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔ ایک طویل سفر۔“  
”کہاں کا جنتاب؟“ صوفیہ نے کسی قدر دھیمے  
انداز میں پوچھا۔

سسز صوفیہ کے اس سوال پر کفن پوش تھوڑی دیر  
تک خاموش رہا، پھر اس کی آواز ابھری۔  
”بے شک تمہارے لئے یہ ایک مشکل مرحلہ  
ہو گا مس صوفیہ لیکن میں تمہیں اتنا بتا دوں کہ خدا ہمدانی  
کو زندگی عطا فرمائے جب اسے اس بات کا علم ہو گا کہ تم  
نے میرے لئے ایک مشکل کام کیا ہے تو اسے بے پناہ  
خوشی ہوگی، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمدانی سے تمہارا ریکی  
تعلق نہیں بلکہ ایک طرح سے تم اسے باپ کا درجہ دیتی  
رہی ہو، کیا یہ سچ ہے؟“

”جی سر صوفیہ دی، ایسا ہی ہے، ہماری ایک  
الگ کہانی ہے اور میں سر ہمدانی کے لئے زندگی کی  
بازی لگا سکتی ہوں۔“

”شکر یہ اور تمہیں بعد میں یہ اندازہ ہو گا کہ تم  
نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمدانی کے لئے کس قدر مفید تھا۔“  
”میں کہاں جانا ہو گا سر؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”اعتین، اعتین کے شہر و سکایا جس کے بارے میں تمہیں تمام تفصیلات فراہم کر دی جائیں گی، تم یہ جانتی ہو کہ اعتین جنوب مغربی یورپ میں واقع ہے، بحر اوقیانوس میں دوسری مشہور جنگیں ہیں، جنہیں پہلے میڈرڈ اور اس کے بعد وہاں سے ورسکا جانا ہوگا، میں تم سے بلا تکلف یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا تم اس قدر مشکل برداشت کر سکتی ہو۔“

”جی میں کر سکتی ہوں۔“ صوفیہ نے جواب دیا۔  
 ”اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں صوفیہ، تمہیں ورسکا یا پینچے کے بعد ایک چھوٹے سے قصبہ ریکن تک جانا ہوگا اور ریکن میں تمہاری ملاقات ولسن ڈیزل سے ہوگی جواب وہاں زیتون کا بہت بڑا تجارتی علاقہ ہے، لیکن اس سے پہلے وہ ایک مشہور زمانہ ریلوے تھا جو امریکہ میں بڑی مقبول شخصیت کا تھا، وہاں تمہیں میرا ایک پیغام اس کے حوالے کرنا ہوگا، صرف یہی ایک شخص ہے جو اس کے مدانی کا قلم البدل اور تمہارا رہنما ثابت ہوگا۔“  
 ”اعتین۔“ مسٹر صوفیہ نے پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میری مشکل کا وہی حل ہے۔“ دوسری طرف سے کسی قدر پریشان لہجے میں کہا گیا۔  
 ”کیا نشاء میرے ساتھ جائے گی؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”ہاں، ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ ولسن ڈیزل اے کے ہمدانی کا قلم البدل کا نائب ہوگا اور وہ اس کی جگہ بے لگے گا۔“

”لیکن سر ہم اسے ورسکا میں کیسے تلاش کریں گے اور اس کا ہم سے تعارف کس طرح ہوگا؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”اس کا میں مکمل انتظام کروں گا۔“ کفن پوش یعنی اپنے کہے ہوئے الفاظ کے مطابق دانش ہارون نے کہا اور میری قوت برداشت جواب دے گئی، میں چیخا۔  
 ”کچھ نہیں کرنا مجھے کہنا نہیں جاؤں گی میں، جھوٹ ہے یہ سب فراڈ ہے، میں کچھ تسلیم نہیں کرتی،

میری ماں کہاں ہے، تم کون ہو، کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم میرے باپ ہو؟ کوئی مصلحت تمہیں اب بھی مجھ سے چھپائے ہوئے، بتاؤ کیوں روپوش ہو گئے تم، کیوں مجھے ایک غیر ملک میں بے یار و مددگار چھوڑا، تمہیں اندازہ تھا کہ میں کتنی دقتوں کے بعد یہاں پہنچی اور یہاں پہنچنے کے بعد مجھے کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، تمہاری مصلحت پوشی اب بھی جاری ہے، تم میرے باپ نہیں ہو، تم اس لئے اپنے آپ کو پردوں میں چھپائے ہوئے ہو کہ میں اپنے باپ کو پہچانتی ہوں، اس پر وے کے پیچھے سے دانش ہارون کا چہرہ بھی برآمد نہیں ہوگا، جس کے بارے میں مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ میرا باپ ہے یا نہیں؟“

میرے اندر ایک طوفان برپا ہو گیا تھا، یہ تمام الفاظ بیجان انگیز چیخوں اور سسکیوں کے انداز میں میرے منہ سے نکلے تھے، دیر تک میرے یہ الفاظ کمرے میں گونجتے رہے پھر ان کی بازگشت ہوئی تو سفید کفن میں لمبوں وجود آہستہ آہستہ کرسی سے اٹھ گیا، بلند بالا قد و قامت، چوڑے چکلے بدن کا مالک، ڈھیلے ڈھالے کفن میں کچھ نمایاں نہیں تھا مگر بدن کی ہر جنبش محسوس کی جاسکتی تھی، اچانک ہی سفید کفن اس کے جسم سے علیحدہ ہو گیا، میری سسکی آ نکھیں وہ چہرہ دیکھنا چاہتی تھیں جو کفن کے پیچھے تھا، لیکن اندر سے کوئی چہرہ برآمد نہیں ہوا، سفید چمکدار کپڑے کی بیٹیوں سے بنا ہوا ایک انسانی پتلا آنکھوں کے سامنے تھا، بالکل ان مصری میوں کی مانند جو میں نے تصویروں میں دیکھی تھیں، میرا سانس بند ہو گیا۔

پھر بیٹیوں میں لیٹے ہوئے ہاتھ اٹھے اور ان ہاتھوں نے سر کے پاس کوئی شے، ٹوٹی، کپڑے کی پٹی کا سران ہاتھوں کو لگایا تو ان ہاتھوں نے وہ بیٹیاں کھولنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد زمین پر بیٹیوں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں رہا، بیٹیوں کے اندر سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا، ان کا ڈھیر فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے حلق سے ایک دہشت بھری چیخ نکلی اور میں صوفیہ سے لپٹ گئی، خود صوفیہ کا بدن بھی بری طرح

لڑھکھاتا ہوا تھا۔ کمرے کی فضا میں وحشت ناک سناٹا پھیلا ہوا تھا، صوفیہ بھی ہمت کھو بیٹھی تھی، اس نے مجھے ہتھی لیا۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی، پھر اچانک بیٹیوں کے ڈھیر میں تحریک نمودار ہوئی اور وہ مخصوص انداز میں رد ہونے لگیں ناویدہ ہاتھ دوبارہ انہیں انسانی پستلے کی شکل میں ترتیب دے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھر پہلے ی جیسا پتلا تیار ہو گیا اور پھر وہ سفید کفن پہلی کی طرح اس پر منڈھ گیا۔ اس کے بعد وہی مانوس آواز ابھری۔

”ہاں نشاء میں خود اپنی وفات کا شکار ہو گیا ہوں جو کچھ وہاں سے بتانے کے لئے دنیا کی کسی زبان میں لکھا نہیں جاتا، وقت ہی ان حقیقتوں کا انکشاف کرے گا اور ابھی وقت نہیں آیا ہے، لیکن تم نے اپنی منزل کی جانب قدم اٹھائے ہیں، تم کچھ عرصے میں اپنا راز بالکل اور یہ لازمی امر ہے تم اس سے کتنا ہی گریز کر دیکھا کیجیں، میں بے شک تمہارا باپ ہوں، حالانکہ یہ لفظ کہنے ہوئے مجھے خود بھی شرمندگی ہوتی ہے، لیکن کیا کروں تقدیر کے فیصلے اٹھتے ہیں، مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور صوفیہ تمہیں بھی، ہمدرد لڑکی! میری بیٹی سے تعاون کرنے والے کسی طور گھائے میں نہیں رہیں گے، میں ان کے احسانات کبھی نہیں بھولوں گا، نشاء میرے دل کے ٹکڑے اپنے باپ کو خود سے منحرف نہ کھنکھاتا، اس کا کارہ شکل میں تمہارے سامنے کیا آتا، یہ تو بہتر وقت ہے کہ تم نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا اگر بالکل جی ہو میں تو تمہارا کیا حال ہوتا، جاؤ تقدیر بدلے گی، ضرور بدلے گی اور وہ دن ضرور آجائے گا، وہ دن وہ دن۔“ آواز آخر میں سسکیوں میں تبدیل ہو گئی، صوفیہ اور میں آپس میں بری طرح لیٹے ہوئے تھے، لیکن مجھ سے پہلے صوفیہ ہی نے خود کو سنبھالا اور اس کی آواز بھٹک نکلی۔

”سر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“  
 ”ولسن ڈیزل میرا گہرا دوست ہے، میں تمہیں اس کے نام تفصیلی خط لکھ کر دوں گا، تم میری بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق اعتین جاؤ گی اور وہاں ورسکا یا کے

واقعی علاقے میں اس جگہ جا کر ولسن ڈیزل سے ملنا اور وہ خط اسے دے دینا، اس کے بعد تم یوں سمجھو کہ تمہارے آکے کے تمام معاملات ولسن ڈیزل سنبھالے گا۔ اس پر نہ تو کوئی شک کرنا اور نہ اس کی باتوں سے منحرف ہونا۔“

”سر آپ کو یقین ہے کہ ولسن ڈیزل ہماری پذیرائی کریں گے؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”ہاں بیٹی، مجھے یقین ہے۔“

”ان سے ہمیں کیا معلومات حاصل ہوں گی؟“  
 ”براہ کرم یہ سوالات مجھ سے نہ کرو، جاؤ بس اب جاؤ ہمارا ایک جگہ اکٹھے ہونا خطرناک بھی ہو سکتا ہے، یہ ذمہ داری ہمدانی پر تھی، لیکن لیکن خبر جاؤ بس اب چلی جاؤ، جاؤ بیٹی، خدا تمہارا نگہبان ہو، جاؤ براہ کرم جاؤ۔“

آواز میں ایک زور پیدا ہو گیا تو صوفیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”آؤ نشاء آ جاؤ میں نیم بے ہوش کی سی کیفیت کا شکار تھی، کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں، بلا خرہ وہاں سے چل پڑے اور تھوڑی دیر کے بعد سفر طے کر کے اپنے گھر پہنچ گئے، میں اپنے بستر پر لیٹ کر بک بک کر رونے لگی تھی، میرے حلق سے ہچکیاں نکل رہی تھیں۔“

”کیا وہ واقعی میرے باپ تھے صوفیہ، کیا واقعی وہ میرے باپا ہی تھے؟“

”حوصلہ کرو نشاء، تقدیر نے تمہیں ایک انوکھی آزمائش میں ڈالا ہے، اللہ پر بھروسہ رکھو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہارے کیا ہو گیا میرے باپا کو، کیا ہو گیا انہیں، وہ تو شاندار صحت اور تندرستی کے مالک تھے ان کا بدن کہاں گیا، وہ، وہ کچھ عجیب بھی لگ رہے تھے ہم بتاؤ بیٹیوں کے ڈھیر میں کیا تھا کون بول رہا تھا؟ آہ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا میں بالکل ہوجاؤں گی۔“

”اس کا سات میں نبھانے کیا کیا راز نکھرے ہوئے ہیں، ہم کچھ بھی نہیں جانتے نشاء، واقعی ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔“



”اور انہوں نے مجھے میری ماں کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔“

”ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ وقت خود بہت سے انکشافات کرے گا، میری رائے ہے نشاء کہ تم بھی حوصلے سے کام لو، ہم مجبور ہیں، وقت کا انتظار تو کرنا ہی ہوگا۔“

”آہ میری سچھ میں کچھ نہیں آ رہا، میرا سر پھٹا جا رہا ہے، کچھ بھی تو نہیں سچھ جا رہی میں۔“

”میں تمہارے لئے کافی عزتاتی ہوں، تمہیں سکون ملے گا، ابھی آ رہی ہوں میں۔“ یہ کہہ کر سسر صوفیہ باہر نکل گئیں اور میں سوچ میں ڈوبی رہی، میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، کافی دیر کے بعد سسر صوفیہ واپس آئیں، پھر آ پاند میرا کافی لے کر آ گئیں، صوفیہ نے اصرار کر کے مجھے کافی لانی تھی، لیکن کافی کا آخری گھونٹ پورا نہ لے پانی تھی کہ ٹپکیں جھپکنے لگیں، نجانے کیا ہو گیا تھا، بس ایک دم نیند آئی تھی۔

رات کو کسی وقت آنکھ کھلی تھی لیکن حواس پوری طرح نہیں جاگے تھے یقینی طور پر سسر صوفیہ نے کافی میں مجھے کوئی ایسا خواب آور چیز دی تھی جس سے مجھے نیند آ گئی تھی، البتہ جب میں جاگی تو میں نے سسر صوفیہ کو اپنے قریب ہی سوتے ہوئے دیکھا اور میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

صبح کو جاگی تو طبیعت بھاری تھی، اس وقت سسر صوفیہ میرے پاس موجود نہیں تھیں، البتہ ہاتھ روم سے پانی کے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں، اس کا مقصد ہے کہ وہ غسل کر رہی ہیں، کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ غسل کر کے باہر نکلیں اور میرے سامنے آ گئیں۔ ان کا چہرہ بے حد ٹھنڈا لگا رہا تھا۔ خوبصورت خند و خال کی مالک تھیں، مجھے آنکھیں کھولے دیکھ کر مسکرائیں اور پھر پیار بھرے لہجے میں بولیں۔

”اٹھ جاؤ نشاء اٹھ جاؤ، نوچ رہے ہیں۔“

”مجھے نیند آ رہی ہے۔“ میں کسسا کر بولی۔

”ارے بابا میرا دم نکل جائے گا، اٹھ جاؤ۔“

پلیز! صوفیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

”کیوں؟“

”تمہیں بھوک نہیں لگ رہی، میں تو بھوک سے مری جا رہی ہوں۔“

”ایں۔۔۔۔۔ ہاں بھوک تو لگ رہی ہے مجھے بھی۔“ میں نے کہا اور جلدی سے اٹھ گئی، واقعی شدید بھوک لگ رہی تھی، گرتی پڑتی داش روم میں گئی اور خٹنڈے پانی کی پھواروں سے گزرے ہوئے لحات کا سفر کرنے لگی، اندازہ ہو گیا کہ ضرور صوفیہ نے کافی میں مجھے کوئی خواب آور دوا دے دی تھی۔ اس کا احساس بھی ہوا کہ اس وقت میرے لئے وہی بہتر تھا، خیر باہر نکل تو ناشتہ لگا ہوا تھا، کوئی مزید بات کہنے بغیر ہم لوگ ناشتے میں مصروف ہو گئے اور خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا، چائے کی کئی پیالیاں پی کر سیر ہو گئے، پھر میں نے سسر صوفیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مجھے کافی میں کوئی خواب آور دوا دی تھی نا؟“

”ہاں ضروری تھا، تم بہت اپ سیٹ تھیں۔“

”اپ سیٹ تو میں اب بھی ہوں۔“

”میں نے تم سے رات کو بھی ایک بات کہی تھی کہ حوصلے سے کام لیتا ہوگا۔“

”پھر بتائیے کہ اب میں کیا کرنا ہوگا؟“

”نشاء اب میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”جی پوچھیے۔“

”کیا تم اپن جاؤ گی؟“

عجیب سا سوال تھا میں نے خوف زدہ لگا ہوں سے صوفیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کک۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“

”تم یقین کر دم میں بڑی کشکش کا شکار ہوئی، میری سچھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں، ہمدانی صاحب نے مجھے بہت مختصراً تمہارے بارے میں

بتایا تھا۔ البتہ یہ ضرور کہا تھا انہوں نے کہا کہ مجھے کچھ رحمہ تمہارے ساتھ رہنا ہوگا۔ تمہارے آس پاس سے باخبر رہنا ہوگا، انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ صرف کاروباری معاملہ نہیں ہے بلکہ دوستی کا تقاضا بھی ہے اور کیونکہ یہ بات ہمدانی صاحب نے کہی تھی اس لئے میرے لئے ایک بہت بڑا اور بزرگ کھتی تھی اس لئے میں تیار ہو گئی، لیکن اب اب میں سخت پریشان ہوں لگا۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا صوفیہ۔۔۔۔۔؟“ میں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

”ہمدانی صاحب ہزاروں میل دور لندن کے اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں، مجھے آئندہ کے لئے ہدایات دینے والا کوئی نہیں ہے، یہاں بہت سے ایسے گیس پڑے ہوئے ہیں جنہیں اصولی طور پر اب مجھے دیکھنا چاہئے نشاء مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے، لیکن مجھے بتاؤ میں کیا کروں، اگر صرف یہاں رہنے کی بات ہو تو میں ہمدانی صاحب اور ان کے ساتھیوں سے رابطہ رکھتی اور کام چلتا رہتا لیکن انہیں جانے کا معاملہ بہت مشکل ہے۔“

”معص۔۔۔۔۔ صوفیہ۔۔۔۔۔ ہم میں۔۔۔۔۔ میرے الفاظ پورے نہ ہو سکے، میرا دم گھٹ رہا تھا اور میرے چہرے پر خوف کے آثار ابھرا آئے تھے۔“

”کیا ہوا کیا ہوا؟“ صوفیہ نے سوال کیا۔

”کک۔۔۔۔۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کک۔۔۔۔۔“

”ہاں تم نے ٹھیک سمجھا اور جو تو یہ ہے نشاء کہ میں بھی ڈر گئی ہوں کیونکہ میں تو کچھ بھی نہیں جانتی، کچھ بھی نہیں معلوم ہے مجھے، کیا کہوں میں تم سے کیا نہ کہوں۔“

میں بہت پریشان ہوں نشاء۔ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

”فیصلہ۔۔۔۔۔! میں نے دہشت بھری آواز میں کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں رات بھر نہیں سو سکی۔“

”کیوں؟ میں نے سب سے ہوئے لہجے میں کہا۔“

”دراصل۔۔۔۔۔ ہمدانی صاحب وہاں لندن میں موت و زیست کی کشکش کا شکار ہیں ان کے احوال سے کیس تکھے دیکھتے ہیں۔ اور۔۔۔۔۔ اور اصولی طور پر مجھے ان کے ساتھ لندن میں ہونا چاہئے۔ ان کے دوسرے ماتحت بھی مجھ سے ہی ہدایات لیتے ہیں۔“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں سسر صوفیہ۔“

”شاید۔۔۔۔۔ میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔“

تمہارے ساتھ جاہز جا سکوں یہاں کی بات اور تھی۔ میں نے صوفیہ کا مطلب سمجھ لیا۔ ٹھیک کہہ رہی تھیں لیکن میں بے اختیار ہو گئی میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے پھر تو میں اس قدر بے اختیار روئی کہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میرے منہ سے نکل رہا تھا۔

”آپ بھی میرا ساتھ چھوڑ دیں گی سسر، میں مرجاؤں گی کہیں نہیں جاؤں گی میں۔ نہیں جانا مجھے کہیں۔ نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔“

”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ نشاء میری جان۔ ارے نہیں چھوڑوں گی تمہیں اکیلا۔ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ وعدہ۔ وعدہ نشاء کبھی نہیں جاؤں گی۔“ صوفیہ نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ ”سب میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں کہاں جاؤں۔ کس کو ساتھ رکھوں۔ کیا کروں میں، جمال پاشا بھی کم ہو گیا اور اور عسکری، ناقابلِ نفرت انسان۔“

صوفیہ دس دن بہت مصروف رہی۔ میں بے جان سی مسہری پریشانی رہی تھی لیکن پوٹ وجود و یاد آ رہا تھا۔ حسرت دانش ہارون جیسی تھی آواز بھی سو فیصدی دہی تھی۔ وہ آواز۔ جو بھی میرا سب سے بڑا سراہہ تھی۔ میرے پاپا کی آواز تھی وہ لیکن پاپا۔؟ کپڑے کا ڈھیر کیوں آئیں۔ مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

پھر ذہن بھٹک گیا۔ وہ پراسرار گھر۔ اوہ وہاں دوتاوت تھے۔ دونوں کے تالے بند تھے اور پھر ایک تابوت کھل گیا تھا۔ جو خالی تھا کیادہ پراسرار کن وجود اس تابوت سے نکلا تھا۔ وہ میرے پاپا تھے۔ دوسرا تابوت میں کون تھا۔ کیا میری ماں؟“

دل بری طرح بے چین ہو گیا۔ سسر صوفیہ نظر آئیں تو میں نے کہا۔ ”سسر میری ایک بات سنیں میرے دل میں آئی ہے۔“

”کیا.....؟“

”سسر۔ اس دوسرے تابوت میں کون تھا۔“

”دوسرے تابوت میں۔“

”ہاں۔ وہاں دو تابوت تھے۔ ایک کا تالاکسل گیا تھا۔ دوسرا بند تھا۔ کیا اس میں بھی کوئی تھا۔“

”تمہارے خیال میں کون؟“

”شاید میری ماں۔“

”کاش۔ میں بتا سکتی۔“ صوفیہ نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔ واقعی وہ بے جا رہ گیا تھا۔ اس رات بھی ہمیشہ کی طرح جاگتی رہی۔ پھر نہ جانے رات کے کون سے پہر آنکھ لگ گئی۔ چائے کتنی دیر سوئی تھی کہ کسی نے زور زور سے جھنجھوڑا ہڑ ہڑا کر انہی تو آئند میرا کچھ نظر آیا۔ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

میں نے گردن گھما کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

”کک..... کیا ہے۔“

”ٹھو..... آئند میرے سر گھوٹی کی۔“

میں اٹھ گئی۔ تو آئند میرے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔ پھر میں نے کہا۔ ”اب بتاؤ کیا بات ہے۔“

”نشاء بی بی۔ ہم اب یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔“

”یہ بات بتانے کے لئے آپ نے مجھے آدھی رات کو جگا دیا ہے۔“

”ہم اب آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میں نے ہارون صاحب سے کہہ دیا ہے۔“

”کس سے۔“ میں نے چونک کر کہا۔

”آئیے آپ ان سے مل لیں۔ دانش ہارون صاحب آئے ہیں۔“

میری جو کیفیت ہونی تھی اس کا اندازہ

کیا جاسکتا ہے۔ ”پاپا آئے ہیں۔ پاپا آئے ہیں۔“ بہت سے خیالات ایک دم دل میں آئے تھے۔ وہ بعید جسم کا وجود کیا فریب تھا کیا اس کا میرے باپ ہونے کا دعویٰ غلط تھا لیکن وہ آواز..... وہ حمایت۔ وہ سب کچھ تو پاپا جیسا تھا۔

لڑکھڑاتے قدموں سے پاپا کی لائبریری میں داخل ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سگاری مخصوص بو سنگھائی دی اور میرا دل اچھل کر طلق میں آ گیا۔ لائبریری کے اس مخصوص جگہ میں جہاں کا ماحول بچہ تارک ہوتا تھا پاپا کی کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ سگارا سرخ سر روشن تھا اور دھوئیں کی یکسر بلند ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے ندیرہ نگم۔ آپ جائیے۔“ پاپا کی مخصوص آواز ابھری۔

”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں سر.....“ ندیرہ نے ہچکچاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں۔ کیا بات ہے؟“

”نشاء بی بی نے ہم پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کا رویہ بے حد خراب ہو گیا ہے ہمارے ساتھ باہر کے لوگ ہم سے پولیس والوں کی طرح سوالات کرتے ہیں ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“

”انتظار۔“

”جی سر۔ ہم اب یہاں نہیں رہ سکیں گے۔“

”ہم سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”میں اور فیض پاپا۔“

”ہوں..... کیا تمہیں یہ سوچنا زیب دیتا ہے ندیرہ۔ تم نے مشکل حالات میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اور اب جب مشکل ترین حالات ہیں تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو۔“

”معافی چاہتے ہیں صاحب۔ انسان تو ہم بھی ہیں۔ ندیرہ دے گئی۔“

”آپ اس گھر کے ستون ہیں۔ اور ستونوں کے بغیر گھر قائم نہیں رہتے۔ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں بے فکر ہیں میں نشاء کو سمجھا دوں گا۔“

”آیا ندیرہ روتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ میں رونا ہوں سے پاپا کو کچھ رہی تھی۔ وہ اب بھی پر اسرار سی کیفیت میں تھے۔ کچھ کھوں کے بعد انہوں نے کہا۔“

”حالات پہلے بھی بہتر نہیں تھے نشاء۔ کچھ پر اسرار کہانیاں میری ذات سے پہلے بھی منسلک تھیں لیکن جنس میں جو کچھ ہوا وہ میری توقع کے برعکس تھا۔ وہاں کے پر اسرار حالات تم جانتی ہو۔ صورت حال اتنی بگڑ چکی کہ مجھے تم سے الگ ہونا پڑا۔“

”ایک بات کہوں پاپا۔“

”ہاں۔ بولو۔“

”آپ واقعی میرے ابو ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”بہت سے مطلب ہیں پاپا۔ مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میری ماں ایک نامعلوم شخصیت ہے اور آپ..... پاپا۔ اگر میں آپ کی بیٹی ہوں تو آپ مجھے بے یار و مددگار تنہا نہیں چھوڑ دیتے کچھ بھی ہو سکتا تھا میرے ساتھ۔ پاپا مجھے تو اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ میں کون ہوں کیا ہوں اور اس کے بعد؟“

”تمہیں کچھ نہیں ہوتا نشاء۔ میں آج تک ایک لمحہ تم سے غافل نہیں رہا تنہا سے یہاں آنے کے بعد بھی اور جنس میں بھی، میں نے کچھ تم پر نگاہ رکھی ہے۔ اگر تمہیں کوئی خطرہ ہوتا تو میں ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دیتا۔“

”میں نہیں مانتی پاپا۔ میں نہیں مانتی۔“

”خدا نہ کرو نشاء۔ میں تم سے بڑی توقع رکھتا ہوں۔ تم میری اس بہت بڑی مشکل میں میرا ساتھ دینا ہوا تھا تو میں ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دیتا۔“

”پاپا میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں اسٹین نہیں جاؤں گی۔ میرے ان الفاظ پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر پاپا کی آواز ابھری۔

”میں تم سے تعاون کی توقع رکھتا تھا۔ یہ صرف میری زندگی کا نہیں تمہاری زندگی کا بھی سوال ہے۔ تاہم میں نہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”آپ مجھے میرے سوالوں کے جواب دیں پاپا۔“

”ہاں بولو۔“

”جنس میں آپ نے مجھے کس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔“

”میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا نشاء۔ میں لکھ لکھ تمہارے ساتھ تھا۔“

”کہاں تھے آپ۔ اور پھر یہاں آنے کے بعد بھی آپ نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کیا۔ بس دوسرے لوگ مجھے آپ کا پتہ دیتے رہے۔“

”ٹھیک ہے نشاء۔ تم اگر میرا ساتھ نہیں دینا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔“

”کتنے سوال ہیں میرے ذہن میں پاپا۔ کارچوک کے غاروں میں میری ہمشکل لاش۔ اور پھر۔ اور پھر نہ جانے کیا کیا۔ مجھ سے پوچھیں پاپا۔ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔“

”کاش۔ میں تمہیں اپنی مجبوری سمجھا سکتا۔“

”یہ سب کیا ہوا ہے پاپا۔ یہ کیسی مجبوری ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔“

”یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔“

”آخر کیوں۔“

”تم نے میرے جسم کی حالت دیکھی تھی۔“

”ہاں پاپا۔۔۔۔۔ وہ آپ ہی تھے نا۔“

”ہاں۔“

”مگر کیوں۔ آپ کو کیا ہوا ہے۔“

”ایک تاریخی سزا ہے۔“

”تاریخی سزا۔“

”ہاں.....“

”میری کچھ میں کچھ نہیں آیا پاپا۔“

”یہ بھی ایک بہت بڑی مجبوری ہے، لیکن میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی کرو، ہاں اگر یہ التجا بھی تمہیں قبول نہ ہو تو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“

# فہرست کتب شمع بک ایجنسی کراچی

معلوماتی کتب		ادارہ
معلومات ہی معلومات	شاعر علی شاعر	ادارہ
شمع معلومات	عبدالمعید خان	ادارہ
اسلامی معلومات	منزہ ضیاء	ادارہ
معلومات قرآن مجید	منزہ ضیاء	ادارہ
معلومات پاکستان	عبدالمعید خان	ادارہ
معلومات سائنس	شاعر علی شاعر	ایم الیاس
معلومات علامہ اقبال	شاعر علی شاعر	نوازش شاہین
معلومات کھیل	شاعر علی شاعر	ایم الیاس
معلومات جغرافیہ	شاعر علی شاعر	صفدر شاہین
معلومات تاریخ	شاعر علی شاعر	اے وحید
جدید معلومات	شاعر علی شاعر	راحیلہ شائق
معلومات تاریخ اسلام	شاعر علی شاعر	راشد نذیر طاہر
معلومات ممالک	شاعر علی شاعر	راشد نذیر طاہر
معلومات پاکستان	شاعر علی شاعر	راشد نذیر طاہر
عالمی معلومات	شاعر علی شاعر	ایضاق خان
اسلامی معلومات	شاعر علی شاعر	عنایت اللہ دہلوی
دنیا سے حیرت	عثمان بلوچ	خلد علی
حیرت انگیز معلومات	عثمان بلوچ	ایم الیاس
دس بڑے لوگ	امام بخش بلوچ	ایم الیاس
دلچسپ و عجیب واقعات	خیام دہلوی	ادارہ
حیرت انگیز واقعات	خیام دہلوی	ادارہ
ڈراما سبک سے انتخاب	لاش کا ہنگامہ	ادارہ
پراسرار کہانیاں	مرد و حیل	ادارہ
	مکرم چور	ادارہ

”ٹھیک ہے نشاء میں جا رہا ہوں کیونکہ زیادہ دیر یہاں رہنا خطرناک ہو جائے گا۔“

”خدا حافظ۔“ میں نے کہا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر چار قدم آگے بڑھے اور بولے ”خدا حافظ نشاء خدا حافظ۔“ اس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔

میں حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی، کتنے شاعر لگ رہے تھے اپنی چال ڈھال سے مگر مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ اس لباس کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف ایک دھوکہ ایک خیال ہیں، ایک احساس اور کچھ نہیں، لیکن کیوں، میں نے تو اپنے پاپا کے ساتھ طویل وقت گزارا تھا، چونس چالنے سے پہلے وہ ایک ہنستے بولتے شاش بشاش آدمی تھے، لیکن یہ کیا ہو گیا، کیا ہوا ہے انہیں۔

دوسرا دن بڑا سناسن تھا، سخت بیزاری محسوس ہو رہی تھی، ویسے بھی دن تو گیارہ بجے کے قریب آگے چلی تھی اور شدید حیرانی کا احساس ہوا تھا، صوفیہ کی غیر موجودگی نے چونکا دیا، اس احساس سے دل دھل گیا کہ وہ چلی تو نہیں گئیں، میں خوف زدہ ہو کر باہر نکل آئی اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے پچی، وہ صوفیہ ہی تھیں۔

”اتنی دیر تک سوئی رہی ہو تم، بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔“

”ارے سسر آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟“

”ناشتہ کا نام لے کر میری بھوک کو نہ بھڑکاؤ، پلیز! جلدی کرو ناشتہ لگواؤ۔“ سسر صوفیہ نے خوشگوار لہجے میں کہا اور میں نے ان کی ہدایت کے مطابق عمل کیا، واقعی انہیں شدید بھوک لگ رہی تھی، بڑی بے صبری سے ناشتہ کر رہی تھیں، مجھے ہنسی آگئی، لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، ناشتے سے فارغ ہو کر انہوں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی اور پھر ہونٹ خشک کر کے بولیں۔

”رات کو دانش صاحب آئے تھے؟“

”ارے آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔“ صوفیہ نے کہا

”گویا آپ مجھے یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کس مشکل میں گرفتار ہیں اور جس بے جسم کی آپ نے بات کی ہے اس کی وجہ کیا ہے، ایسا کیوں ہوا ہے پاپا؟“

”میں نے کہا ناشتہ ابھی تفصیل سے کچھ بتانا میرے لئے ممکن نہیں ہے، بس اتنا سمجھ لو کہ تاریخ کبھی نہیں بدلتی، جو تاریخ میں ہو چکا ہوتا ہے تو وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور لکیریں آسانی سے نہیں مٹ سکتیں۔“

”تو آپ میرے لئے کیا کہتے ہیں پاپا؟“

”بتا چکا ہوں کہ اسپین کا سفر بہت ضروری ہے۔“

”مگر میں وہاں کیسے جاؤں گی میں نے تو تنہا کبھی ایسا سفر نہیں کیا۔“

”صوفیہ جو تنہا رہے ساتھ ہے۔“

”مگر وہ تو مجھ سے بھی زیادہ ناواقف ہے پاپا۔“

”اس کے باوجود وہ تنہا راستہ دے گی۔“

”لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے۔“

”ہرگز نہیں، میں اس سے بات کروں گا۔“

دانش ہارون صاحب کی آواز سنائی دی اور میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔

”اور مجھے کوئی تسلی نہیں دیں گے پاپا، میری تنہائی سے آپ کو کوئی وجہ نہیں ہے۔“ میں نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

”صرف اتنا کہوں گا بیٹا کہ عام پاپا اپنی اولاد کو سینے سے لپٹا کر عملی طور پر اپنی شفقت کو پرسکون کر لیتے ہیں، لیکن میں اپنے وجود میں سالہا سال یہ پیار سیٹے ہوئے بے بسی کی منزلوں سے گزر رہا ہوں۔ مجھ سے زیادہ بے بس اس کائنات میں کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے پاپا میں وہی کروں گی جو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔“ میں نے آخر کار ہتھیار ڈال دیئے، تب پاپا کے منہ کی بات نے ایک لفافہ مجھے دیا اور کہنے لگے۔

”اس لفافے میں ڈیزل کے لئے ہدایات ہیں، جس جہیز یہ لفافہ اسے دینا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے لفافہ پاپا سے لے لیا تو وہ بولے۔



اور میں چونک پڑی۔ وہ دوبارہ بولی "اور ہمیں اپنیں جانا ہے، مجھے ایک بات بتاؤ نساء تمہارا پاسپورٹ تیار ہے کیا؟"

"پاسپورٹ تو ہے، ظاہر ہے میں اسی پاسپورٹ پر ٹیونس گئی تھی، لیکن اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ اس کی کیا کیفیت ہے تاہم اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ابھی ایکسپائر نہیں ہوا۔"

"گلد ویری گلد، ہمیں اپنیں جانے کی تیاریاں کرنی ہے۔"

"ایک بات پوچھوں سسر؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ پوچھو۔۔۔"

"آپ کیسے تیار ہو گئیں، پہلے تو آپ نے انکار کر دیا تھا؟"

"اول تو مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے اور میں خود بھی اب تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی، دوسری بات یہ کہ دانش صاحب نے استاد محترم کا حوالہ دیا اور کہا کہ اگر ہمدانی صاحب بہتر حالت میں ہوتے تو اس سے بھی زیادہ اذیت برداشت کر کے ہر حالت میں ہمارا ساتھ دیتے، میں صرف ان کا نعم البدل بن جاؤں خدا ان کو زندگی دے، جب انہیں اس بات کا علم ہوگا تو انہیں فخر ہوگا اور میں اور میں۔۔۔"

"ہاں پولیس پولیس۔۔۔ میں نے کہا۔"

"جس شخص نے مجھے کچھ سے اٹھا کر نکل میں رکھ دیا اس کا کوئی بھی مشن میری زندگی کا مقصد ہے اور میں اس سے گریز نہیں کر سکتی، میری ہر سانس ہمدانی صاحب کی مقروض ہے نساء تم میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتی۔"

"گویا آپ تیار ہیں میرے ساتھ جانے کے لئے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ میں نے کسی کو بلایا ہے وہ تمام فارم وغیرہ لے کر آئے گا تمہاری تصویریں لے کر جائے گا اور ہم آگے کے کام کر لیں گے، میں نے یہ کام ان آدمیوں کو سنبھال دیا ہے۔"

میں خاموش ہو گئی، اس کے بعد درمیان کے چند روز میں نے خاموش تماشائی کی حیثیت سے گزارنے، بس سسر صوفیہ ہی مصروف تھیں۔ مجھے البتہ اس کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہیں، بہت سے لوگ ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے سارے کام مکمل کر لئے، آخر کار وہ وقت آ گیا جب ہمیں اپنیں روانہ ہونا تھا۔ ایک دن احتیاط سے ہم انٹر پورٹ پہنچے اور ایک فلائٹ ہمیں لے کر اپنیں چل پڑی۔

اس وقت ساری دنیا انہی کی نگ رہی تھی، میں زندگی کے ان تمام ہنگاموں سے ناواقف تھی۔ میں نے آج تک جو کچھ کیا تھا وہ پایا کے ساتھ ہی کیا تھا، ایک سہا سہا احساس میرے دل میں جاگزیں تھا، لیکن سسر صوفیہ اس وقت ایک عجیب و غریب شخصیت بن کر میرے سامنے آئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں تنہا نہیں ہوں انہوں نے مجھے بتایا۔

"اپنیں کے بارے میں تمام ضروری معلومات میں نے حاصل کر لی ہیں۔" میں نے اپنا دل پہلانے کے لئے پوچھا۔ "مجھے بھی ذرا تھوڑی سی تفصیل بتائے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ اپنیں جنوب مغربی یورپ میں واقع ہے، اس کے مغرب میں بحر اوقیانوس، شمال میں فلج بسکے، جنوب اور مشرق میں بحر روم ہیں، فرانس اس کے شمال میں ہے اور پرتگال مغرب میں اس کے علاوہ بیلگ اور کینری جزائر اور دوسرے کئی جزائر اسی میں شامل ہیں۔"

"کیپٹل میڈرڈ ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ میڈرڈ، بارسلونا، سویلے، زراغوزہ اور ورسکایا وغیرہ، جس شخص کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے وہ زیتون کا تاجر ہے، ویسے اور بھی بہت ساری صنعتیں پیداوار ہاں ہیں، میں نے تمام تفصیلات معلوم کر لی ہیں، خوبصورت جگہ ہے بہت ہی قدیم روایات کی حامل۔" "واقعی، آپ نے کافی کام کیا ہے سسر صوفیہ۔" میں نے تعریفی لہجہ میں کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"جانی تم نے میرے دل میں ایک عجیب سی جگہ بنائی ہے، میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ ہمدانی صاحب نے مجھے تمہاری نگرانی کے لئے علم دیا تھا، اب وہ علم بھی میرے سر آنکھوں پر ہے، لیکن تمہاری اپنی شخصیت نے بھی مجھ پر اثر کیا ہے اور یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اسی کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔"

"میں نے اپنیں کے نقشے بھی حاصل کر لئے ہیں، ہمیں میڈرڈ میں اترا ہوگا اور پھر وہاں سے ورسکایا میں قیام کرنے کے لئے سفر کرنا ہوگا، ورسکایا میں ویسے تو بہت ساری قیام گاہیں ہیں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ہوٹل جیکارڈو اس سلسلے میں بہترین ہے اور دنیا بھر کے سیاح وہاں قیام کرنا پسند کرتے ہیں۔"

"اوہ کیا آپ نے وہاں سے رابطہ بھی قائم کر لیا؟"

"نہیں نہیں بالکل نہیں، میں نے کہا تھا میں نے معلومات حاصل کی ہیں اور خود دانش ہارون صاحب نے جو خط تمہیں دیا ہے اس میں بھی کچھ ہدایات ہیں میرے لئے میں نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔"

"آپ نے وہ خط پڑھ لیا جو میں نے آپ کو دیا تھا اور پاپا نے مجھے۔"

"ہاں پڑھ لیا ہے مجھے اس کی اجازت دی گئی تھی۔"

"فون پر؟"

"ہاں۔"

"میں نے ایک گہری سانس لی اور فضائی سفر کے سفرلوں کا جائزہ لینے لگی، طرح طرح کے لوگ تھے، رفتہ میں نے سوال کیا۔"

"ایک بات بتائیے سسر صوفیہ، آپ دنیا کے کون کون سے ملکوں میں جا چکی ہیں؟"

"جواب میں صوفیہ ہنس پڑیں پھر بولیں۔" کہاں کہاں بات کر رہی ہو ڈرائنگ، میں نے خوابوں میں بھی اپنے وطن سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔"

"میرے خدا اس کے باوجود آپ اس قدر پر اعتماد ہیں۔"

"جواب میں سسر صوفیہ مسکرا کر خاموش ہو گئیں پھر میں نے کہا۔"

"اچھا ایک بات بتائیے، ہم وہاں وکسن ڈیزل کو تلاش کیسے کریں گے؟"

"فون کروں گی میں انہیں اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے۔"

"اوہ کیا فون نمبر بھی خط میں موجود ہے؟"

"خط میں نہیں تھا، لیکن ہارون دانش صاحب مجھے فون پر بتا چکے ہیں۔"

بہت سے سوالات کر چکی تھی میں صوفیہ سے چنانچہ جہاز کی پشت سے سرگرا آ نکلیں بند کر لیں۔ البتہ سسر صوفیہ کی پراعتماد شخصیت نے مجھ پر عجیب سا اثر ڈالا تھا۔ انسان کو اسی قدر پر اعتماد ہونا چاہئے، یوں لگ رہا تھا جیسے سسر صوفیہ پہلی بار ملک سے باہر نہ جا رہی ہوں، بلکہ وہ عام طور سے دنیا کا سفر کرتی رہتی ہوں اور انہیں اندازہ ہو کہ باہر کی دنیا میں کیسے رہا جاسکتا ہے۔ تمام معاملات خواب کی مانند گزر رہے تھے، میں ان تمام جگہوں کے بارے میں سوچ رہی تھی مجھے اب پہنچنا تھا اور اس کے بعد وہاں سے زندگی کا دوسرا سفر شروع ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں پایا وہاں مجھے بھیج کر کیا کرنا چاہتے تھے۔

آخر کار ہم میڈرڈ پہنچ گئے، یہاں بھی سسر صوفیہ کی پراعتماد شخصیت نے مجھ پر بڑا اثر ڈالا تھا، ایک ٹیکسی نے ہمیں ہوٹل جیکارڈو پہنچایا اور جیکارڈو کی انٹیمسوس منزل کی بڑی کھڑکی سے میں نے ورسکایا کا شہر دیکھا، میڈرڈ میں ہم نے قیام نہیں کیا تھا بلکہ وہاں اترتے ہی ہم نے ورسکایا کے سفر کی تیاری کر لی تھی۔ ابتدائی معمولات سے فارغ ہونے کے بعد سسر صوفیہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے میرے سامنے آئیں تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ خاصی پرکشش خاتون تھیں، کہنے لگیں۔

"اور تم نے تو پہلی بار ملک سے باہر قدم رکھا

ہے۔

”نہیں، میں پاپا کے ساتھ کئی ملکوں میں گئی ہوں، آخری بار میں تو بس گئی تھی۔“

”ارے ہاں..... تم نے مجھے بتایا تھا۔“

”ایک بات بتائیے سسر صوفیہ.....؟“

”ہاں بھولو۔“

”کیا وسکن ڈیزل ہیں بیچان لیس گے؟“

”اول تو دانش ہارون صاحب کا خط ہمارے پاس موجود ہے اور پھر لازمی امر ہے کہ جب انہوں نے ہمیں وہاں بھیجا ہے تو ان سے رابطہ بھی کیا ہوگا۔“

”پاپا سے آپ کی بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔“

”ہاں بھولو۔“

”میرے تیار ہونے کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائی تھیں۔“

”اچھا یہ بتائیے، اب کیا کریں گی، کب انہیں فون کریں گی؟“

”بالکل پرسکون ہو جاؤ ڈارلنگ ایک نئی دنیا کا لطف لو، دیکھو اس ہوٹل کی اٹھاسویس منزل سے اس کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دنیا کتنی عجیب لگتی ہے۔ یہ سب کچھ جو نیچے ہو رہا ہے اس کا نام زندگی ہے، جتنے لوگ پیدل، گاڑیوں میں اور مختلف ذرائع سے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں ان سب کی زندگی سے ایک کہانی منسلک ہوگی، لازمی طور پر ایک کہانی منسلک ہوگی اور یہ ان کی زندگی کی کہانی ہوگی، کیا سمجھیں، ہاں ایک بات میں تم سے کہوں، اگر چاہو تو ابھی مسٹر ڈیزل سے رابطہ قائم نہ کرو، بلکہ وسکا یا کی زندگی دیکھو۔“

”بس یہ نہیں میں کیوں خوب زدہ ہوں سسر صوفیہ؟“

”غیر فطری بات نہیں ہے جانی، اس کی وجہ میں جانتی ہوں، لیکن کوئی حرج نہیں ہے اس بات کے امکانات ہیں کہ وسکن ڈیزل خود اس کا انتظام کریں۔ کیا سمجھیں؟“

”یہاں سے ہمیں لے جانے کا۔“

”ہاں..... تمہوڑا سا انتظار کر لیتے ہیں۔“

بہر حال وقت گزرتا رہا، ہم نے جیسی سے کچھ سیر بھی کی، ایک شاندار ملک تھا، ایک شاندار شہر تھا، کچھ وقت گزرا اور جب وسکن ڈیزل کی طرف سے کوئی رابطہ نہ ہوا تو ان نمبروں پر فون کیا۔ دوسری طرف سے کسی لڑکی نے کہا۔

”جی کون؟“

”مسٹر وسکن ڈیزل سے بات ہو سکے گی؟“

”اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ صبح دس بجے۔“

”کب تک مل سکیں گے؟“

”ایک گھنٹہ کے بعد سے لے کر رات ایک بجے تک۔“

”پلیز! آپ انہیں صبح دے دیں کہ دانش ہارون کے نمائندے پہنچ گئے ہیں اور ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”آپ کہاں ہیں میڈم؟“

”ہوٹل جیکارڈ۔“ صوفیہ نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا اور شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ ٹھیک ایک گھنٹہ کے بعد ہمارے کمرے کی بیل بجی تو صوفیہ نے لا پرواہی کے انداز میں کہا۔

”کون ہے؟“

”ہم یہی سمجھتے تھے کہ ویٹر ہے لیکن آنے والی شخصیت ویٹر کی نہیں تھی۔ غیر معمولی طور پر ایک قد آور شخص تھا جس کے لمبے لمبے بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ اور پورا بدن اسٹیل سے بنا معلوم ہو رہا تھا، مجھے یاد آ گیا کہ وسکن ڈیزل ایک امریکی ریسلر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آئین میں آباد ہو گیا ہو کیونکہ اس کے نقوش اسٹینش نہیں تھے۔ ایک انتہائی قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت ہی شاندار شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔ چہرے پر مخصوص اسٹائل کی بگلی سی ڈاڑھی بھی تھی۔ اس نے پراخلاق لہجے میں کہا۔

”میرا نام وسکن ڈیزل ہے اور یقیناً میں غلط کمرے میں نہیں آیا؟“

”ییس سر، آپ بالکل صحیح کمرے میں تشریف لائے ہیں، براہ کرم اندر آئیے۔“ صوفیہ نے پراغتاد لہجے میں کہا۔

”تم میں سے دانش ہارون کی بیٹی کون ہے؟“ ڈیزل نے دروازہ بند کر کے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ منشاء ہارون ہیں۔“

”بھلو بے بی، میں تمہیں اپنا نام تو بتاتا چکا ہوں اور مجھے علم ہے کہ تم بھی مجھے اچھی طرح جانتی ہو، بھلا کس کی مجال تھی کہ میرے علاوہ یہاں آ سکتا، لیکن اس کے باوجود یہ تمہارے پاپا کا بیٹی گرام ہے اسے دیکھو۔“

ڈیزل نے نیلی گرام میری طرف بڑھا دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر ڈیزل، آپ کی شخصیت آپ کی سچائی کا ثبوت ہے۔“

”پلیز! اسے دیکھو۔“ وسکن ڈیزل نے کسی قدر رخصت لہجے میں کہا اور میں نے نیلی گرام لے لیا، لکھا تھا۔

”ڈیزل، میری بیٹی منشاء تمہارے پاس آ رہی ہے، تفصیلات وہی بتائے گی، مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ دانش ہارون۔“ میں نے نیلی گرام اس کی طرف دیا۔

”یہیہ سکتا ہوں۔“

”براہ کرم تشریف رکھئے۔“ میں نے کہا اور وہ ایک صوفیہ پر وراہ ہو گیا۔ ہم دونوں بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

”میں ویسے تو قصبہ ریگن میں رہتا ہوں، لیکن پچھلے دنوں میں نے وسکا یا میں اپنا ایک بارینا ہے اور اپنی رہائش گاہ بھی اسی بار کے اوپری حصے میں رکھی ہے۔ اسے دوست کی بیٹی کو میں اپنے ساتھ ہی رکھا، لیکن بارانچی جگہ نہیں ہوئی، وہاں سے بہت برے لوگ بھی آ جاتے ہیں اس لئے تمہیں یہاں جینکار ڈوہی میں قیام کرنا پڑے گا، لیکن بے لی معاف کرنا اس کے اعتراضات میرے ذمے ہوں گے، ارے ہاں تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا ڈیئر۔“ وسکن ڈیزل نے

مسکرا کر صوفیہ کو دیکھتے ہوئے کہا، لیکن صوفیہ سے پہلے میں ہی بول پڑی۔

”میری ساتھی میری دوست، پاپا نے انہیں میرے ساتھ ہی بھیجا ہے۔“

”موسٹ ویکم کیا تم نے وسکا یا کا شہر دیکھا یا ابھی یہاں پہنچے ہو۔“

”نہیں ہمیں آئے ہوئے وقت گزرا گیا اور ہم نیکیسی کے ڈریسے وسکا یا کے بہت سے حصے دیکھ چکے ہیں۔“ صوفیہ نے کہا۔

”دیری گڈ..... دیری گڈ، پسند آیا ہمارا شہر۔“

”ہاں بہت اچھا ہے۔“

”اچھا کیا نام بتایا تم نے، منشاء، منشاء، منشاء، پاس میرے لئے دانش ہارون کا کوئی پیغام ہے؟“

”جی یہ ایک لفافہ انہوں نے دیا ہے، مسٹر لفافہ دیکھئے۔“ میں نے کہا اور صوفیہ نے وہ لفافہ نکال کر وسکن ڈیزل کو دے دیا، ڈیزل نے اس میں رکھے ہوئے ایک اور لفافے کو نکال لیا، اس پر بلاسک چڑھی ہوئی تھی، ساتھ میں ایک بڑا پرچہ رکھا ہوا تھا۔ ڈیزل نے اس لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر پرچے کو کھول لیا، پھر کئی منٹ تک وہ اس پرچے کی تحریر کو پڑھتا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تغیرات صاف نوٹ کئے جاسکتے تھے، پرچے کو اس نے کئی بار پڑھا اور اس کے بعد اسے بند کر کے لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے بارے میں تمہیں نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ میرے اور میرے دوست کا معاملہ ہے اور میں اسے اپنے پاس رکھوں گا، تمہیں اعتراض تو نہیں ہے؟“

”نہیں سر۔“ میں نے کہا تو وہ انگلی اٹھا کر بولا۔

”سر..... نہیں..... انکل ڈیزل۔“

”جی.....“

”اس کے علاوہ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہارے لئے کار بیچ دوں گا، ساتھ میں ایک شخص ہوگا جس کا نام ہوریش ہے، ہوریش تمہیں وسکا یا کے مختلف مقامات کی سیر کرائے گا، لی احوال خوب گھومو پھر دو جی

ضرورت ہو مجھے بتا سکتی ہو۔“ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور دم سروں کے نیلی فون کے پاس پہنچا، پھر اس نے دم سروں کو فون کر کے آکٹینش زبان میں کچھ ہدایات دیں اور واپس آ کر ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔

”تمہارے ساتھ کافی کا ایک پیالہ پی کر میں چلا جاؤں گا، اس وقت تک میری خدمت کرتا جب تک میں نہیں خود کو ال نہ کروں۔“

”جی سر۔“

”نہیں نہیں، میں پھر کہہ رہا ہوں کہ سر نہیں اٹکل، اچھا چلو چھوڑو، اگر تم مجھے اٹکل کہنے میں وقت محسوس کرتی ہو تو نہ کہو۔“

تھوڑی دیر کے بعد کافی آ گئی، غضب کی کافی تھی، میں نے دوسری پیالی بھی پی لی اور اس کے بعد ڈیزل ہم سے رخصت ہو گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکل گیا تو صوفیہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”میں اس شخص سے بہت متاثر ہوئی ہوں، کیا ہی شاعر پرستائی ہے، زبردست۔“

میں نے مسکرا کر سسز صوفیہ کو دیکھا اور صوفیہ میری اس مسکراہٹ سے میرے اندر کی کیفیت کو سمجھ گئی اور بولی۔

”نہیں، اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہوئی ہوں اور میرے ذہن میں کوئی خاص تصور پیدا ہوا ہے تو پلیز! تم میری بہت اچھی دوست ہو، کبھی تم سے کوئی بات چھاؤں گی نہیں، لیکن کوئی بات نہیں ہے۔“

”اوہ!۔۔۔ سوری۔“ میں نے کہا اور صوفیہ نے آگے بڑھ کر میرا رخسار چوم لیا۔ میں نے جواب میں اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

”ایک بات میں آپ سے کہوں سسز صوفیہ، آپ کی شکل میں مجھے جو رشتہ ملا ہے اس نے میرے اندر ایک نئی زندگی چھوٹ دی ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں رشتوں کو ترسی ہوئی ہوں، ہر طرف لپک کر آگے بڑھتی تھی لیکن پتہ چلتا تھا کہ اس کے اندر کوئی اور چیز چل رہی ہے،

میرے لئے محبت نہیں، بس کیا کہوں آپ سے۔“

پھر ہوریش آ گیا، اپنے ساتھ وہ ایک خوبصورت گاڑی لایا تھا اور اس کے بعد دم نے دسکا کی سیر کرنا شروع کر دی۔ وسکن ڈیزل نے اذراہ انکساری دسکا کو ایک عام سا شہر کہا تھا جبکہ یہ تو انتہائی حسین شہر تھا، دن اس طرح گزرا کہ پتہ بھی نہیں چل سکا۔ رات کا کھانا دم نے اپنے ہوٹل واپس آ کر کھایا تھا اور ہوریش کو جانے کی اجازت دے دی تھی، اس طرح سیر و سیاحت میں پانچ دن گزر گئے، ہوریش روز بچھ جاتا تھا، چار دن تک دم نے دسکا یا گھوما اور تقریباً پورا شہر ہی دیکھ لیا۔ اس دوران مسٹر ڈیزل نے ہمیں فون بھی نہیں کیا تھا، پانچویں دن جب ہوریش آیا تو ہم نے اس سے معذرت کر لی۔

”آج ہم کہیں نہیں جائیں گے آرام کریں گے۔“

”ٹھیک ہے میڈم۔“ ہوریش کار لے کر واپس چلا گیا، وہ دن ہم نے ہوٹل میں ہی گزارا تھا، چھٹے اور ساتویں دن بھی ڈیزل سے کوئی رابطہ نہیں ہوا، اس کے بارے میں دم نے بہت سی باتیں کی تھیں، انھوں نے شام وہ ہمارے پاس آ گیا۔

”آج دم ڈر ساتھ کریں گے اور مجھے اندازہ ہے بے بی کہ اب دسکا میں تمہارا دل نہیں لگ رہا ہوگا۔“

”آپ اپنے بارے میں بتائیے اٹکل، آپ ٹھیک ہیں؟“ میں نے پوچھا اور وہ ہنس پڑا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن زیادہ ٹھیک اس وقت ہو جاؤں گا، جب تم میرے لئے کافی منگواؤ گی۔ کیا سمجھیں۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور مجھ سے پہلے سسز صوفیہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور دم سروں کو فون کر کے مقامی عہدہ کافی منگوانے لگیں جو واقعی اپنا جواب آپ تھی اور ہم لوگوں نے اتنی پی ڈالی تھی کہ اب ہمیں خطرہ ہو گیا تھا کہ ہمارا دوران خون نہ بڑھ جائے، کافی آ گئی اور ڈیزل نے کافی کے سب لیتے ہوئے کہا۔

”اب جنہیں وہ تمام تفصیل بتاؤں گا جو میرے دل میں پوشیدہ ہے، کیا سمجھیں۔“

”جی، ہم بھی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔“

ڈیزل کچھ دیر خاموش رہا، جیسے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہو، اور پھر اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”ایڈمنڈ آرکوائڈی مورایک نامور مہم جوگردانا جاتا ہے، جنہیں اس کا نام یاد ہو گیا، ڈرائیو خانام ہے، ایڈمنڈ آرکوائڈی مور، ہے نا میزخانہ۔“

ہم دونوں مسکرا دیے، خیر ڈیزل نے کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور بولا۔

”ایڈمنڈ آرکوائڈی مور دنیا کے نامور مہم جو افراد میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے شمالی آسٹریلیا کے جنگلات میں ایک مہم کے دوران وہ جنگل میں پھنس گیا، میں بھی اس کے ساتھ تھا اور یہ بہت پرانی بات ہے، موت دم سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اور ہم ہنس رہے تھے کہ کیا دلچسپ موت تقدیر میں لکھی ہے، میں نے امریکہ کے رنگ میں ریلنگ کی دنیا میں اپنا لوہا منوالیا تھا، لیکن میرا بہترین مظلہ ہم جوئی تھا اور میں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں مہم سرانجام دی ہیں، بہر حال میں تم سے کہہ رہا تھا کہ دم ہنس رہے تھے کہ کیا دلچسپ موت تقدیر میں لکھی ہے، لیکن ایڈی مور زندگی کا انتظار کر رہا تھا، وہ حیرت سے کہتا تھا کہ اس طرح ایک ایسے نجوی کی پیشگوئی غلط ثابت ہو گئی جس نے ساری زندگی کبھی کوئی غلط پیشگوئی نہیں کی، اسے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی موت کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا اس نجوی کی پیش گوئی غلط ہونے کا، وہ کہتا تھا کہ نجوی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ کسی مہم جوئی کے دوران اس کی موت واقع ہوگی اور واقعی نجوی کی پیش گوئی اس وقت صحیح ثابت ہوئی جب موت ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی اور کچھ لمحوں کی بات تھی کہ ہم اس کی آغوش میں پہنچ جاتے، پھر یوں ہوا کہ ایک تحقیقاتی پارٹی وہاں پہنچ گئی، اور اس نے دم سب کی زندگی بچا لی، یہ بھی ایک اہم

بات تھی کہ ہمیں بچانے کے لئے اس پارٹی کو اپنی زندگی داؤ پر لگانا پڑی۔

صورت حال یہ تھی کہ اگر یہ لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوتے تو ہمارے ساتھ انہیں بھی زندگی کھوئی پڑتی اور اس مددگار پارٹی کا سب سے بڑا رکن دانش ہارون تھا، دانش ہارون سے یہ ہمارا پہلا تعارف تھا، تمام تر معلومات کے بعد پتہ چلا کہ وہ مصریات کا دیوانہ ہے اور مصر کے بارے میں عام تحقیق سے ہٹ کر تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ اس نے ابراہیم مصر کے بارے میں ایسے نئے سراغ لگائے ہیں جو ابھی تک دنیا کے سامنے نہیں آئے اور ان دنوں میرے ذہن پر بھی مصر سوار تھا، چنانچہ ہم لوگ جدا ہو گئے اور وقت گزرتا رہا، مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دوبارہ میری دانش ہارون سے ملاقات ہوگی۔ نہ ہم لوگوں نے اس قسم کے وعدے کئے تھے جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ مصر میرا بھی پسندیدہ ملک ہے اور مجھے بھی ابراہیم کے بارے میں خاصا جیس تھا، دوسری بار بھی ہماری ملاقات ایسے ہی ہوئی، ان دنوں میں مصر میں تھا اور ابراہیم پر کام کر رہا تھا کہ ایک صحرا میں پھر ہمارا انگریز ایک ایسے مقام پر ہوا جب دم ریت کے طوفان میں گھرے ہوئے پانچ دن کے بھوکے پیاسے تھے اور اس عالم میں چونکہ ہمارے حواس معطل ہو گئے تھے اور کچھ ہی وقت جا رہا تھا کہ دم ریت کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتے، ہم بے ہوش ہو گئے، اس کے بعد ایک نخلستان میں ہمیں ہوش آیا اور اس بار بھی ہماری زندگی دانش ہارون کی سرہون منت تھی، ایک ایسے شخص نے جس نے دوبارہ ہمیں موت کے جبروں سے نکال لیا ہو، جتنی بھی اس سے محبت اور اس کا احسان تسلیم نہ کیا جاتا انتہائی کم ظرفی کی بات تھی۔

خیر اس دوسرے واقعہ کے بعد کوئی دو سال بعد کی بات ہے کہ ایک شام میڈرڈ کے ایک پارک میں جب میں جاٹنگ کر رہا تھا کہ کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا، میں نے چونک کر اوجھر اوجھر دیکھا، کوئی نہ تھا



مجھے حیرت ہوئی کہ یہ آواز کہاں سے میرے کانوں میں ابھری ہے، کبھی وہ آواز دوبارہ ابھری۔

”یہ میں ہوں ولسن ڈیزل، اگر تمہیں یاد ہو، میرا نام دانش ہارون ہے۔“

آواز بالکل میرے قریب سے آئی تھی، میں شدت حیرت سے دیوانہ ہونے لگا، میں نے کہا: ”مگر تم کہاں ہو یا ر؟“

”تمہارے بالکل نزدیک۔“

”نظر کیوں نہیں آ رہے؟“ میں نے تعجب سے سوال کیا۔

”تم نے پہچان لیا یہ بتاؤ؟“

”ہاں ہاں تمہاری آواز کو میں زندگی دینے والے فرشتے کا نام دیتا ہوں۔ مگر یہ کیا اسرار ہے، تم نگاہوں سے کم ہو جانے کا کوئی عمل دریافت کر چکے ہو کیا؟ میں تمہاری حیران کن صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں، تم سب کچھ کر سکتے ہو۔“

”میں میرے دوست، میں ایک حادثے ایک ایسے کا شکار ہو گیا ہوں۔“

”ارے کب کہاں کیسے؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”بیکار ہے مجھ سے میرے بارے میں نہ پوچھو دوست، بس تمہیں دیکھا پہچان لیا اور دل چاہا کہ تم سے باتیں کروں، یہ بتاؤ تم خیریت سے تو ہو۔ کسی نئی ہم میں کسی مشکل کا شکار تو نہیں ہوئے۔“

”اگر میں حیران نہ ہوتا تو تمہاری اس بات پر بہت ہنسا اور کہتا کہ دوست مجھے یقین ہے کہ اگر تیسری بار بھی میں کسی مشکل کا شکار ہوں گا تو تم وہاں پہنچ جاؤ گے، لیکن براہ کرم مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے اور تم کہاں ہو؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”ویسے اس گفتگو کی طوالت بھی بے معنی ہے بے بی۔۔۔۔۔ بہت سی باتیں ہوئیں اور پھر وہ چلا گیا۔ بعد میں مجھے صرف اس کی نئی کتابوں سے ہی اس کے زندہ ہونے کا پتہ چلا رہا، مصریات پر اس نے جو کچھ لکھا وہ

دنیا بھر میں سب سے انوکھا ہے، میرے دل میں اس کے لئے تجسس تھا کہ اس کا وہ المیہ درست ہوا یا نہیں، اب اس کی حقیقت کھلی ہے۔“

”آپ کو اس ایسے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں؟“ صوفیہ نے پوچھا۔

”بہت کچھ۔“ ولسن ڈیزل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”آپ ہمارے لئے کیا کر سکتے ہیں انکل۔“

”زندگی تک دے سکتا ہوں۔“

”تھینک یو انکل۔۔۔۔۔ تھینک یو دیری جی۔“

”اس نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے، اپنا کوئی کام مجھے دے کر اعزاز بخشا ہے مجھے، ہارون دانش نے اپنی ایک کتاب میں میرے بارے میں بڑے اچھے الفاظ میں لکھا تھا، میری کارڈوں کو سراہا تھا اور مجھے عام حقوق پر فوقیت دی تھی اور اس وقت اس نے اس کا عملی ثبوت دیا ہے میں اس کا شکر گزار ہوں۔“

”انکل کیا آپ کو اب کی مشکل معلوم ہو چکی ہے، آپ جانتے ہیں کہ ان کی پراسرار زندگی کا راز کیا ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ہارون نے مجھے جو تفصیلات بتائی ہیں وہ اپنی اس مشکل کے حل کے تلاش کے سلسلے میں اس کی وجوہات نہیں بتائیں۔ تمہیں میرے ساتھ مل کر کاوش کرنی ہوگی۔“

”میری ماں کے بارے میں کچھ پتہ چل سکتا ہے انکل۔“ میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا اور ولسن ڈیزل تاسف سے مسکرایا پھر بولا۔

”جب ساری کہانی منظر عام پر آئے گی تو اس میں وہ تمام کردار ہوں گے جن کا اس کہانی سے تعلق ہے، منوج بے بی جو تفصیلات ہارون نے لکھی ہیں اور جو ذمہ داری اس نے مجھے سونپی ہے اس کی تکمیل کے لئے ہمیں بہت سی کاوشیں کرنی ہیں، چند اہم افراد کو اکٹھا کرنا ہے، ان میں پہلا نام ابو حامد کا ہے، یہ الجبراز کا

باشیدہ ہے اور الجبراز کے شہر علمائے میں اس سے ملاقات

ہو سکتی ہے۔ مصریات پر اس نے بھی بہت کام کیا ہے اور بڑا نام رکھتا ہے، ہمیں الجبراز چلنا ہوگا، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس صوفیہ بھی اس مشن میں ہمارے ساتھ رہیں گی۔“

”ہاں ولسن ڈیزل، میں ہر لمحہ نشاء کی ساتھی ہوں، مجھ سے بہت کر کوئی بات نہ سوچی جائے۔“ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”بس پھر تم لوگ سفر کے لئے تیار رہو میں تیاریاں مکمل کئے لیتا ہوں۔“

”مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا انکل۔“ میں نے کہا اور ولسن ڈیزل نے کسی قدر تکلیفی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولے۔

”اچھے اچھوں کو معلوم نہیں ہو سکتا بے بی، مصری تہذیب کے چھ ہزار سال طوط ہیں اس داستان میں۔ تاریخ الجبراز ہے اسے سمجھنا ہے بڑے پاپڑیلے پڑیں گے اس کے لئے۔ اور تم۔۔۔۔۔ تم ایک معمولی سے آدمی سے اس کا حل چاہتی ہو، چلا ہوں تیاریاں مکمل کر کے آؤں گا۔“ ولسن ڈیزل چلا گیا، میں غم زدہ سی ہو گئی تھی۔ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”کیا بات ہے ہم اب پریشانی کس بات کی ہے، جس سمت قدم بڑھائے ہیں ادھر چلنا ہوگا۔“

”میں اس تاریخ میں الجبراز کی ہوں سسٹر صوفیہ۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

ولسنگ ڈیزل اس لحاظ سے غوربہ تھا کہ اچانک ہی نازل ہو جاتا تھا اور پھر ایک دم انکشاف کرتا تھا۔

”رات کو ساڑھے دس بجے ہم میڈرل چل رہے ہیں، وہاں سے الجبراز کا سفر اختیار کرنا ہوگا۔“

ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے، لیکن تیاریاں تو کوئی ہی تھیں اور پھر وہ سکایا سے میڈرل پہنچ گئے، ولسن ڈیزل بھی ساتھ تھا۔ میڈرل میں ایک مناسب ہوٹل میں قیام کیا گیا تھا، ولسن ڈیزل نے اپنے لئے الگ کمرہ لیا تھا اور میں اور سسٹر صوفیہ دوسرے کمرے میں تھے۔

ولسنگ ڈیزل فریش ہونے کے بعد ہمارے پاس آ گیا، بناو، اس کے صلے میں، میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔

کافی پی گئی اور پھر اس نے کہا۔

”میڈرل میں تمہیں تنہا گھومنا پھرنا ہوگا، میں کچھ کام کروں گا، یہاں کے بازار خوبصورت ہیں، تمہیں خریداری کا لطف آئے گا۔“

سسٹر صوفیہ بھی تیار ہو گئیں اور ہم ایک دن آرام کرنے کے بعد ساحلوں کی مانند میڈرل کی سڑکوں پر نکل آئے۔ اجنبی ماحول، اجنبی لوگ، ہم بازاروں کی سیر کرتے رہے۔ اس وقت ہم ایک خوبصورت اسٹور سے باہر نکلے تھے کہ اچانک میرا سانس رک گیا۔ اسٹور کے سامنے کے فٹ پاتھ پر عسکری کھڑا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت پینٹ اور چیکنٹ پہنے ہوئے، لیکن شیوہ بڑھی ہوئی تھی، اس وقت آنکھوں پر مخصوص چشمہ بھی نہیں تھا۔ ایک دم آگے بڑھا آیا اور مکمل لہجے میں بولا۔

”ہیلو نشاء۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سسٹر صوفیہ سے بولا۔ ”ہیلو میڈم۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔ کون ہو تم؟“ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”میرا نام عسکری ہے۔“

”سمجھ گئی، تم اسپین کیسے آئے؟“

”نشاء میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جو کچھ کہنا چاہتے ہو میرے سامنے کہو، مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔“ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”وہ سامنے کہنے ہے اگر آپ لوگ۔۔۔۔۔“

”بالکل نہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”نشاء۔۔۔۔۔ میں تم سے کہتا تھا کہ میں تمہارا سیر بن چکا ہوں، تمہیں اپنے دل سے نکالنا اب میرے لئے ممکن نہیں رہا ہے، میں تمہارے پیچھے پیچھے اسپین تک آ گیا ہوں، دیر میں پتہ چلا کہ تم یہاں آ رہی ہو، جس طرح بھی میں پڑا تیاریاں کیں، میڈرل کے چپے چپے میں کتنے دن سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں، آج مل گئی ہو نشاء۔۔۔۔۔ تم جو کچھ بھی کر رہی ہو اس میں مجھے اپنا ساتھی بناؤ، اس کے صلے میں، میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔

میں تہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

”جلے سسز۔۔۔۔۔ آپ یہ فضول کیا اس سننے کیلئے کیوں رک گئیں، آئیے پلیز!“ میں نے کہا اور آگے قدم بڑھا دیے۔

”نشاء میں بیٹی ہال کے کمرہ نمبر دو سو چالیس میں ٹھہرا ہوا ہوں، نشاء میرے بارے میں غور کرنا، مجھیں میری ضرورت ہے پلیز! نشاء دیکھو میں۔۔۔۔۔“

میں نے سامنے سے گزرتی ہوئی عکسی کورکنے کا اشارہ کیا اور عکسی رک گئی، میں اور سسز صوفیہ فوراً اس میں بیٹھ گئے تھے۔ راستے میں صوفیہ نے ہمارے ہونٹ کا نام ڈرائیو کرنا دیا تھا، راستے میں خاموشی رہی تھی۔ طبیعت پر بھاری پن طاری ہو گیا تھا۔ ہونٹ آکر عجیب سی الجھن کا شکار ہو گئی۔ سسز صوفیہ کو میں نے عکسی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔

”میرے خیال میں تمہیں اس سے بات کرنی چاہئے تھی، اس کا اتنا طویل سفر کر کے یہاں چلے آنا معمولی بات نہیں ہے۔“

”سسز وہ روشنائی کے لئے کام کرتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اب ایسا نہ ہو اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ ایک اچھا موقع ہے دشمن کو قریب سے دیکھا جاسکتا ہے، دیئے میرا اندازہ ہے کہ اب ایسا نہیں ہے وہ بس تمہاری محبت کی دیوانگی کا شکار ہے۔“

”مثل اس کی منکبت ہے اور سسز میرے دل میں اب اس کے لئے ذرہ برابر بھی جگہ نہیں ہے، میں کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔“

”اس کے قریب جا کر تم اسے مثل کی طرف مائل کر سکتی ہو۔“

”کیا ہمارے پاس ان فضولیات کے لئے وقت ہے؟“

”میں تمہیں کسی عمل کے لئے مجبور نہیں کروں گی بس میری رائے ہے کہ ایک بار اس کے دل کو اندر سے ٹھونک لو اور یہیں سے واپس روانہ کرو، ہو سکتا ہے وہ

الجزائر تک ہمارا پیچھا کرے۔“

میں سوچ میں ڈوب گئی، پھر میں نے سسز سے اتفاق کر لیا، دونوں ہی باتیں کا آدھ حصہ، اگر آدھ عکسی میرے سلسلے میں جنونی ہو گیا ہے، نواست سمجھاؤں اور اگر کوئی اور بات ہے تو کتنا پیچھے جا۔

شام کو پانچ بجے ہم باہر نکل آئے۔ ہونٹ میں ہال تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی، نچلے درجہ کا لیکن خوبصورت خوبصورت ہونٹ تھا۔ روم نمبر دو سو چالیس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ اچانک اس کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے کوئی باہر نکل آیا۔ میرے حلق سے ایک آواز سی ٹھلکی، میں نے سسز صوفیہ کا شانہ دبوج لیا تھا، میرے قدم جم گئے تھے، ہنٹل میرے حلق سے آواز نکلی۔

”سسز۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ روشنائی ہے۔“

سسز صوفیہ کو ایک لمحے میں میری کیفیت کا احساس ہو گیا تھا اس کے علاوہ روشنائی کا نام بھی ان کے لئے اچھی نہیں تھا، خوش قسمتی تھی کہ ہم جہاں کمرے نے وہیں اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں اور لفٹ آئیں سیڑھوں کے سامنے تھی۔ صوفیہ نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کیا اور میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا، اس کے بعد ہم سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ روشنائی لفٹ ہی کی طرف آ رہا تھا، قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر ہم رکے اب روشنائی لفٹ کے پاس کھڑا انتظار کر رہا تھا، پھر وہ لفٹ میں داخل ہو گیا۔

میرے وجود میں جہنم سلگ رہا تھا، سسز سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں، پھر انہوں نے کہا۔ ”عکسی کا کجی کمرہ ہے نا، کمرہ نمبر دو سو چالیس؟“

”ہاں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ روشنائی اسی سے لئے آیا تھا۔“

”بالکل۔“ میں نے سختی سے ہونٹ بھیج کر کہا۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”وہ روشنائی کی نمائندگی کر رہا ہے، سسز وہ نیچے

سلسل قریب دے رہا ہے، میرے خیال میں اب اس سے ملنا پیکار ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ آؤ چلتے ہیں، نہیں نیچے نہیں چند سیڑھیاں اور چڑھ لو، ہم دوسری منزل سے لفٹ لے لیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد ہم اپنے ہونٹ واپس پہنچ گئے۔ سسز صوفیہ نے صوفے پر دروازہ ہونٹ کمرے سے لے کر کہا۔

”مجھے تم سے اختلاف ہے ڈرائنگ۔“

”کیا سسز؟“

”یقیناً اب بھی تم اس سے محبت کرتی ہو۔“

”مثلاً ایسا ہو سسز، لیکن اس کی ایک وجہ ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”سسز، میں اپنی تنہائیوں سے اکتائی ہوئی تھی، میرے خیال میں ان حالات میں کیا کسی سے بھی محبت ہو سکتی تھی؟“

”ہاں میں یہ جانتی ہوں۔“

”اگر آپ یہ جانتی ہیں سسز تو اب یہ مان لیجیے کہ میں اب اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔“

”ہوں، خیر چھوڑو یہ بتاؤ کیا کریں، کمینٹ روشنائی تجھانے کیسے یہ راز پا گیا اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ وہ نہایت ہوشیاری سے ہم پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔“

”اتفاق سے سسز ولسن ڈیزل سے روشنائی وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی، سسز ڈیزل کا ہوشیار ہو جانا بے حد ضروری ہے، ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح ہمدانی کو نقصان پہنچ گیا ہے اس طرح سسز ڈیزل بھی اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔“

”اودہ سسز بالکل ٹھیک کہا آپ نے، میرا ذہن اس سمت نہیں گیا تھا۔“ میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”ڈیزل کو فوراً پوری تفصیل بتانا ہوگی۔“ سسز نے کہا۔

رات کو ولسن ڈیزل سے ملاقات ہو گئی۔ ”کل گیارہ بجے ہماری فلائٹ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ کو ایک اہم واقعہ کی اطلاع دینی ہے

اٹکل ڈیزل۔“

ولسن ڈیزل نے سوالیہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا تو سسز صوفیہ نے اسے پوری کہانی سنائی اور آخر میں روشنائی کے بارے میں بتا دیا۔ ولسن ڈیزل کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا، کافی دیر کے بعد اس نے کہا۔

”کل رات گیارہ بجے ہماری فلائٹ ہے، اس بجے ہم ہونٹ سے نکلیں گے، میں اگر دن میں نہ ہوں تو تم سے تو تم لوگ تیار رہنا۔“ ولسن ڈیزل کا لہجہ پر اعتماد تھا اس نے اس کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ چلا گیا اور ہم لوگ تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے دن صبح کوئی ساڑھے دس بجے کا وقت تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ اندر سے بند تھا۔ سسز نے دروازہ کھولا اور پھر آنے والے سے بات کرنے لگیں پھر انہوں نے اندر رخ کر کے کہا۔

”سسز عکسی ہیں نشاء۔“ میں اچھل کر کھڑی ہوئی اور اس کے بعد میں دروازے پر آ گئی۔

”یہ خاتون مجھے اندر آنے سے روک رہی ہیں نشاء۔“ عکسی نے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے غرا کر پوچھا۔

”مجھے تم سے کچھ کام ہے۔“

”چلے جاؤ یہاں سے، جاؤ میں نے تم سے دوبارہ ملاقات کے لئے منع کیا تھا، لیکن تم۔۔۔۔۔ جاؤ میں اپنی زبان گندگی نہیں کرنا چاہتی۔“

”نشاء تم یہاں بھی خطرات میں گھری ہوئی ہو، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں اور جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ تمہارے لئے۔۔۔۔۔“

”سسز انہیں دروازے سے باہر دھکا دے کر دروازہ بند کر دیجئے اور اگر یہ دوبارہ نکل بجائے تو ہونٹ منجمنٹ کو فون کر کے بتاؤ کہ ایک آوارہ انسان ہمارے کمرے میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ میں نے اس کی پوری بات بھی نہیں سنی تھی۔

”نشاء میری بات سن لو۔“ عکسی نے کہا لیکن سسز صوفیہ نے دروازہ بند کر دیا تھا، میں واپس آ کر اپنی





ڈرڈا جسٹس کا مشہور و معروف سلسلہ

نمبر 5 اور 6

## رولو کا

پراسرار قوتوں کا مالک

مکمل اور طویل ترین داستان حیرت

کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قسط نمبر 47 سے قسط نمبر 58 تک

قسط نمبر 59 سے قسط نمبر 70 تک

تحریر: اے وحید قیمت فی کتاب = 150/-

نادیدہ قوتوں کی زور آزمائی، کالی دنیا کی بدروحوں

کی شرانگیزی، جنات کی دیدہ دلیریاں، خونی

آتماؤں کی تحیر انگیز اور حیرت انگیز ناقابل

فراموش ہاتھ پائی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے

خونچکاں بھونچکاں معرکہ جیسے پڑھ کر پڑھنے

والے مہبوت اور انگشت بدنداں رہ جائیں گے

اور طویل ترین عرصہ تک یہ تمام کہانیاں ذہن کے

پروے پر جھلماٹی رہیں گی۔

ڈرڈا کی پیشکش

کتاب مارکیٹ لیو اردو بازار کراچی

Ph: 32744391

”ٹھیک ہے سر.....“ سیکریٹری نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ قدموں واپس کمرے سے نکل گیا۔

مرزا صاحب، دو ماہ قبل جابر سے ملاقات کا وقت طے کر گئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد سفید رنگ کے کرتے پا جاسے میں ملیں ایک عمر رسیدہ باوقار شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر سفید رنگ کی داڑھی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسی کا نام مرزا تھا۔ وہ جابر کے سامنے بڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میرے پاس وقت کی قلت ہے۔ اس لئے جلدی بولیں۔ کیا کام ہے؟ زمین کہاں.....؟ کارنر ہے یا درسیان؟ ویسٹ اوپن ہے یا ایسٹ اوپن۔“ جابر نے ایک ہی سانس میں مرزا سے کاروباری لہجے میں دریافت کیا۔

”جابر صاحب! میں آپ کے فن کا شیدائی ہوں۔ اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ.....“ مرزا صاحب جیسے کچھ کہتے رک گئے۔

”ہاں۔ ہاں..... آپ بات جاری رکھیے.....“ جابر نے کہا۔

مرزا آہستہ سے بولا۔ ”مجھے مکان نہیں ہوتا.....“

”تو پھر کیا ہوتا ہے۔ کوئی سینما وغیرہ..... یا کوئی شاپ..... عمارت پلازہ.....“

ذرا توقف کے بعد مرزا صاحب بولے۔ ”وہ دراصل مجھے مسجد کا نقشہ ہوتا ہے۔“

”کیا.....؟ مسجد کا نقشہ.....؟“ جابر نے بے اختیار چونک کر طنز یہ انداز میں کہا۔

مرزا صاحب نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”جی.....“

جابر قہقہہ لگا کر کہہ کر بڑے معنی خیز انداز میں ہنس پڑا۔ ”مجھوہ بولا۔“ مسجد..... بہت خوب، تو اب جابر خان مسجد کا نقشہ بنائے گا.....“ جابر کا انداز مستحزبانہ

میں سوال کر جاتے۔ منہ سے کچھ نہ بولتے۔ اپنی بے پایاں محنت اور لگن سے وہ آج ایسی

بلندی پر تھا، جہاں سے نیچے دیکھنا شاید اس کے اپنے بس میں نہیں تھا۔ کامیابیوں کے ایک مسلسل سلسلے نے اس کو ہر فن تعمیرات کی بلندیوں پر لاکھڑا کیا تھا۔ وہ اب نہ صرف شہر کا بلکہ اپنے ملک کا مشہور ترین کاروباری آدمی بن گیا تھا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر اس کی سوچوں کا خیرازہ ٹوٹ گیا۔

”جس..... کم ان.....“ اس نے عام فہم لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازہ دھیرے سے کھلا اور اس کا سیکریٹری اندر داخل ہوا۔ وہ بولا۔ ”سر۔ مرزا صاحب آگئے ہیں۔“

”ہوں۔ تم یہ بات مجھے فون پر بھی بتا سکتے تھے.....! جابر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”میں نے نمبر ملایا تھا سر۔ مگر آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا.....“ اس کے سیکریٹری نے شائستہ لہجے میں بات کی۔ پھر وہ جابر کی ٹیبل پر پڑے ہوئے فون ٹیبل کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سر۔ ریسیور تو کریڈل کی بجائے ٹیبل پر پڑا ہوا ہے۔“

اس بات پر جابر نے چونک کر فون ٹیبل کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کے منہ سے ملکی ہی سرورسٹس خارج ہوئی۔ ریسیور واقعی کریڈل کی بجائے ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔

”اوہ، کال سننے کے بعد مجھے شاید ریسیور کریڈل پر رکھنے کا یاد نہیں رہا۔“ جابر نے اس بار غم سے لہجے میں کہا۔ ”ہاں اور تم مرزا صاحب کو اندر بھیج دو اور ہاں..... اس کے بعد کسی کومت بھیجنا۔ مجھے وزیراعلیٰ کے پاس جانا ہے۔“

جاتا۔ جابر کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نقشے کے سلسلے میں صرف اور صرف اپنی ہی بات ملحوظ خاطر لاتا تھا۔ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے..... وینا اوھر کی اوھر..... مگر دوسروں کی بالکل بھی نہ سنتا اور اگر کوئی غیر ضروری مداخلت کرتا تو جابر لاکھوں روپوں کا نقشہ بھی ادھورا چھوڑ کر اٹھ جاتا اور معاہدہ کو ٹھوکر مار کر ختم کر دیتا۔

ملک کے تمام اہم تعمیراتی منصوبوں پر اس کے ہی بنائے ہوئے نقشوں کے مطابق کام ہو رہا تھا شہر کے تمام رئیسوں، امراء کے محل نمائندوں کو گھروں کو گھروں اور بنگلوں کے نقشے بھی اس کے فن پارے تھے۔ سرکاری عمارتیں، تفریحی مقامات، ہوسٹل، سینما گھر اور دیگر کاروباری مقامات..... سب پر اس کا ہی نام درج تھا جابر کی کامیابیوں کا ایک نہ تھکنے والا سلسلہ چل پڑا تھا جو کہ روکے بھی نہیں رک رہا تھا۔ بے انتہا دولت، بے شمار انعامات..... اب ہر نیا آنے والا دن ان ہی چیزوں کی نوید لے کر آتا۔ یہ انداز سفر اس کو حد سے زیادہ بے پرواہ بنا گیا تھا۔ وہ بعض دفعہ انتخابانے میں کچھ ایسے کام بھی کر جاتا تھا جو بظاہر کسی ہوش مند آدمی کو زیب نہیں دیتے۔ مگر وہ شخص جس کا نام جابر تھا، اب صرف اور صرف ایک مشہور آرکیٹیکٹ تھا اور شہرت کے زینے چڑھنے کے بعد کم ہی خوش نصیب لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فیصلے عقل سے بھی کرتے ہیں! اب تو پینانٹوں میں گھرے رہنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ بردت، ہرگز بڑی، ہوتے جاتے..... بس پینانٹ ہی کرتا رہتا تھا۔ بالکوئی سترہ فٹ، بیرونی کمرہ میں فٹ، چھت کی اونچائی میں فٹ، گوزینے کا قطر چار فٹ، کچن چوہ فٹ، باتھ روم بارہ فٹ اور نامعلوم کیا کیا.....

وہ ہر لمحہ، ہر وقت..... کسی ناکسی نئے پروجیکٹ کے نقشے کی تیاری میں مصروف رہتا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ نقشہ پر لانا سے مکمل ہوتا۔ مگر پھر جابر کو خود ہی اس میں کچھ کی نظر آ جاتی اور پھر وہ اسے نو نقشہ بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ دیکھنے والے آنکھوں ہی آنکھوں

تھا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ تاکہ میری فیس کتنی ہے۔۔۔۔۔“  
”جی بالکل۔۔۔۔۔“

”اگر آپ کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میری فیس ادا کر سکیں تو پھر بھی میں مسجد کا نقشہ نہیں بنا سکتا۔ آئی ایم سوری۔“

”مگر کیوں۔۔۔۔۔؟ اس کے عوض آپ کو مکمل فیس دی جائے گی۔ تاکہ اللہ کے لئے مفت میں نقشہ بنوایا جائے گا۔“

”مسجد میں رکھا ہی کیا ہے؟ سیدھی سیدھی لائن ہوگی۔ وہاں جاننا زبچا دیں۔۔۔۔۔ ہر درخت کے فاصلے پر چکھنے کا پوائنٹ دے دیں۔ سوری مرزا صاحب، میں اس طرح کا کام نہیں کر سکتا، میں آرکیٹیکٹ ہوں۔ کوئی معمولی مستری نہیں۔۔۔۔۔“

مرزا صاحب نے جابر کے متعلق جو کچھ سن رکھا تھا وہ دیکھ بھی لیا۔ مگر وہ بھی جہاں دیدہ آدی تھے۔ ان کو جابر پر غصہ نہیں آیا۔ بلکہ ترس آیا۔ وہ دل ہی دل میں جابر کے لئے ہدایت کی دعا کرتے ہوئے اس کے دفتر سے باہر آ گئے۔

جابر کو احساس تک نہ ہوا کہ اس سے کس طرح کا کفر سرزد ہوا ہے۔ مگر شاید ابھی خدا کا امتحان اور بات تھا۔

دن بد دن گزرتے گئے۔ وقت کا پہرہ گھومتا رہا۔ ایک دن جابر نے مزدوروں کے رہائشی کوارٹرز کا نقشہ بھی بنانے سے انکار کر دیا۔ فیکٹری کا مالک چاہتا تھا کہ جس طرح فیکٹری کا نقشہ جابر نے تیار کیا ہے۔ اسی طرح ملازمین کے لئے کوارٹرز بھی جابر ہی بنائے۔ مگر جابر نے فیکٹری کے مالک کو دو ٹوک صاف جواب دے دیا۔

”دیکھیں جناب۔ سیدھی سی بات ہے۔ ان کوارٹرز میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں دو، دو کمروں کے مکانات کا نقشہ نہیں بنا سکتا کوارٹرز میں رکھا ہی کیا ہے۔ دو کمرے، ایک باتھ روم، دو وینڈوز اور ہاں بکن۔۔۔۔۔ ایک سلینٹ رکھ دیں۔ مٹی کے تیل کا چولہا اور۔۔۔۔۔“

کوارٹرز تیار ہیں۔“

فیکٹری کے مالک نے جابر کو کافی حد تک سمجھا یا۔ منانے کی کوشش کی۔ مگر جابر پر تو کوئی اور کسی قسم کا اثر نہیں ہوا۔ پھر فیکٹری کا مالک خاموش ہو گیا۔ ایک طرح سے فیکٹری کے مالک کو ڈر بھی تھا کہ اگر اس نے جابر سے مزید بحث کی۔۔۔۔۔ اصرار کیا تو جابر کہیں اس سے فیکٹری کا نقشہ بھی واپس نہ لے لے۔

جابر کو ایک سرکاری عمارت کے عمدہ نقشے کے عوض بڑے انعام و اکرام سے نوازا جا رہا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک تقریب میں اس کی ”دی آرکیٹیکٹ“ کا خطاب بھی دیا گیا۔ گویا اب جابر کی ذات کا واحد حوالہ اس کا پیشہ ہی رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب جابر انسان بھی کم کم ہی رہ گیا تھا۔

وہ اپنے اس خطاب پر بہت مسرور تھا۔ بات خوشی کی ضروری تھی۔ مگر اس خطاب کو پالینے کے بعد اس میں پہلے سے زیادہ رجحان آگئی تھی۔ وہ اور زیادہ مغرور ہو گیا تھا۔

فیکٹری کے کوارٹرز والی بات جب مزدور یونین کے لیڈر کو ملی تو وہ سراپا احتجاج بن گیا۔ فیکٹری کے مالک نے اسے بہت روکا مگر وہ مانا اور ایک دن جابر کے دفتر پہنچ گیا۔

”سنائے کہ آپ نے کوارٹرز کے نقشے پر سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے؟“ مزدور لیڈر نے جابر سے استہفامیہ لہجہ میں کہا۔

”جی درست سنائے۔ بھلا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“ جابر نے اٹھائی سے پوچھا۔

”جی بالکل۔ کیونکہ ہم لوگ اسی فیکٹری کا حصہ ہیں۔ مزدوروں کو فیکٹری سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوارٹرز سے آپ کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، نقشہ بنانا آپ کا پیشہ ہے، آپ کو اس کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔“ مزدور لیڈر جابر کے سامنے اپنے ساتھی مزدوروں کا دفاع کر رہا تھا۔

”میں اپنی میرٹھی کا مالک ہوں۔ میں نقشہ

مزدور بنانا ہوں۔ مگر میرے بنائے نقشے کوارٹرز کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ محلوں، کٹھنوں، بنگلوں اور بڑی عمارت کے لئے ہیں۔ میرے ڈیزائن کئے ہوئے بیڈ روم میں لاکھوں روپوں کا سامان آرائش ہوتا ہے۔ میرے بنائے ہوئے بکن الٹی کے ساز و سامان سے مزین ہوتے ہیں۔ اور تمہارے کوارٹرز۔۔۔۔۔ تمہارے کوارٹرز میں جملہ سامان کیا ہوگا دو دو بیڈز، ایک گیس سلنڈر، چولہا، ایک الماری اور بس۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ جابر نے بولتے ہوئے کہا اور ساتھ والے کلاک پر نظر ماری۔ ”اب آپ جاسکتے ہیں۔ آپ میرا وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلا جاتا ہوں۔“ مگر ”دی آرکیٹیکٹ“ صاحب۔ میں تو آپ کا وقت ہی برباد کر رہا ہوں۔ مگر آپ خود کو برباد کر رہے ہیں۔“ لیڈر یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

جابر کو اسی طرح دو تین اور مواقع ملے۔ مگر ”دی آرکیٹیکٹ“ بن جانے کے بعد اس کی سوچ میں بھی رجحان اور مغروری درآئی تھی۔ وہ انجانے میں ایسی فالتوں کا روزمرہ بن گیا تھا۔ جس سے کسی نہ کسی کی دل شکنی ضرور ہوتی۔

اس دل شکنی کے سلسلے کے ساتھ ساتھ اس کی کامیابیوں کا بھی سلسلہ بھی قائم تھا۔ کامیابی اور دل شکنی کے مرکب کے ساتھ ”دی آرکیٹیکٹ“ کا سفر جاری رہا۔ دل شکنی کے شکار ہونے والے بھی حیران تھے کہ آخر خدا نے جابر کو اب تک اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے؟

ایک بڑے سیاسی لیڈر کے ذاتی گھر کا نقشہ بنایا جا رہا تھا۔ گھر کی بالکونی کی ساری خوب صورتی محض اس لئے خراب ہو رہی تھی کہ گھر کے سامنے والے دینی مدرسے کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات بالکونی کے حسن کو خراب کر رہی تھی۔ دینی مدرسے کی عمارت ایک عام سی عمارت تھی، بالکونی کے حسن کو بچانے کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس دینی مدرسے کی کبھی کبھار کوئی خوب صورتی بڑھادی جائے۔

”دی آرکیٹیکٹ“ کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج تھا۔

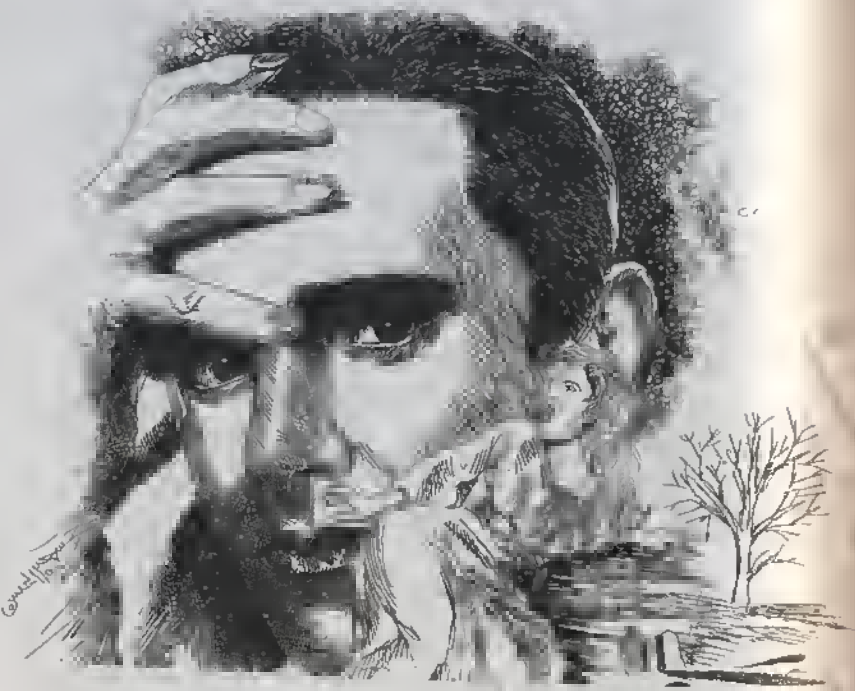
وہ سیاسی لیڈر کو کبھی نہ کچھ نہ کدھانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کر کے اب اس پروجیکٹ پر مصروف عمل ہو گیا تھا۔

اپنے تمام اثر و رسوخ استعمال کر لینے کے باوجود وہ دینی مدرسے کو وہاں سے کہیں اور منتقل کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ مدرسے میں مزید زیبائش کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ پھر ایک دم اسے ایک بہت ہی لغو خیال آیا۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے متعلقہ حکام سے بات چیت کی اور دیکھ کہ یہ خیال بظاہر ٹھکے کے لئے بہت فائدہ مند تھا اس لئے یہ خیال فوراً ہی مان لیا گیا مگر حقیقت اس خیال سے دینی مدرسے کا تقدس بری طرح پامال ہو رہا تھا۔ مگر اس کی فکر نہ ”دی آرکیٹیکٹ“ کو تھی اور نہ ہی ٹھکے کو۔۔۔۔۔

پھر بالکونی کا حسن اس طرح بچا لیا گیا کہ دینی مدرسے کے اس حصے پر جو بالکونی سے نظر آتا تھا۔ ایک کثیرالمنزلہ عمارت بنادی گئی اس عمارت کو ایک ”بار“ کی شکل دی گئی۔ بظاہر یہاں سوفٹ ڈریک اور الکلوفٹ پلائی جاتی تھی۔ مگر جہاں قانون زم ہو وہاں سوفٹ ڈریک اور الکلوفٹ کا اقتدار قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ”بار“ کچھ ایسی خوبصورتی سے بنایا گیا تھا کہ رات کو وہاں سے رنگے ہوئے فانوس کی روشنی شیشوں سے منعکس ہو کر گیلری میں پڑتی تھی جو اس مکان کی بالکونی کو اور بھی خوبصورت کر دیتی تھی۔

اس بات پر عوامی احتجاج ہوا مگر پھر عوام کو یہ یقین دلا کر بات ختم کر دی گئی کہ اس ”بار“ کی آمدنی مدرسے کو دی جاتی ہے۔ مگر یہ حقیقت کسی کو بھی نہیں معلوم تھی کہ باری آمدنی کس کی جیب میں جاتی ہے۔

اپنی اس تیج پیڑہ اور بھی اونچی پرواز کرنے لگا۔ ”دی آرکیٹیکٹ“ نے اب اپنا اصل نام بھی لیتا اور استعمال کرنا بند کر دیا تھا۔ ہر جگہ ہر موقع پر وہ اب اپنے اسی خطاب سے پکارا بلایا جاتا تھا۔ جو انسان اپنے نام کی حفاظت نہ کر سکے، اس کا نام دنیا میں بھی کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ مگر وہ اس فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اب وہ جیب۔۔۔۔۔



## شہاب شیخ

## تابوت

ایک آواز سنائی دی مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تم جیسے عامل کا بھی انجام ہوتا ہے، تم جیسے نام نہاد جھوٹے مکار عامل، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے دھونگ بجا کر عمل کا سہارا لیتے ہیں، اور پھر عیش پرست بن جاتے ہیں۔

ایک ناویدہ قوت کی ہمت تاک داستان، جسے پڑھنے والے خوشی سے عیش کرنا نہیں گئے

”یہ گھر تو تمہاری پسند کا ہے ناں؟“ میں نے اپنی بیوی ماروٹی سے پوچھا جو کہ گزشتہ تین ماہ سے گھر کی تبدیلی کا واویلا چارے تھی۔ میرے سوال پر اس نے میری طرف دیکھا اور حسب عادت خشک لہجہ میں بولی۔

”ہاں بس ٹھیک ہی ہے گزارا ہو جائے گا۔“ میں نے تو تم سے کہا تھا کہ یہاں شفقت ہونے سے پہلے اس گھر کو ایک نظر دیکھ لو لیکن تم نے ہی

اس کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھیڑیے اب بہت قریب آئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا جیسے ہی اس کی نگاہ نے بھیڑیوں پر پڑی، وہ بے اختیار یوگھلاہٹ کے عالم میں بھاگ کھڑا ہوا۔

مگر بھیڑیوں نے اسے شکار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کے بھاگنے کی رفتار بھی قابل دیدنی بھاگتے بھاگتے وہ سمت کا تعین کرنا بھول گیا۔ اور کچھ جنگل میں آگہرا۔ ان بھیڑیوں نے آن واحد میں اسے جالیا۔ وہ کرب آلود انداز میں چیختے لگا تھا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ ادھر تا چلا گیا۔

کئی روز بعد وہاں سے گاؤں کے کسی آدمی کا گزر ہوا۔ کسی تعین نے اس آدمی کے قدم روک لئے۔ اس نے وہاں کسی انسانی لاش کو دیکھا جو بری طرح سے بھنجوڑی ہوئی تھی۔ چہرہ شاخت میں نہیں آ رہا تھا۔ جسم کا، کافی حد تک گوشت چب ہو گیا تھا اس آدمی نے مدد کے لئے دوچار اور لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ سب لوگ سمجھ گئے کہ یہ شخص بھیڑیوں کا شکار ہوا ہے۔ لوگوں نے شاخت کے لئے اس کی تلاشی لی تو ایک جیب سے اس کا کارڈ نکل آیا۔ جس پر انگلش میں ’کوئی آرکیٹیکٹ‘ لکھا ہوا تھا۔ ان الفاظ کو پڑھ کر لوگ سمجھ کر یہ کوئی غیر مسلم شخص ہے۔ اسی گاؤں کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق غیر مسلم کو اور وہ بھی بھیڑیوں کے شکار کو مسلمانوں کی طرح دفن کرنا گناہ تھا۔ ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور خاموشی سے لاش کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

ان لوگوں کو کلم بھی نہ ہوا کہ یہ ایک ماہر تعمیرات کی لاش تھی جو زمین پر خوب صورت اور بلند والا عمارتوں کے نقشے بناتا تھا۔ مگر زمین پر اب اس کا اپنا کوئی نقش نہیں تھا۔ وہ بے نشان ہو چکا تھا۔ اس کا نام بھی فنا ہو چکا تھا اور وہ خود بھی حد سے زیادہ مغرور بن جانے والوں کا شاید یہی حشر ہوتا ہے۔



میں اپنا ملاقاتی کارڈ رکھتا، اس کارڈ پر اس کا نام درج نہیں تھا۔ بلکہ انگلش میں صرف ’’دی آرکیٹیکٹ‘‘ لکھا ہوا تھا۔ یہ خطاب اس کی مکمل پہچان تھا۔ سب ہی کو جان لیتے تھے۔ اور اب اس شخص سے جاہر بہت دور چلا گیا تھا۔ اور ایک اچھا انسان تو کافی پہلے چلا ہی گیا تھا۔

وقت کے تازیانے، نے اسے کامیابیوں کی مار مارا تھا۔ وہ کچھ کچھ پور رہنے لگا تھا۔ مگر شاید اب بہت دیر ہوئی تھی۔ جہاں سے واپس لوٹنا شاید بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

شہر سے دور کسی گاؤں کو ملانے کے لئے ایک پل کا نقشہ اس نے مکمل کر لیا تھا۔ اور اب کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس پل کے مکمل ہو جانے کے بعد اس کا نام اور بلند ہو جاتا۔ کیونکہ پل کا نقشہ بہت اٹوکھا بنایا گیا تھا۔

عمارتوں کے نقشے بنانے والا یہ شخص اب ہر وقت اسی دھن میں لگا رہتا کہ یہ پل جلد از جلد مکمل ہو جائے تاکہ ’’دی آرکیٹیکٹ‘‘ کا نام اور بھی روشن ہو! سمجھا کہ نقشہ نہ بنانے والا، مزدوروں کے کوارٹرز کا نقشہ نہ بنانے والا اور دوسرے کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والا، اب پل کی تعمیر مکمل ہونے کے لئے خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ کیونکہ اگر یہ پل وقت پر مکمل نہ ہو پاتا تو اس کے نقشے کی بہت بدنامی ہوتی۔

ایک روز وہ پل کے کام کی نگرانی کر کے اپنی گاڑی میں واپس لوٹ رہا تھا کہ رات سر پر آگئی۔ راستہ بھی سنسان تھا۔ گاؤں سے گزر کر کچی سڑک پر آنے میں آدھا گھنٹا لگتا تھا۔ وہ تھکن سے چور تھا۔ اسے گاڑی چلانے میں بے حد دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لئے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی اور خود باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے درختوں کے پیچھے سے کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ مگر ان جنگلی بھیڑیوں نے



انکار کر دیا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے پسند کر لیا ہے تو مجھے بھی پسند آجائے گا لیکن بات وہی ہے کہ آج تک ہمارا مزاج مل ہی نہیں سکا تو کیا کیا جاسکتا ہے۔“ اس کا لہجہ حسب عادت تلخ ہو گیا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو کسی حال میں خوش نہیں رہتی تھی۔ میں رات دن اس کی خاطر محنت کرتا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا لیکن ہر وقت اس کا مزاج بگڑا ہی رہتا تھا۔ ہماری شادی کو چھ سال ہو چکے تھے، ہمارے دو بچے شکستہ اور ابے تھے۔ ماروٹی جب شادی کے بعد میرے گھر آئی تو تب ہی سے اس کا مزاج اچھا نہیں تھا۔ میں سوچتا تھا کہ بچے ہو جائیں گے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن بچوں کے بعد تو اس کا مزاج مزید بگڑ چکا تھا۔ میں ہمیشہ درگزر کرتا تھا کیونکہ میں گھر کو آباد رکھنا چاہتا تھا۔

میں ماروٹی کی بات پر کچھ نہ بولا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا اور لان کا جائزہ لینے لگا جہاں کافی خوردو گھاس تھی، میں نے سوچا کہ آج تو تھک گیا ہوں کل اسے کاٹ دوں گا۔

☆.....☆.....☆

ہمیں نئے گھر میں آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس دوران صرف یہ ہوا تھا کہ رات کے وقت ہمارے اسٹور سے سکیوں جیسی آوازیں آتی تھیں۔ اتفاق یہ تھا کہ یہ آوازیں صرف میں نے سنی تھیں۔ میں آرٹیکلٹ تھا اور رات دیر تک اپنے روم میں کام کرتا رہتا تھا۔ اسٹور روم اس کے قریب ہی تھا رات تین بجے کے قریب سکیوں کی آوازیں آتی تھیں اور جب میں اسٹور میں پہنچا تو وہاں کوئی نہیں ہوتا اور میری موجودگی میں آوازیں بھی نہیں آتی تھیں۔ میں اس حوالے سے یوں پریشان تھا کہ اگر کسی رات ماروٹی نے یہ آوازیں سن لیں تو میرے لئے نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ فوراً یہ مکان چھوڑنا چاہے گی اور ایک بار پھر مجھے نئے مکان کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑے گا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ماروٹی بچوں کو لے کر اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میں گھر پر آیا تھا اور لان میں بیٹا چائے پینے کے ساتھ ساتھ ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

اجانک اسٹور کی طرف سے کسی عورت کے رونے کی آواز آنے لگی۔ میں چونک کر اٹھا اور تیز تیز قدموں سے اس جانب چل پڑا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے اسٹور کا دروازہ کھولا، اندر نیم تاریکی تھی۔ ایک کونے میں کوئی عورت کھڑی تھی جو زیادہ تاریکی میں تھی اور ہولے کی صورت میں مجھے نظر آ رہی تھی۔ ”کون ہو تم؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں تمہاری مدد چاہتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری مدد؟..... لیکن تم ہو کون؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ یہ کوئی ماروٹی کا معاملہ ہے۔

”یہاں میرے پاس آ جاؤ، تمہیں سب بتا دیتی ہوں۔“ وہ بولی۔

میں اس کی بات سے ذرا پریشان ہوا کہ آخر وہ مجھے اپنے آپ کیوں بلا رہی ہے، کہیں مجھے نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتی؟ بے شمار دوسرے اور خیالات میرے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہے تھے، میں نے اس سے کہا۔ ”تم میرے پاس آ جاؤ۔“

”میں یہاں سے دو چار قدم سے زیادہ نہیں چل سکتی، تم یہاں آ جاؤ، گھبراؤ نہیں، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“ اس نے یقین دلایا۔

میں نے سوچا کہ اگر میں اس کے پاس نہ گیا تو بعد میں نہ جانے وہ کیا کچھ کرے اور کہیں یہ معاملہ ماروٹی تک نہ پہنچ جائے، ویسے بھی میں بہادر شخص تھا، موت سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔

میں محتاط انداز میں چلتا ہوا اس سے ذرا فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے،

تم کون ہو؟“

”میرا نام راکیشوری ہے، مجھے ظلم کی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے، تم اگر چاہو تو میری مدد کر سکتے ہو اور اگر نہ چاہو تو تمہاری مرضی، میں اصرار نہیں کروں گی۔“ اس کا لہجہ مظلومیت سے بھرپور تھا۔ میرا خوف دور ہوا اور دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوا لیکن پھر بھی میں پوری طرح محتاط تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہاری حیثیت کیا ہے اس وقت، یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم انسان نہیں ہو؟“

”میں انسان ہی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”لیکن..... تم یہاں کیسے رہ رہی ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”تمہارا اندازہ تو درست ہے کہ میں اس وقت انسانی شکل میں نہیں ہوں، میری آتما ہے میرا جسم تو کہیں اور قید ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ..... وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ابوالہول کے بجسے کے قریب۔“ اس نے جواب دیا۔

”ابوالہول؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن وہ تو مصر میں ہے؟“

”ہاں، وہیں میرا جسم قید ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ..... لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا گا کیونکہ میں مصر نہیں جاسکتا۔“ میں نے معذرت کی۔

”کیا وجہ ہے کہ تم وہاں نہیں جاسکتے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ایک کھنپی میں ملازم ہوں اور پھر میں تنخواہ دار آدمی ہوں، اس تنخواہ سے اپنے گھر کا خرچ چلاتا ہوں، بال بچوں کی ذمہ داریاں ہیں مجھ پر۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر تمہارے یہ مسئلے حل ہو جائیں تو کیا تم میری مدد کرو گے؟“ وہ بولی۔

”کیا مطلب.....؟“ میں نے اس کی طرح ہونے سے یہ

مسئلے حل؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر تمہیں ایک کروڑ روپے مل جائیں تو کیا تم ان تمام مسائل سے آزاد ہو جاؤ گے؟“ اس نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”ایک کروڑ؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں..... کیا اتنے میں تمہارے سارے مسائل حل نہیں ہو جائیں گے؟“ وہ بولی۔

”لیکن..... یہ ایک کروڑ کون دے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں دوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم؟“

”ہاں۔“

”لیکن کیسے؟“

”کیسے دینے ہیں یہ میرا کام، تم یہ بتاؤ کہ اگر یہ رقم تمہیں مل جائے تو کیا تم میری مدد کرنے پر راضی ہو؟“

ایک کروڑ بڑی رقم تھی، میں تو اس سے بڑا کاروبار بھی کر سکتا تھا، اتنی رقم سے تو میں بلڈر بھی بن سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ روح صحیح کہہ رہی ہے تو میں امیر ہو کر ایک اچھی زندگی گزار سکتا ہوں اور اگر اس کے کچھ غلط ارادے ہیں تو پھر یہ کسی نہ کسی طرح مجھ سے پورے کر دیا سکتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”مجھے کس طرح تمہاری مدد کرنی ہوگی؟“

”ابوالہول کے بجسے کے پاس میرا تابوت دفن ہے، اسے نکالنا ہوگا وہاں سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ کام کسی اور سے بھی تو لے سکتی ہو؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، اگر تم نہ کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے لیکن پھر یہ گھر تمہیں چھوڑنا پڑے گا، ہو سکتا ہے کہ تمہارے بعد آنے والوں میں سے کوئی میری مدد کر سکے۔ تم سے پہلے جو بھی کرائے دار یہاں آ کر

رہے، میں ان سے بھی مدد چاہتی تھی لیکن وہ لوگ مجھ سے بات نہ کر پائے اور میری سسکیاں سن کر بھی یہاں سے چلے گئے، تم پہلے آدی ہو جس نے مجھ سے بات کرنے کی ہمت کی ہے، اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری زندگی کو کتنا خطرہ ہوگا؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔  
 ”بالکل بھی نہیں، بس ایک منتر میں تمہیں بتا دوں گی جو پڑھ کر تم نے تابوت کھولنا ہے اور اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔  
 ”کیا بس یہی کچھ کرنا ہے یا کچھ اور بھی ہے؟“ میں نے احتیاطاً پوچھا۔

”اور کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔  
 میں نے سوچا کہ کیا کیا جائے؟ ایک کروڑ روپیہ میری زندگی بدل سکتا تھا، کام بھی کچھ خاص مشکل نہیں تھا۔  
 ”تم جاؤ تو آرام سے سوچ کر جواب دے دینا۔“ وہ درج بولی۔

”ٹھیک ہے، میں کل تمہیں اس وقت جواب دے دوں گا۔“ میں نے اس کی طرف سے مہلت مل جانے پر مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ وہ بولی۔

میں اسٹور سے نکلنے کے بعد واپس لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن اس روح میں الجھا ہوا تھا۔ اگلے روز تک میں نے خوب سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ ایک کروڑ روپیہ کمانے کا موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔ یہ رقم میرے اور میرے بچوں کے شاندار مستقبل کی ضمانت تھی۔

میں وقت مقررہ پر اسٹور میں پہنچ گیا روح اپنی سابقہ جگہ پر موجود تھی۔ ”کیا سوچا تم نے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”میں نے تمہارا کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”کل تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی۔ ایک بوڑھا آدمی تمہیں یہ رقم دے جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”رقم دینے کے بعد میں تمہیں بتاؤں گی کہ میرے لئے تم نے کیسے کام کرنا ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”بس اب تم جاؤ۔“ اس نے جانے کا اشارہ کیا اور میں پلٹ کر واپس آ گیا۔

میں لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ ماروٹی دس دن کے لئے لگی تھی اس لئے میں اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ اگلے روز صبح گیارہ بجے میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ میں اٹھ کر مین گیٹ پر آیا، اسے کھولا تو میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک کالا بریف کیس تھا۔  
 ”آپ ہی شام بلاؤ ہیں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ آپ کی رقم۔“ اس نے بریف کیس مجھے دیا اور مزید کوئی بات کہنے بغیر پلٹ کر چل پڑا۔ میں تیزی سے واپس گھر آ گیا اور پھر گیٹ کا پلوٹ چڑھانے کے بعد میں نے ڈرائنگ روم میں پہنچنے میں بھی دیر نہیں کی، میں صوفے پر بیٹھ گیا اور بریف کیس میں نے سینزل ٹیبل پر رکھ کر اسے کھول دیا۔ وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے نوٹ چیک کئے۔ ”وہ سب اصلی تھے۔“

میں نے بریف کیس اپنی الماری میں لاک کر دیا اور اسٹور میں پہنچ گیا۔ وہاں روح موجود تھی۔ مجھ سے بولی۔  
 ”مل گئی تمہیں رقم؟“  
 ”ہاں مل گئی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہارا کام ہو گیا، اب میرا کام شروع ہوتا ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں دس دن دے رہی ہوں۔ ان دس دنوں کے اندر اندر تمہیں ابوالہول کے جیسے تک پہنچنا

”جیسے جیسے معاملات بھی متناہ۔“ وہ بولی۔  
 ”ٹھیک ہے لیکن اب تم ایسی کوئی حرکت نہ کرنا کہ جس سے میری بیوی خوف زدہ ہو جائے۔“

میں نے کہا۔  
 ”تم بے فکر رہو۔“ اس نے قلمی آئینہ انداز میں کہا۔ ”میں جو کچھ بھی کرتی تھی صرف اس لئے کہ کوئی میری طرف متوجہ ہو، اب تم سے میری بات ہوگئی ہے تو مجھے اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”وہ منتر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”جب تم روزانہ آنے لگو گے تو میں تمہیں بتا دوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”بس اب تم جاؤ اور اپنے معاملات دیکھو۔“

اس نے جانے کا اشارہ کیا۔  
 میں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ماروٹی کو حقائق نہیں بتاؤں گا بلکہ اب اسے اپنے رعب میں لے لوں گا۔

میں فون کر کے شام میں ماروٹی کو بلا لیا۔ اس نے آتے ہی اپنے بیچ انداز میں کہا۔ ”تمہیں چین نہیں ہے، لہذا کیا آفت آگئی ہے کہ مجھے یہاں فوراً بلا لیا ہے۔“  
 ”زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کتھی سے کہا تو حیرت اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے مجھ سے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ غصے سے بولی۔

”کیس انداز میں بات کر رہے ہو تم؟“  
 ”تمہاری اوقات کے مطابق اسی انداز میں بات کرنی چاہئے مجھے تم سے۔“ میں نے جارحانہ انداز برقرار رکھا۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔“ اس نے ہاتھ دکھاتے ہوئے غصے سے کہا۔ اسی وقت میرا ہاتھ گھوما، اس کے گال پر لگنے والے چانے کی آواز کافی زوردار تھی۔ میں نے کہا۔

”تم کیا توڑو گی میرا منہ، میں پہلے توڑ دیتا ہوں۔“ وہ کچھ سمجھ گئی تھی اور پھر اس نے عورت کی فطرت کے مطابق رونا شروع کر دیا۔  
 ”کیوں رو رہی ہو؟“ میں نے ہی سے پوچھا۔  
 ”تم نے اب مجھے مارنا بھی شروع کر دیا ہے۔“

اس نے مفادمانہ انداز میں احتجاج کیا۔  
 ”میں تمہاری ہڈی پہلی بھی توڑ سکتا ہوں۔ لیکن نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا، تم میری بچی ہو، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا اور سینے سے لگالیا۔ وہ سکے لگی۔ میں نے اسے پیار کیا۔ اس نے شکست تسلیم کر لی۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور بولا۔ ”دیکھو! میں تمہارے لئے ایک گھر خرید رہا ہوں۔“

”کیا؟“ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔  
 ”ہاں۔“ میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

”لیکن..... پیسے کہاں سے آئیں گے؟“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔  
 ”میں نے ایک بڑی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے۔ میرے پاس عمارتیں بنانے کا تجربہ ہے، اس کے پاس پیسہ ہے، ہم دونوں مل کر کام کریں گے، وہ مجھے کچھ رقم ایڈوانس بھی دے رہے ہیں تاکہ میں تمام جھنجھٹ سے آزاد ہو کر اس کے ساتھ کام کروں۔“

”اوہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں، اس کے ساتھ مجھے غیر ملکی دوروں پر بھی جانا ہے، میں اپنے کاغذات وغیرہ تیار کرواؤں گا، اس دوران تم اپنی مرضی کا کوئی مکان دیکھ لو جو تیس لاکھ تک کا ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں لاکھ۔“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔  
 ”ہاں۔“ میں مسکرایا۔ ”جب قسمت کی دیوی

مہربان ہوتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“  
 ”اوہ..... تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

”یہ مجھے آج پہنچا ہے کہ میں اتنا اچھا ہوں۔“  
 میں نے دھیرے سے ہنس کر اسے لپٹا دیا۔  
 ”مجھے معاف کرو، میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آتی رہی ہوں۔“ وہ بولی۔  
 ”چلو معاف کر دیا۔“ میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر شوخی سے مجھے دیکھا اور پھر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اور میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

☆.....☆.....☆  
 میں نے اپنی تیاریاں مکمل کیں۔ ماروئی مکان تلاش کر رہی تھی اس لئے اسے اس کی ماں کے گھر بھیجا اور اسٹور میں پہنچ گیا۔ روح وہاں موجود تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں نے اپنی تیاریاں مکمل کر لی ہیں، اب مجھے وہ مہتر بتا دو اور یہ بھی بتا دو کہ وہ تابوت کس جگہ پر ہے؟“

اس نے مجھے ایک چھوٹا سا مہتر بتایا۔ اس کے الفاظ میں نے آسانی سے یاد کر کے اسے سنائے۔  
 ”بس یہ مہتر تین مرتبہ نہیں پڑھنا ہے اور جب تم یہ مہتر پڑھو گے تو تمہارے اطراف میں ایسا اندھیرا چھا جائے گا کہ تمہیں کوئی دیکھ نہیں سکے گا، تم سکون سے اپنا کام کرنا اور وہاں سے چلے جانا، اس تمام کارروائی کے دوران وہی بوڑھا شخص تمہارے ساتھ ہوگا جس نے تمہیں رقم دی تھی۔“ وہ بولی۔

”تو کیا میں اسے بھی ساتھ لے کر جاؤں؟“  
 میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں وہ تمہیں وہاں مل جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”تم جب قاہرہ پہنچو گے تو وہاں اس بوڑھے سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی، وہ تمہیں ہوٹل میں

ٹھہرائے گا اور تمہارے ساتھ ساتھ رہے گا۔“  
 نے بتایا۔

”یہ تو اچھا ہے گا۔“ میں نے کہا۔  
 ”اس کے علاوہ دیگر ہدایات اور ضروری باتیں وہ تمہیں بتا دے گا۔“ وہ بولی۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”بس اب تم جاؤ۔“ اس نے جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں پلٹ کر چل پڑا۔

☆.....☆.....☆  
 میں قاہرہ کے ایئر پورٹ سے باہر آیا تو میری نگاہیں اس بوڑھے کو تلاش کر رہی تھیں اور پھر جلد ہی مجھے نظر آ گیا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے تیزی کے ساتھ نکلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے ادب سے پوچھا۔

”باگلل ٹھیک۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”آئیے اس طرف آ جائیں۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ہم دونوں چل پڑے۔

کچھ دیر بعد ہم پارکنگ میں آ گئے۔ یہاں کافی کاریں کھڑی تھیں۔ ہم ایک بلیک کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے کار چلا دی۔  
 مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد کار ایک کثیر المنزل ہوٹل کے پارکنگ لٹ میں آ کر رک گئی۔  
 ”آئیے جناب“ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔

”ہم کار سے اترنے کے بعد ہوٹل کے اندر آ گئے۔ بوڑھے نے ریسپشن سے چابی لی اور پھر ہم لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کے ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ شان دار کمرہ تھا۔ آسانس کی بانی چڑیں یہاں موجود تھیں۔ وہ دیرپگی کمرے کے وسط میں موجود تھے۔ ہم ایک طرف صوفوں پر آئے سانسے بیٹھ گئے۔  
 ”کھانے کا وقت ہو رہا ہے، کھانا منگو لیا جائے؟“ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔

”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، تم اپنے لئے منگولو۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں کھا چکا ہوں۔“ وہ بولا۔  
 ”او، تو پھر رہنے دو، میں تو ابھی صرف کولڈ ڈرنک لوں گا کیونکہ موسم گرم ہے اس علاقے کا۔“ میں نے کہا۔ ہوٹل کے کمرے میں اسے سی چل رہا تھا۔  
 ”میں ابھی منگو لانا ہوں۔“ وہ بولا اور اٹھ کر انٹر کام پر آرڈر دینے کے بعد واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔  
 ”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”گوپال۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارا راکیشوری سے کیا رشتہ ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا اور تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے ان کے معاملات میں دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔  
 ”وہ بیٹی ہے میری۔“ اس نے جواب دیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔  
 ”بیٹی؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”نا فرمان بیٹی، اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہے۔“  
 ”اوہ..... کیا تم مجھے اس سلسلے میں کچھ بتا پاند کرو گے؟“ میں نے کہا۔

اس نے بس انداز میں ایک سر دھمکی اور بولا۔  
 ”میں اسے منع کرتا تھا کہ کسی جاچ عمل اور جادو ٹونے کے چکر میں نہ پڑے لیکن وہ مجھ سے چھپ چھپ کر سچائی رہی اور کسی عامل نے اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیا، وہ مصر میں ہے کہہ کر آئی تھی کہ ابھرام مصر دیکھنے اور ان پر کچھ ریسرچ کرنی ہے لیکن پھر یہ کہانی نکلی کہ جس عامل سے وہ عملیات سکھ رہی تھی اس نے اسے عمل میں استعمال کر لیا اور یہ اس حال کو پہنچی۔“

”یہ تو فوسناک صورت حال ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”میں ایک ارب پتی آدمی ہوں، زیادہ تر ملک سے باہر رہتا ہوں، میرا بڑا بیٹن ہے، راکیشوری کی ماں بوڑھی ہے، راکیشوری اس کی ایک بیٹی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”یہ جو کام تم مجھ سے لے رہے ہو، یہ تو کسی اور سے بھی لے سکتے تھے؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ

نگاہوں سے دیکھا۔

”راکیشوری سے میں نے کہا تھا کہ میں کسی سے بات کرتا ہوں لیکن اس نے بتایا کہ کچھ ایسی مجبوری ہیں کہ وہ خود ہی جس سے بات کرے گی وہی شخص یہ کام کر سکتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا تو یہ بات ہے؟“ میں نے کہا۔  
 ”یہ عملیات اور جادو ٹونے کی دنیا ایسی ہی ہے، اس میں عجیب و غریب صورت حال ہے اور عجیب و غریب شرائط ہوتی ہیں۔“ وہ گال کھاتے ہوئے بولا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔  
 وینٹر اندر آنے کے بعد ہمارا آرڈر سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ ہم کولڈ ڈرنک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”وہاں ابوالہول کے بجسے کے پاس جا کر کب کام کرنا ہے؟“ میں نے گوپال سے پوچھا۔

”نکل چلیں گے دن میں۔“ اس نے جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔“ یہ مصر بھی سحر داسر کی وجہ سے بڑی عجیب و غریب اور حیرت ناک سرزمین رہی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابوالہول کے بارے میں بھی میں نے سنا ہے کہ اس کی اپنی کوئی حیرت ناک تاریخ ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”ابوالہول کا لفظی مطلب ہے ”خوف کا باپ“ یہ عربی کا تلفظ ہے۔ اس سے پہلے اس کا نام بھلیت تھا۔ شروع میں اس جگہ کا پورا دھڑ ریت میں دبا ہوا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بت کوئی طلسم ہے۔ انگریزی میں اسے SPHINX کہتے ہیں۔ یہ لفظ یونانی سے آیا ہے۔ اس سے مراد ایک پراسرار عفریت ہے جس کا سر اور سینہ نسوانی تھا۔“

”تمہیں اس کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔  
 ”ہاں، اس طرح کی عالمگیر معلومات رکھنا میرا



شوق ہے۔" وہ بولا۔ "ابوالہول کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے اسے فرعون خاثر نے تیار کروایا تھا جبکہ بادشاہ ایڈیپس سے بھی اس کا تعلق کچھ یوں جوڑا جاتا ہے کہ ایڈیپس کی داستان کے مطابق ابوالہول دیوتاؤں کی تخریبی قوتوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ ہر کسی سے یہ پہیلی پوچھتا تھا کہ وہ کون ہے جو صحیح چار ناگوں پر چلتا ہے دو پیر کو دو ناگوں پر اور شام کو تین ناگوں پر؟ جو اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکتا تھا وہ اسے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ آخر ایڈیپس نے یہ پہیلی بوجھ لی اس پر آفٹکس نے، خودکشی کر لی اور ایڈیپس بادشاہ بن گیا۔"

"بہت خوب، تم نے میری معلومات میں بہترین اضافہ کیا، کیا تم اس کے بارے میں مزید بھی کچھ جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بالکل،" وہ بولا۔ "غزہ کے صحرائیں واقع یہ دیوبیکل مجسمہ ہزاروں سال سے دھرتی کے سینے پر پنچے گاڑے کھڑا ہے۔ عہد قدیم میں لفظ ابوالہول کا اطلاق اس مجسمے کے سر پر ہوتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں اس کا پورا دھڑ ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بت ایک طلسم ہے جو وادی نیل کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کی لمبائی 189 فٹ اور اونچائی 65 فٹ ہے، یہ چوکنے کے پتھر کی پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس میں رنگ استعمال کئے گئے تھے۔ اس مجسمے کو سینے ہزاروں سال بیت چکے ہیں لیکن یہ رنگ ابھی بھی نظر آتے ہیں۔ اس کے اگلے دو بچوں کے درمیان پتھر کا ایک کتبہ موجود ہے جس کے مطابق فرعون ٹھوسوس جہنم نے 1420 قبل مسیح تک حکومت کی تھی۔ وہاں اس فرعون کی جوانی کا ایک قصہ بھی درج ہے۔"

"بہت خوب، تمہاری بڑی معلومات ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی بیل بجی اور اس نے جب سے فون نکال کر اس کے اسکرین پر نظر ڈالی اور مجھ سے معذرت کرتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اور میں رائے شوری کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

ہم کار کے ذریعے ابوالہول کے مجسمے کے سامنے پہنچ گئے۔ "یہ دیکھو کسی شان سے کھڑا ہے یہ ابوالہول، مجسمہ گوپال نے ابوالہول کے مجسمے کی جانب اشارہ کر کے بڑے تعریفی انداز میں کہا۔

:"ہاں واقعی، یہ شان دار ہے۔" میں نے خُصے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بڑی شان ہے اس کی۔" گوپال کی نگاہیں اس مجسمے پر تھیں۔ اس کے لہجے اور انداز میں بڑی عقیدت تھی جس پر مجھے کچھ تعجب بھی تھا۔

"اب کیا کرنا ہے، وہ تابوت کس جگہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں، تابوت۔" وہ چونک کر خیالوں سے باہر آیا۔ پھر ایک جانب اشارہ کیا۔ "وہ اس طرف ہے۔" "چلو تو پھر جلدی سے اپنا کام نہٹالیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ضرور۔" اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔ پھر وہ سنبھلا۔

"ہمیں جلد از جلد اپنا کام نہٹا کر یہاں سے جانا چاہئے تاکہ میری بیٹی کو آزادی مل سکے۔" اس نے قدم بڑھائے۔ "آؤ وہ تابوت نکالتے ہیں۔" میں بھی پہل بڑا۔ ہم ایک جگہ پہنچ کر رک گئے۔ اس نے زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہ تابوت اس جگہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کار میں سے سامان لاتا ہوں۔" میں نے کہا اور کار کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ڈرائیور کار سے اتر کر کار کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا "کوئی کھولو، سامان نکالنا ہے۔"

میں اور وہ ڈکی کے پاس آ گئے۔ اس نے جاپانی لگا کر ڈکی کھول دی، میں نے اس میں سے سامان کی بھری اشیا کرکند سے پر لادی اور گوپال کے پاس پہنچ کر بوری کو زمین پر رکھ دیا۔ پھر اس میں سے کدال اور پیچہ نکال لیا۔ کدال سے میں نے زمین کو دھا شروع کر دی۔ اسی وقت

دھارے اطراف میں اندھیرا چھا گیا۔ لیکن یہ اندھیرا کافی دور تھا۔ میں رائے شوری کا دست پڑھ رہا تھا۔

میں نے کچھ محنت مشقت کے بعد زمین میں سے تابوت نکال لیا۔ پھر لوہے کے ایک چھپے راڈ کی مدد سے تابوت کے دھکنے کی ٹکیلیں اکھاڑ کر ڈھکنے ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں کالے کفن میں لپیٹی کوئی لاش تھی۔ میں نے گوپال کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لوہیرا کام تو ختم ہو گیا۔" "تمہارا کام تو اب شروع ہوا ہے۔" گوپال نے بڑی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ اس کے انداز پر میں چونک کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"دراصل اس تابوت میں تم نے لیٹنا ہے۔"

اس نے تابوت کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" مجھے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پراسرار مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر موجو تھی۔

"میں کچھ سمجھا نہیں؟" میں نے کہا۔

"تم نے پانچ سال پہلے عملیات کئے تھے نا؟"

وہ بولا۔ مجھے یاد آ گیا کہ اس وقت مجھے عملیات

سیکھنے کا شوق ہوا تھا اور کچھ عملیات میں نے کئے تھے لیکن

پھر دل اچاٹ ہونے کی وجہ سے اس طرف سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے اس کی بات پر کہا۔

"ہاں کے تو تھے۔"

"وہ جو قبرستان والا جگہ تم نے کاٹا تھا، وہ غلط

ہو گیا تھا، ہم وہی آتما میں ہیں جنہیں تم نے قید کرنے

کے لئے وہ عملیات کئے تھے۔ تم انہیں بھول گئے لیکن ان

کی وجہ سے ہم تکلیف میں آ گئے، ہم ادھر کے رہے اور

نواہر کے، بس اب ہماری ہمت کی بھی ایک صورت تھی کہ

اس تابوت میں تمہیں دفن کر دیا جائے۔ دراصل جوئل تم

نے کیا وہ سینیں مصر کے جادو گروں کا ہے اس لئے تمہیں

یہاں لانا ضروری تھا اور پھر یہ اب کچھ پانچ سال

پہلے کی بات ہے۔

میں نے اس کی بات پر کہا۔

گزرنے کے بعد ہی ممکن تھا اس لئے تمہارے ساتھ یہ کھیل کھیل گیا۔ تم سے جو منتر پڑھوایا گیا وہ بھی خاص تھا جس سے اب تمہارے مرنے کے بعد ہماری ساری تکلیفیں ختم ہو جائیں گی، ہم آزاد ہو جائیں گے، ہا ہا۔۔۔ تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، اس عمل کا یہی طریقہ ہے کہ اگر عامل کا میاب ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ آتما میں اسے اس تابوت میں دفنانے کی کوشش کرتی ہیں، یہ جو اس کا لے کفن میں لاش ہے، یہ بھی تم جیسے کسی عامل کی ہے جسے ہم بھی آتماؤں نے دفنایا ہوگا، ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔" اس کے فلک شکاف ہتھکے بلند ہو رہے تھے اور میرا سر چکر رہا تھا۔ وہ لاش کو کفن سے آزاد کر رہا تھا۔ بلا خراس نے سرزی ہوئی لاش کفن سے نکال کر ایک طرف ڈال دی اور اپنے پہلو سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکال کر اسے لہراتے ہوئے خوفناک پراسرار انداز میں بولا۔ "یہ خنجر سیدھا تمہارے دل میں اترے گا۔"

"مہ۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔" خوف کی وجہ سے میں بے اختیار بولا۔

"ہا ہا ہا۔" اس نے فلک شکاف ہتھکے لگایا اور خنجر

کھینچ کر مجھے مارا۔ میرا اوپر کا سانس اور اور پیچھے کا منچے

رہ گیا۔ موت یقینی تھی لیکن پھر یہ یقین بے یقینی میں بدل

گیا کیونکہ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی اس خنجر کو کسی نے پکڑ

لیا تھا۔ میں نے اس شخص کے چہرے کی طرف دیکھا جو

نہ جانے کس وقت اور کہاں سے نمودار ہو گیا تھا۔ وہ تو

کوئی فقیر دکھائی دے رہا تھا۔ گوپال نے خون خوار انداز میں اس سے کہا۔

"یہ کیا کیا تم نے؟"

"دہی جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔" فقیر نے

اطمینان سے جواب دیا۔

"ہم تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

گوپال آگ بگولا ہو کر بولا۔

"خاموش!" فقیر نے ہاتھ بلند کر کے جلال

کے ساتھ کہا۔ "اللہ والوں سے نکراتا ہے۔" پھر فقیر نے

زیر لب کچھ پڑھا اور گوپال کی طرف پھونک ماری۔



## نقشہ

### نظارت نعر- فیصل آباد

اماوس کی اندھیری راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ اچانک اندھیرے کا سینہ چیرتی ایک خوفناک شکل عورت سامنے آگئی اس کی آنکھوں سے حقیقت میں مانند چنگاری شعاعیں نکل رہی تھیں کہ چشمِ زدن میں.....

کلام الہی بہت زیادہ پر تاثیر ہوتی ہے جس کا حقیقی مشاہدہ اس کہانی میں موجود ہے

**سلیم** کی سانس پھولی ہوئی اور چہرہ

جوش کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اسے دو جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ تیز تیز قدم اٹھاتا جی وہ بھاگنے لگا اور کبھی پھر سے تیز چلنے لگتا۔ اس کا اندازہ دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ آسانی سے لگا سکتا تھا کہ اسے کسی جگہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس کا رخ ایک گراؤنڈ کی طرف تھا چند منٹ میں وہ گراؤنڈ میں

کہا۔ ”کون ہے بابا؟“  
 بولے۔ ”آؤ دکھاؤں۔“ میں ان کے ساتھ اسنور میں آئی۔ وہاں انہوں نے کچھ بڑھ کر پھونکا تو ایک آتما نکل آئی فقیر بابا نے اسے جلا کر جسم کر دیا۔ پھر مجھے بتایا کہ ”آپ کی جان کو بھی خطرہ ہے“ لیکن انہوں نے تسلی دی کہ ”سب خیر ہوگا۔ میں نے ان سے التجا کی کہ آپ کو ہر خطرے سے نکال دیں۔“ انہوں نے تسلی دی اور چلے گئے دہش پریشان تھی، آپ کا سائل نمبر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ عرصہ نہیں لگ رہا تھا کہ آپ کہاں ہیں، سارے ہی خاندان والے پریشان تھے، اپنے اپنے طور پر سب آپ کو ڈھونڈ رہے تھے، میں تو بس آپ کی خبریت کی دعا میں مانگ رہی تھی۔  
 میں نے سوچا کہ کہیں فقیر بابا نے یہ بھی تو نہیں بتا دیا کہ میں نے ہی غلط عمل کر ڈالے تھے۔ میں نے ماروتی سے پوچھا۔ ”اور کچھ بھی کہا فقیر بابا نے؟“  
 ”نہیں بس اتنی ہی بات ہوئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

میں مطمئن ہو کر بولا۔ ”مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا ہو سکتا ہے فقیر بابا نے میری بلائیں ہٹا دی ہوں۔“  
 ”جی ہاں ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آپ اب کبھی غیر ملکی دورے پر نہ جانا۔“ وہ میرے مزید قریب ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”اگر تم وعدہ کر دو کہ مجھے کبھی نہیں لڑوگی اور اسی طرح پیار کرتی رہوگی تو میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“  
 میں نے مسکرا کر شرط رکھی۔ اس نے بڑی معصومیت سے اپنے کان پکڑ لئے اور بولی۔  
 ”لو کان پکڑ لئے، وعدہ پکا وعدہ، اب کبھی نہیں لڑوں گی۔“

اس کی معصومیت پر مجھے پیار آ گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ وہ چھپتی چلی آئی اور میں اسے سینے سے لگا کر دل ہی دل میں فقیر بابا کا شکریہ ادا کرنے لگا۔



گو پال کو آگ لگ گئی۔ وہ جل کر جسم ہو گیا پھر فقیر نے ڈرائیور کا بھی بیکو شتر کیا۔  
 ”بابا تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔  
 ”جاؤ، اب تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔“ فقیر نے میرے شانے پر شفقت سے ہاتھ مارا۔ اس دوران اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ ”جاؤ اب کار لے جاؤ۔“ اس نے کار کی طرف اشارہ کیا۔  
 میں نے بلا سوچے سمجھے چند قدم کار کی طرف بڑھائے پھر یہ سوچ کر پلٹا کہ فقیر کو کبھی کار میں ہی ساتھ چلنے کا کہوں لیکن اس کا تو دور دور تک یہ نہیں تھا۔  
 میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کار کی طرف چل پڑا۔ راستہ مجھے یاد تھا اسی لمحے میں ہول بچھ گیا۔ وہاں سے اپنی اگلی صبح کی فلائٹ کنفرم کی اور پھر اگلے روز اس فلائٹ سے واپس وطن روانہ ہو گیا۔  
 میں گھر میں داخل ہوا تو ماروتی تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور روتے سسکتے ہوئے بار بار کہنے لگی۔ ”آپ خبریت سے ہیں ناں۔ آپ خبریت سے ہیں ناں؟“  
 ”ارے خبریت سے ہوں تب ہی تو تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اتنا پیار جتاری ہو؟“  
 ”میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔“ وہ میرے سینے پر سر کر دے لگی۔  
 ”اچھا چلو وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے اندر تو جا کر بیٹھو۔“ میں نے پیار سے کہا۔  
 ”وہ مجھ سے الگ ہو گئی لیکن اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا، ہم دونوں ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے وہ میرے ساتھ لیٹتی تھی۔“ یہاں تو عجیب ہی کہانی ہو گئی تھی۔ ”وہ بولی۔“  
 ”عجیب کہانی؟“ میں نے تعجب سے کہا۔  
 ”میں دروازے پر کھڑی پڑوسنوں سے باتیں کر رہی تھی کہ ایک فقیر بابا ہمارے سامنے سے گزرے۔ ہمارے گھر کی طرف دیکھ کر مجھ سے بولے۔ ”تیرے گودام میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔“ میں نے حیرت سے

کر کے کوئی پانچ منٹ کے بعد راشداً آدھا کھائی دیا۔  
مارے جوش کے سلیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ تیز تیز  
قدم اٹھاتا قریب آ گیا۔

”کیا بات ہے یار اتم نے تو پریشان کر ڈالا ہے  
ایسی کیا بات تھی کراچی امیر جی میں بلایا ہے۔“  
جواباً سلیم نے اس کے گلے لگتے ہوئے تیز لہجے  
میں کہا۔

”سنو گے تو پھڑک جاؤ گے۔ ایسی خبر ہے  
میرے پاس اگر ہم نے تھوڑی بہت دکھائی تو تمام عمر  
کے لئے عیش ہمارے ہوں گے۔“

”کیوں تو نے کیا قارون کا خزانہ دریافت کر لیا  
ہے۔ جو ساری عمر کے لئے ہمارے عیش ہو جائیں  
گے۔“ راشد نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔ سلیم نے  
جوش سے کہا۔

”تو اور کیا قارون کا خزانہ ہی تلاش کیا ہے۔ بس  
حاصل کرنے کی دیر ہے۔ لو وہ آ گیا اشرف بھی اسے  
آنے دو پھر ایک ساتھ تم دونوں کو تمام بات بتاؤں گا۔“

دونوں ایک طرف سے گراؤنڈ میں داخل ہوتے  
اشرف کو دیکھنے لگے۔ وہ قریب آیا تو دونوں باری باری  
اس کے گلے لگے پھر ایک طرف نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔  
سلیم بڑے راز داری سے آگے کو جھک کر بولا۔

”تم دونوں جانتے ہو تا کہ مجھے کتابیں اور  
کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میں اس شوق کی  
خاطر ملک صاحب کے گھر میں کام کرتا ہوں تاکہ فالتو  
وقت میں ان کی لائبریری سی کتابیں لے کر پڑھ  
سکوں۔“

دونوں لڑکوں نے بے زاری بلکہ قدرے کوفت  
سے اسے دیکھا۔ ”تو تم نے ہمیں یہ بتانے کے لئے بلوایا  
ہے۔ اب میرے کان کھینچو گا کہ گاہک آئے کا نام ہے اور  
میں کھوکھا چھوڑ کر یہاں تیرے پاس بیٹھا گئیں یا نہ کر  
ہوں۔“ اشرف نے غصے سے کہا۔ راشد نے بھی اس کی  
ہاں میں ہاں ملائی۔ تو سلیم کو غصہ آ گیا۔

”اتھو! پہلے میری بات تو توجہ سے سن لو۔ بعد

میں تم نے یہ سوال کرنا تھا کہ مجھے یہ معلومات کہاں سے  
ملی ہیں اس لئے میں پہلے ہی تمہیں بتا رہا تھا۔“  
وہ لمحے بھر کور کا۔ دونوں خاموشی سے اسے دیکھ  
رہے وہ پھر بولا۔

”بس وہیں سے مجھے ایک ایسی کتاب ملی ہے جو  
ہم سب کی زندگیاں پلٹ دے گی۔ ہم راتوں رات  
امیر ہو جائیں گے پھر ہمیں یہ چھوٹے چھوٹے تیرے  
درجے کے کام کر کے اپنے پیٹ کے ایندھن حاصل  
نہیں کرنے پڑیں گے۔“

اس نے سسپنس پھیلانے کو تھوڑا وقفہ کیا۔ کر  
دونوں لڑکے صبر سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ سلیم  
نے سلسلہ کلام پھر جوڑا۔

”کچھ دن پہلی ملک صاحب نے اپنے دادا کے  
زمانے کی کتابیں بھی تہ خانے سے نکلوا کر ایک الماری  
میں لگوا دیں۔ میں انہیں پڑھنے لگا۔ پرسوں میرے  
ہاتھ ایک کتاب لگی اس میں چھپا خزانے کا نقشہ بنا ہوا تھا  
مگر تم جانتے تو ہو کہ میرا دماغ بہت چلتا ہے میں نے وہ  
نقشہ سمجھ لیا بس اب ہم مل کر وہ خزانہ نکالیں گے اور عیش  
کریں گے۔“

راشد اور اشرف نے کھا جانے والی نظروں سے  
اسے دیکھا راشد نے کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تو نے  
نقشہ صحیح دیکھا اور دوسرا یہ کہ ملک صاحب کو اس کتاب کا  
علم نہیں تھا؟ اور اگر تھا تو کہ ایک یقینی بات ہے تو انہوں  
نے اب تک وہ خزانہ لازماً وہاں سے نکلوا لیا ہوگا۔“ سلیم  
نے گھور کر اسے دیکھا۔

”میری قابلیت پر شک کرنے کے بجائے میرا  
ساتھ دینے کا فیصلہ کرو۔ تمہاری پہلی بات کا جواب یہ  
ہے کہ میں نقشے میں درج نشانوں کی مدد سے وہ مطلوبہ  
جگہ جا کر دیکھ آیا ہوں وہاں وہ سب نشانیاں موجود  
ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم سب جانتے ہو کہ ملک  
صاحب کو شراب سے لگاؤ ہے کتاب سے نہیں۔ مجھے سو  
فیصد یقین ہے کہ انہوں نے یہ کتاب بالکل نہیں پڑھی۔

پلو اگر مان لیا جائے کہ پڑھ لی ہے تو دیکھنے میں کیا حرج  
ہے ہو سکتا ہے کہ ابھی بھی وہاں کچھ خزانہ موجود ہو۔ سوچو  
اگر نہیں وہاں سے تھوڑا سا سونا بھی مل جاتا ہے تو وہ آج  
کے دور میں کتنے کا ہوگا۔“

اس نے خاموش ہو کر گویا انہیں سوچنے کا موقع  
فراہم کیا، چند لمحے خاموش رہ کر اشرف نے کہا۔  
”بات تو تیری ٹھیک ہے لیکن عقل میں نہیں سا  
رہی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم کیسے خزانہ نکالنے میں  
کامیاب ہوں گے گھر والوں سے کیا کہیں گے۔ اس کے  
علاوہ یہ بھی علم نہیں ہے کہ وہاں خزانہ ہے بھی یا نہیں۔“  
سلیم نے فوراً کہا۔

”دیکھو یار! اس طرح حوصلہ چھوڑ کر بیٹھنے والے  
ہی ساری زندگی دوسروں کی جوتیاں سیدھی کیا کرتے  
ہیں میں اکیلا بھی یہ سب کام کر سکتا ہوں۔ اور اس طرح  
مارا خزانہ مجھے اکیلے کو مل سکتا تھا۔ مگر میں نے تمہاری  
یاری کو دولت پر ترجیح دی۔ اب معاملہ تمہارے سامنے  
ہے۔ میں تو ایک کوشش ضرور کروں گا، تم با اختیار ہو  
ساتھ دینا چاہو تو خوش آید یا اگر نہیں تو کم از کم دوستوں کو  
دھوکا دینے کا الزام مجھ پر نہیں آئے گا۔“

دونوں دوست سوچ میں پڑ گئے بات سلیم کی بھی  
درست تھی وہ اکیلا بھی خزانہ حاصل کر کے امیر ہو سکتا تھا  
مگر اس نے دوستوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی  
تھی۔ تو اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ ان سے غلط تھا۔  
دونوں نے لمحہ بھر کوشش آنے والے حالات کے بارے  
میں سوچا پھر ایک ساتھ بولے۔

”ہم تیرے ساتھ ہیں لالے۔ تو جو کہہ گا کریں  
گے بس اب یہ بتا کر کیا ہے۔“

سلیم خوش ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر  
ایک چھوٹی سی درخت کی خشک لکڑی اٹھائی اور آگے کو  
جھک کر زمین پر نقشہ بنا کر انہیں سمجھانے لگا۔

”دیکھو یہ جو ہمارے قریب جنگل میں تین  
چھوٹی پہاڑیاں ہیں ناں، یہی ہماری منزل ہیں۔ میں  
وہاں جا کر دیکھ آیا ہوں۔ پیدل آدھے گھنٹے کا سفر ہے

اور ہمیں یہ سفر پیدل ہی کرنا ہے کیونکہ رات کے وقت  
وہاں کسی بھی سواری کو لے جانا خود ہمارے لیے بھی  
خطرہ ہوگا۔ آدھا گھنٹہ ہمیں وہاں جانے میں لگے گا۔  
آدھا گھنٹہ کام کے لئے بہت ہے۔ اور باقی واپسی  
کا ٹائم تو کل ملا کر یہ ڈیڑھ گھنٹہ بنتا ہے۔ ہم زیادہ وقت  
رکھ لیتے ہیں۔ اپنے اپنے گھر سے رات دس کے بعد دو  
گھنٹوں کے لئے کیسے نکلتا ہے یہ سب کو خود سوچنا ہے۔“  
وہ سانس لینے کو رکھا پھر بولا۔

”اور یہ سب کام ہمیں آج کی رات ہی کرنا  
ہے۔ کل کس نے دیکھی ہے۔ اور ضروری سامان بھی  
میں بتا دیتا ہوں۔ کھانے کے لئے سکٹ اور پانی ایک،  
ایک ٹارچ، برسی، مضبوط تھیلے اور ایک ایک خنجر اور ڈنڈا۔  
خاہر ہے ہم جنگل میں جا رہے ہیں کسی سانپ یا  
بھینڑی سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ ہر بندہ اپنا  
سامان خود ساتھ لائے گا۔“

راشد تیزی سے بولا۔  
”اور خزانہ کیسے تقسیم کیا جائے گا؟“ سلیم نے  
دونوں کو باری باری دیکھا پھر بولا۔

”دیکھو مال کی محبت یاروں کی یاری بھلا دیتی  
ہے۔ مگر ہمیں ایسا نہیں کرنا، ہمیں ان تین دوستوں کی  
مثال نہیں بننا جنہیں سونے کی اینٹ ملی تھی اور لالچ نے  
انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ ہم تینوں ایک  
ایک تھیلا ہمیں گے اس کے بعد قریب اندازاً ہی ہوگی۔ ہر  
ساتھی ایک ایک پرچی اٹھائے گا جس کا جو نمبر نکلے گا وہی  
تھیلا اسے دے دیا جائے گا۔ بولو منظور ہے۔“

”دونوں فوراً بولے ہمیں منظور ہے۔“ راشد  
نے کہا۔

”بلکہ ہم دونوں اپنے حصے کے تھیلوں میں سے  
تمہیں کچھ سونا اور بھی دیں گے کیونکہ تم نے ہی یہ سارا  
پلان بنایا ہے۔“ سلیم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے مجھے بھی منظور ہے سب دوستوں  
نے خوشی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔  
☆☆☆☆☆



## میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پجاری بہنیں! ایک یونیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے

کی لئے تربیت اور پرنکس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک

اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پجاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی جگہ دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی

حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت

ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور

سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے راہ بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

## صابری دار لکھت

قدانی مارکیٹ اردو بازار لاہور

را تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب وہ پہلے آتا تھا تب دن کا وقت تھا مگر اب رات کی گہری تاریکی تھی۔ وہ تینوں ایک درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ درخت کے پتے یوں بجے جیسے ان میں کوئی چھپا بیٹھا ہو اور اس نے بے چینی سے حرکت کی ہو۔

ان تینوں کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ بھاگ کر وہ اس درخت کے نیچے سے نکل کر آگے چلے گئے۔ لیکن سلیم نے حوصلہ قائم رکھا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”ڈرومت کوئی بندر وغیرہ ہوگا اور ذرا تیز چلو تاکہ جلد سے جلد یہاں سے نکل چلیں۔“ تینوں تیز تیز قدموں سے چلتے گئے کچھ فاصلے پر انہیں پہاڑیوں کے

ہونے تاریکی میں یوں دکھائی دینے لگے جیسے کوئی بڑا دیو زمین پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہو۔ وہ تینوں

غیر ارادری طور پر ڈرے ہوئے تھے۔ اس جھے میں جنگل قدرے گھنا تھا۔ اس کے بعد صرف چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ باقی جنگل پہاڑیوں کے پائین جانب

کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دائیں طرف کچھ دور تک درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ آگے خالی میدان

نظر آتا تھا۔ جب وہ جھاڑیوں والے حصے میں داخل ہوئی

قوان کا خوف قدرے کم ہو گیا اور قدموں کی رفتار بھی کچھ مدھم ہو گئی چلتے چلتے سلیم ٹھک کر رکا۔ وہ سب سے

آگے تھا۔ اس کے رکتے ہی باقی دونوں بھی رک گئے۔ قریبی جھاڑیوں میں ہلچل ہو رہی تھی۔ سلیم نے

ہاتھ میں پکڑی نارنج کارن ان جھاڑیوں کی طرف کر دیا۔ مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہلچل بھی رک گئی۔

راشد نے سرگوشی میں کہا۔

”یہ کوئی بڑا سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ تیزی سے آگے نکل چلو اور واپسی پر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا۔“

بات معقول تھی۔ تینوں تیزی سے چل پڑے۔ باقی کارستہ عافیت سے کٹ گیا۔ پہلی پہاڑی کے گرد ذرا

ساچر کاٹ کر وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہلی پہاڑی دوسری پہاڑی سے ملتی تھی۔ سلیم وہاں رک گیا۔ پہلے اس

”معاف کرنا یا! بس ضروری تیاری کرتے کرتے کچھ دیر ہو گئی۔“

اشرف نے کہا۔ ”ہم تو فکر مند ہو گئے تھے کہ پتہ نہیں تیرے ساتھ کیا معاملہ پیش آ گیا ہے کہ تو ابھی تک پہنچا ہی نہیں۔“

دونوں چل پڑے۔ راشد کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا تھکلا کھول کر اس میں سے نارنج نکال کر ہاتھ

میں پکڑ لی۔

”خیر پنڈلیوں سے باندھ لو اور ڈنڈے ہاتھوں میں پکڑ لو۔ کیونکہ اگر خدا خواستہ کچھ پر اہم ہوئی تو تھیلے

میں سے نکالنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

سلیم نے اپنا خیر پنڈلی سے لگے چوڑے کے دستے میں اڑتے ہوئے کہا۔ دونوں نے اس کی تقلید

کی، پانچ منٹ کے بعد وہ تینوں بڑی خاموشی اور راز داری سے جنگل کے ابتدائی حصے میں داخل ہو چکے تھے۔

جنگل میں داخل ہوتے ہی سلیم نے اپنی نارنج جالی۔ تینوں خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے جنگل میں سرکے

پتے ان کے پاؤں کے نیچے آ کر چرچراتے تو ایک جب سی پر اسرار آواز پیدا ہوتی تھی۔ مگر وہ سب اس کو نظر

انداز کر کے آگے بڑھے جارہے تھے۔

چلتے چلتے اشرف نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ”آج تو شاید اماوس کی رات ہے چاند بھی نہیں

نکلا ہے۔“

راشد نے آہستہ سے کہا۔

”اماوس کی رات کی وجہ سے ہی اتنا اندھیرا ہے۔ ورنہ ابھی چھدر جنگل ہے۔ یہاں اتنی تاریکی

نہیں ہونی چاہیے تھی۔“ سلیم نے ان کا وصیان بٹانے کو کہا۔

”اچھا ہے کہ آج اماوس کی رات ہے۔ اس طرح ہم کسی کی نظروں میں آنے سے بچ جائیں گے۔“

کسی نے جواب نہیں دیا ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔ سلیم اگرچہ ایک مرتبہ پہلے یہاں سے ہو کر چاچا تھا مگر

پھر بھی وہ سنبھل سنبھل کر اور راستہ دیکھ دیکھ کر آگے بڑھ

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا اور تارے جگمگا رہے تھے۔ اشرف نے مقررہ جگہ پر

پہنچ کر اپنے سامان والا تھیلہ کندھے سے اتار کر نیچے رکھ دیا۔ اسے دوسرے دونوں ساتھیوں کا انتظار تھا۔ وہ

تینوں بچپن سے ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ ایک ہی جگہ میں تینوں کے گھر تھے۔ اشرف کا باپ جائے

کھوکھا چلا جاتا تھا۔ پانچ بھائیوں کے گھر کے اس نے بھی اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

راشد کا باپ اپنی کپڑے کی چھوٹی سی دکان چلاتا تھا۔ پانچوں کے بعد اس نے راشد کو بھی اپنے

ساتھ رکھ لیا۔ لیکن سلیم کے باپ کو شوق تھا کہ اس کا بیٹا بڑھ لکھ جائے۔ وہ ملکوں کی حویلی میں فشی تھا۔ اسی لئے

سلیم بارہویں میں پڑھ رہا تھا ساتھ ساتھ وہ شام کو ملکوں کی حویلی بھی چلا جاتا اور کوئی نہ کوئی کام کرتا

رہتا۔ اس طرح ملک اسے بھی کچھ نہ کچھ جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

اشرف کو وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب اسے ایک ساہ سا اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔

قریب آئے پر پتہ چلا کہ وہ راشد تھا۔ دونوں اب سلیم کا انتظار کر رہے تھے انہیں کافی دیر گزر گئی مگر سلیم نہ آیا۔

دونوں کو تشویش لاحق ہو گئی۔ اگر اس کے گھر والوں نے اسے نہیں آنے دیا تو وہ دونوں اکیلے وہاں نہیں جاسکتے

تھے۔ اشرف بولا۔

”راشد یا! تو یہاں سامان کے ساتھ بیٹھ میں اس کے گھر سے پتہ کر کے آتا ہوں کہ وہ ابھی تک پہنچا

کیوں نہیں ہے۔“

”جلدی آنا یا! اگر یہاں ہی دیر ہو گئی تو واپسی میں بھی دیر ہو گئی تمہیں پتہ تو ہے میرا باپ ذرا سخت

طبیعت کا آدمی ہے۔ ابویں دھنک کر رکھ دے گا۔“

اشرف سر ہلا کر وہاں سے چل دیا۔ ابھی وہ اپنی گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے سلیم اپنے گھر سے نکل

دکھائی دیا وہ وہیں رک کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ قریب آ کر سلیم نے کہا۔

نے چاروں طرف روشنی پھینک کر ارد کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر ان سے بولا۔

”یہ چٹان اپنی جگہ سے سرکانی ہے۔ اس کے نیچے راستہ ہے۔ وہاں سے ہم اس غار نما کمرے میں پہنچ جائیں گے جس میں خزانہ ہے۔“

جلدی جلدی تینوں نے ڈنڈے تھیلے ایک طرف رکھے۔ سلیم نے نارٹ کو ایک چھوٹے پتھر پر ایسے زاویے سے رکھ دیا جس سے روشنی اس چٹان پر پڑتی رہے۔ تینوں مل کر زور لگائے لگے مگر چٹان ان کے انداز سے زیادہ وزنی تھی۔ لیکن اب وہ اتنی سی بات کے لئے اپنے منہ سے مستقبل سے منہ نہیں موڑ سکتے تھے۔ ارشد نے کہا۔

”میری داوی کہتی ہے کوئی بھی مشکل کام اگر درود شریف پڑھ کر کیا جائے تو آسان ہو جاتا ہے۔ آج آزما لیتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر تینوں بلند آواز سے درود شریف پڑھنے لگے۔ اور ساتھ ساتھ چٹان کو دھکیل بھی رہے تھے۔ چٹان اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ آدھی چٹان اپنی جگہ سے سرکا کر درود رک گئے۔ ٹکٹ کھا کر پانی پیا۔ اور پھر سے تازہ دم ہو کر زور لگائے لگے۔ چٹان کے اپنی جگہ سے ہٹنے ہی نیچے ایک بڑے سے بل کی طرح کا راستہ دکھائی دینے لگا۔ لیکن اتنے تک راستے میں اترنے کا ان کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ تینوں خاموش کھڑے تھے۔ بلا آخر ارشد نے ہمت کر کے کہا۔

پہلے میں اندر داخل ہوتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم دونوں بھاگ جانا۔“

اس کی یہ بات سن کر سلیم اور راشد جوش میں آگئے۔ سلیم بولا۔

”تمہیں میں ہی پہلے اتروں گا کیونکہ تمہیں اس راستے پر میں ہی لایا تھا۔“ کچھ دیر تینوں میں تکرار ہوتی رہی پھر طے پا گیا کہ پہلے راشد پھر اسلم اور آخر میں ارشد اترے گا۔ سلیم نے روشنی پھینکی اور راشد بل میں اترنے لگا۔ پھر سلیم خود اتر اس کے بعد ارشد بھی بل

میں اتر گیا۔ دندموں کے بعد دائیں طرف جاتی ایک تنگ سی سرنگ ان کے سامنے تھی۔ وہ اپنی تنگ تھی کہ انہیں رکوع کے بل اس میں چلنا پڑتا۔ سلیم نے غارن اپنے ہاتھ میں رکھی اور راشد سے کہا۔

”ڈنڈا تیار رکھو کوئی سانپ بھی ہو سکتا ہے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ خزانوں پر سانپ بہرہ دینے لگتے ہیں۔“ راشد نے ڈنڈا تیار کر لیا تینوں جھکے جھکے ایک قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سرنگ ایک تنگ سے کمرہ نما غار میں بدل گئی۔ تینوں احتیاط سے چلتے غار میں آگئے۔ سلیم نے تیزی سے تارخ والے ہاتھ کو حرکت دے کر گرد و پیش کا جائزہ لیا سیاہ پتھریلی دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے جالے لٹک رہے تھے ان میں گلی جیسے مڑیاں اپنی زرد آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک طرف کی دیوار کے ساتھ دو بڑے پتھر کے صندوق پڑے تھے۔ غار میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

”یہی ہے خزانہ چلو جلدی سے شروع ہو جاؤ۔“ سلیم نے چپک کر کہا۔ ارشد نے آگے بڑھ کر صندوق کا دھکن ایک طرف کھسکا دیا۔ صندوق میں قدیم زمانے کے سونے کے زیورات اور کئی قسموں کے جواہرات پڑے تھے۔ جن میں سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ ابھی وہ دیکھنے میں مگن ہی تھے کہ ایک زوردار گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ وہ سب خزانے کو بھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگے سب نے اپنی اپنی جگہیں روشن کر لی تھیں۔ جن کی روشنی سے وہ چھوٹا سا غار مکمل طور پر روشن ہو گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا۔

سامنے والی دیوار پر لگے بڑے سے جالے میں لٹکی ایک مینڈک کے برابر مڑی نے فرش پر چھلانگ دی۔ وہ تینوں خوفزدہ ہو گئے۔ مڑی فرش پر گرتی ہی بڑی ہونے لگی وہ دم بخود کھڑے اسے دیکھ رہے تھے خزانے کا صندوق اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ ان میں سے کسی کی توجہ ادھر نہیں تھی۔ وہ سب لمحہ بہ لمحہ بڑی ہونے

والی مڑی کو دیکھ رہے تھے۔ خوف سے ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ مڑی نے بو جھٹے بو جھٹے ایک خوفناک چڑیل کا روپ دھار لیا۔ اس کے لمبے سیاہ بال زمین کو چھو رہے تھے۔ بالکل تنگی تھی اس کی سرخ لہلہائی زبان بالشت بھر باہر نکلی ہوئی تھی۔

ان سب کے منہ سے چیخ نکل گئی، چڑیل نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اس کے لمبے نوکیلے دانت بہت خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ اس سب سے بڑھ کر کمرہ اور وہشت انگیز تھیں اس کی آنکھیں جو بالکل سفید وٹیلے پر مشتمل تھیں اس میں پتلی سرے سے تھی ہی نہیں مگر چڑیل کو سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگا پھر بولی۔

”تو سلیم میاں تم میرے چنگل میں پھنس ہی گئے میں ہر دس 10 سال بعد تین جوان لڑکوں کا خون جیتی ہوں۔ طریقہ ایک ہی ہے۔ وہی کتاب جو تمہارے ہاتھ کی کسی نہ کسی کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ وہ انسان اپنے ساتھ کسی نہ کسی کو لے کر دڑا چلا آتا ہے۔ انسان ویسے ہی لالچی مخلوق ہے۔ اس طرح میں اپنی خواہش پوری کر لیتی ہوں۔ اس مرتبہ تم میرا شکار ہو گئے مجھے خوشی ہے کہ تمہیں لڑکے مجھے ایک ساتھ مل گئے۔“

ان تینوں کی حالت خوف سے ایسی ہو گئی جیسے ان کے بدن سے سارا بیو بچوڑا لیا گیا ہو۔ ان کے بدن قرقر کا نپ رہے تھے۔ چڑیل نے ایک اور قہقہہ لگا دیا اور انہیں پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا۔ راشد سرنگ کے دہانے کے پاس کھڑا تھا۔ چڑیل کا ہاتھ بڑھتا دیکھ کر تیزی سے سرنگ میں داخل ہوا اور بھاگتا چلا گیا۔ چڑیل نے ایک اور بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اپنی زبان لٹکے ہوئے ہونٹوں پر بھیر کر بولی۔

”مت بھاگو ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ چٹان کھسک کر دو بارہ اپنی جگہ پر آگئی ہے تم نے آواز تو سن لی ہو گی۔“ اب تم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔ اب تمہیں میری بھوک پیاس سنانی ہے۔

”واہ۔۔۔ کیا مزیدار ہوگا جوان ابلتا ہوا

خون۔۔۔ اور تازہ گوشت۔“

وہ چٹارے لے رہی تھی اور ان کی روح فنا ہو رہی تھی وہشت سے بھٹی ہوئی آنکھوں سے وہ سیاہ کالی چڑیل کی طرف دیکھ رہے تھے جو کسی بھی لمحے میں ان کے لئے موت بننے والی تھی۔ سلیم نے ہٹکاتے ہوئے کہا۔

”اش۔۔۔ اشرف! معوذتین اور آیت۔۔۔ انکری۔۔۔ پ۔۔۔ پ۔۔۔ پڑھو۔۔۔ ورنہ۔۔۔ چڑیل۔۔۔ ہمیں مار ڈالے گی۔“

اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ دونوں جلدی جلدی پڑھنے لگے۔ چڑیل نے اپنے ایک ایک ہاتھ سے ان دونوں کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے ہی اس کا ہاتھ ان کے بدن سے ٹکرایا وہ چیخنے لگی۔

”بند کر د پڑھنا۔۔۔ ورنہ میں تمہیں بہت بری موت ماروں گی خاموش ہو جاؤ۔“ وہ چلائی رہی اسے تکلیف میں دیکھ کر ان دونوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ بلند آواز سے تلاوت کرنے لگے۔ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ غیر ارادی طور پر وہ دونوں بھی خاموش ہو گئے۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ چڑیل نے اپنے ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر جھٹکے وہ دونوں یوں زمین سے اچھلے جیسے زمین میں پھرنگ لگے ہوں اور اڑتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ چند لمحوں بعد وہ دھب سے زمین پر گرے۔ ارشد چلا یا۔

”آیت انکری پڑھو جلدی۔“ دونوں پڑھتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا وہ جنگل کے باہر وہاں کھڑے تھے جہاں سے جنگل شروع ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد راشد بھی اسی طرح اڑتا ہوا ان کے قریب دھب سے گرے۔ چڑیل نے کامل الٹی سے خوفزدہ ہو کر ان تینوں کو اپنے غار سے نکال باہر پھینک دیا تھا۔ اتنی خوفناک شکل دہلی چڑیل کو دیکھ کر ان کے دل سے بھی خزانہ حاصل کرنے کا لالچ نکل گیا تھا۔ جان بچا کر بے تینوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور خاموشی سے گھر کو لوٹ آئے۔



# برندرامورتی

علی کاشف آفاقی - میرپور آزاد کشمیر

دھکنی آگ کے بھرکنے شعلے سے اچانک ایک لڑکی کا وجود برآمد ہوا اور ہوا میں نہرتی ہوئی وہ اوپر کو اٹھی اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار تھا اس نے اس ہتھیار کو گھمایا اور ہوا میں معلق بد شکل بت کا بازو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

کالی دنیا کی ناقابل یقین خونی، ذراؤنی، دل کو بہت کرتی لرزیدہ مزیدہ حیرت انگیز کہانی



اسے آس پاس کی کوئی خبر نہ تھی۔

اور پھر اچانک اس پر اسرار ماحول میں ایک کرخت آواز ابھری۔ ”اے بھاری! ہم نے تیری پوجا کو قبول کیا۔ جلدی کر۔ آخری بھیٹ دے تاکہ ہم تجھے تیری طاقتوں کے بارے میں بتائیں۔“ یہ آواز اس بت کے منہ سے آئی تھی جو کہ اوپر معلق تھا۔ اس آواز کا آنا تھا کہ بھاری جو آنکھیں بند کئے ہاتھ جوڑے آگ کے سامنے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اٹھ کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور آگ کے سامنے لایا اور اچانک اسے آگ کے بڑھکتے شعلوں میں دھکیل دیا۔ مگر یہ کیا؟ اس بھاری نے جس تیزی سے لڑکی کو بڑھکتی آگ میں دھکیلا تھا۔ اس سے زیادہ تیزی سے وہ لڑکی شعلوں کے درمیان سے باہر نکلی اور ہوا میں معلق ہو گئی۔

بھاری جو اپنی پوجا کی کامیابی پر خوش تھا۔ حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ وہ لڑکی بھیر یروں والی کسی بڑی کی طرح بت کے اکلوتے ہاتھ کی طرف بڑھی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں بنائے کہاں سے ایک ہتھوڑا تھا ہتھیار آگیا تھا اس سے پہلے کہ بھاری کچھ سمجھتا۔ اس حسن کی دیوی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہتھوڑا نما ہتھیار زور سے

بڑا بھیاک منظر تھا۔ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ جل رہا تھا۔ آگ کے شعلے کافی اوپر تک جا کر ایک کافی چوڑا تخت نما شید سے گرا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آگ کا فوارہ جل رہا ہو۔ کمرے کے وسط میں تخت نما شید سے آگ کے شعلے گرا رہے تھے وہ ہوا میں معلق تھا اور اس پر ایک عجیب عجیب اور بھیاک شکل کا بت موجود تھا۔ بت کے سینے سے ایک بازو نکلا ہوا تھا اور اس بازو کے ساتھ دس انگلیوں والا بے ڈھنگا سا ہاتھ تھا۔ جس میں ترشول موجود تھا۔ بت کا صرف ایک ہی ہاتھ تھا۔ سائید میں اور ہاتھ نہیں تھے۔ بت کا چہرہ نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جیسے کہ وہ نیچے دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں کے عین نیچے فرش پر ایک بھیاک شکل کا آدی اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھوں کو بند کئے بیٹھا تھا۔ اس بھیاک شکل آدی کے عین سامنے آگ کے الاؤ کی دوسری طرف ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی بے سدھ پڑی تھی۔ لڑکی کیا؟ بلکہ وہ حسن کی دیوی تھی۔ اس کی رنگت اتنی صاف شفاف اور چہرے کے نقوش اتنے حسین تھے کہ آگ کے شعلے اس کے چہرے سے منعکس ہوتے نظر آرہے تھے۔ وہ لڑکی ٹرائس کی سی کیفیت میں تھی۔ آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں اس کی مگر



بت کے اکلوتے ہاتھ پر دے مارا۔ اس ہتھیار کے ضرب کا پڑنا تھا کہ ایک بھانک آواز کے ساتھ اس بت کا ہاتھ بازو سے جدا ہو کر غے گر پڑا۔ آواز اتنی شدید تھی کہ پجاری نے سہم کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اس طویل کمرے میں کچھ لمبے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر پجاری نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اور پھر جیسے حیرت سے اچھل پڑا۔

آگ کے شعلے ماند پڑ رہے تھے۔ بت کا دس انگلیوں والا بے ڈھنگا ہاتھ ترشول سمیت زمین پر پڑا تھا۔ اور اب اس لڑکی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ پجاری کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں گہری ہوئے لگیں۔

☆.....☆.....☆

بھارت کے شہر دہلی میں وہ بہت خوبصورت جگہ تھا۔ بنگلہ کانی رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مین گیٹ سے باہر سڑک کے دونوں اطراف درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ مین گیٹ کے اندر پینڈروش کے گرو خوبصورت پھولوں کے پودے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کئی سایہ دار درخت اپنی بہاریں دکھلا رہے تھے۔ مین گیٹ کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ ابھی فجر کی اذانوں کا وقت نہیں ہوا تھا۔ مین گیٹ پر باوردی گارڈز کھڑے تھے۔ اس بنگلے کے تہ خانے کے ایک وسیع درعیض کمرے میں مختلف قسم کی مشینیں پڑی تھیں۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ دس فٹ لمبی اور پانچ فٹ چوڑی اسکرین لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں تین افراد بیٹھے تھے۔ تینوں افراد بہترین تھری پیس سوٹوں میں ملبوس تھے۔ ان کی عرس پچاس کے ہندسے کو عبور کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک فرد ایک بڑے کی بورڈ کو آپریٹ کر رہا تھا۔ اسکرین روشنی اور شہید پر بنے اکلوتے ہاتھ والے بت شہید کے نیچے چلنے والی آگ۔ پجاری اور نو عمر حسین لڑکی سب نظر آ رہے تھے۔ پھر اس بت کی آواز سنائی دی۔

”پجاری! ہم نے تیری پوجا کو قبول کیا۔ جلدی کر اور آخری بھیبت دے تاکہ ہم تجھے تیری طاقتوں

کے بارے میں بتائیں۔“ بت کی کرخت آواز پورے کمرے میں گونجی۔

کمرے میں موجود تینوں شخص مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک جوکانی بی رہا تھا بولا۔

”ڈاکٹر جاوید! پلیز! تم اب چوکتا ہو جاؤ۔“

ڈاکٹر جاوید وہ تھا جو کی بورڈ کو آپریٹ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو ڈاکٹر میزائیں بالکل چوکتا ہوں۔“

تیسرا آدمی البتہ خاموش بیٹھا اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں وہ پجاری اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پھر پجاری اس لڑکی کے قریب پہنچا اور لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے ہی والا تھا کہ خاموش رہنے والا آدمی تیزی سے بولا۔

”ڈاکٹر جاوید! پلیز! ایکشن۔“

ڈاکٹر جاوید نے سر ہلایا اور کہا۔ ”اوکے۔“ ڈاکٹر اقلیم یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے مشین کے چند بٹن دبائے۔ مین دبائے سے لڑکی جسے پجاری نے آگ میں دھکیل دیا تھا۔ فوراً حرکت میں آئی۔ اچھل کر آگ کے الاء سے باہر نکل اور اس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا نما ہتھیار آگیا اور پھر لڑکی نے فضا میں تیرتے ہوئے اوپر جا کر ہتھوڑا مار کر بت کا ہاتھ توڑ دیا۔ اس کے بعد وہ ہوا میں تیرتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آئی اور آٹا کاٹا ہوا میں تیرتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

”ویل ڈن!“ ڈاکٹر اقلیم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اب کمرے میں موجود تینوں ڈاکٹر ز کے چہروں پر تحس کی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کسی خاص واقعہ کے انتظار میں ہوں۔ سب کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں پجاری آنکھیں بند کئے سہا ہوا کھڑا کپکاٹا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی لہریں چھائی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور ڈرتے ڈرتے بت کی طرف دیکھا۔ جس کا بازو ٹنڈ منڈ

ہو چکا تھا۔

اچانک کرا کر جتنی غضب ناک آواز سے لرز اٹھا۔ ”بس اس؟ بت کے منہ سے قہر و غضب سے بھری آواز آئی۔ تو پجاری رکوع کے بل جھک گیا۔ یقیناً بس اس اس پجاری کا نام تھا۔ ”برندرا مورتی“ حاصل کرنے کیلئے تو نے برسوں تپیا کی۔ مجھے خوش بھی کیا اور نو عمر ناریوں کی بھیبت دیتا رہا۔ آج تیری تپیا کا انت تھا۔ تو سیکھل ہونے کو تھا تیری غلطی سے میرا بازو کٹ گیا۔ اب تیری پراگشت اسی صورت میں ہوگی جب تو مجھے نقصان پہنچانے والے کو نرک میں پہنچا دے گا۔ اور اب خود کو پہنچانے کے لئے یہی کرتا ہے۔ جلدی سے کر لے یہ کام۔ ورنہ تیرا انت اتنا درد ناک ہوگا کہ تیری آتما سنسار میں بھٹکتی رہ جائے گی اور اسے شانتی نہیں ملے گی۔“ بت کی آواز پورے کمرے میں پھیلی چلی گئی۔

اور پھر تینوں ڈاکٹر ز نے اسکرین پر دیکھا کہ آگ بالکل بجھ چکی تھی اور پجاری کوڑا اٹھایاں بھینچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں قہر و غصہ سے بھر گئی تھیں۔

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ڈاکٹر اقلیم بولا۔ ”اس نے برسہا برس تک جاپ یعنی چلکاٹا تھا اور آج کامیاب ہونے والا تھا کہ رب العزت کے کرم سے اس کے کالے ارادے مٹی میں مل گئے ہیں۔ مبارک ہو۔“

”تم کو بھی۔“ ڈاکٹر میز اور ڈاکٹر جاوید نے یکے باز ہو کر کہا۔

پھر ڈاکٹر میز نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تک تو کامیابی ہو گئی ہے۔ اب شیطان کے بت نے بس اس کو جو ٹارگٹ دیا ہے۔ وہ اسے بہت جلد پورا کرے گا۔“

ڈاکٹر جاوید نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور اپنی رپوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے بولا۔ ”فکر نہ کرو جاوید! ہمارے بنگلے کی روحانی سیکورٹی بہت ٹھنک ہے۔ بس اس یہاں آنے کی کوشش کرے گا۔ تو اس کے دانت

کھٹے ہو جائیں گے۔“

ڈاکٹر اقلیم سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”سیکورٹی تو اچھی ہے مگر اس شیطان کے چچے بس اس کو نرک میں پہنچانے کا طریقہ بھی تو سوچتا ہے۔“ اور پھر تینوں سوچ میں ڈوب گئے۔

☆.....☆.....☆

تینوں کھاتے پیتے بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر میز اور ڈاکٹر جاوید بچپن کے ساتھی تھے۔ انہوں نے اکٹھے اسکول اور کالج لائف گزاری۔ ان دونوں کو کمپیوٹر سے شدید دلچسپی تھی۔ سو انہوں نے BSC کے بعد امریکہ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ گھر سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ سو گھر سے اجازت ملنے ہی وہ امریکہ جا پہنچے وہاں کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں انہوں نے MSC کے لئے داخلہ لیا۔ یونیورسٹی میں مسلمان ممالک اور دوسرے ممالک سے بھی لڑکے پڑھنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن ان کی اعزاز اسٹینڈنگ اقلیم سے ہوئی۔ اس کا تعلق بھارت سے تھا۔ وہ بھی MSC کرنے آیا تھا۔ لیکن اس کے خیالات بڑے انوکھے تھے۔ ایک دن وہ تینوں ایک کینے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اقلیم بولا۔ ”یار! یہ جدید دور ہے ہر کوئی مادیت پسند ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ جادو وغیرہ سچ ہے۔“

میز برگر کھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! جادو برحق ہے۔ لیکن اس دور میں دہش نہیں سمجھتا کہ کوئی جادوگر ہو۔“

”نہیں! جادوگر ہوں گے۔ لیکن وہ اتنے زیادہ سامنے نہیں آتے۔ ویسے بھی ان دنوں جعلی سفلی علوم والے اتنے ہو گئے ہیں کہ کھرنے کھونے کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔“

”ویسے اقلیم تم نے یہ بات کیسے چھیڑ دی؟“

جاوید نے پہلے میز کی تردید کی اور پھر اقلیم سے سوال کیا۔ اقلیم ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ہمارا جو بنگلہ ہے۔ اس کے قریب ہی ایک ہندو رہتا تھا۔ وہ بوڑھا شخص تھا۔ اکثر وہ جادو ٹونے وغیرہ کے بارے میں

بتا رہا تھا کہ ”جو آدمی دنیا میں اذیت سے مرنا ہے اس کی آتما بھگتی رہتی ہے۔ اور جادو دیکھنے سے آدمی کو اتنی شکتی ملتی ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک مورتی کا ذکر بھی کرتا تھا کہ وہ مورتی حاصل کرنے والے کو، کھود دیا جہاں کے خزانے مل گئے۔ مگر وہ مورتی حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔“ اقلیم نے وضاحت کی تو جاوید نے پوچھا۔ ”یہ کیسی مورتی ہے، اور اسے حاصل کرنا کیوں مشکل ہے؟“

اقلیم نے جواب دیا۔ ”وہ بوڑھا کہتا تھا کہ وہ مورتی بہت طاقتور ہے اور جس جگہ وہ رکھی ہے وہاں قدم قدم پر کنڈل (حصار) ہیں۔ ان کنڈلوں کو توڑنے کے لئے لمبے عرصے تک تپا اور پوچا کرنی پڑتی ہے اور اگر تپا میں کوئی غلطی ہو جائے تو پوچا کرنے والا ٹوٹ ہو جاتا ہے۔“ اس بوڑھے کا دعویٰ تھا کہ وہ اس عمل کو جانتا ہے جس کے ذریعے مورتی تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ”اگر وہ اس عمل کو جانتا ہے تو وہاں پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کی اس نے؟“ رمیز نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا مگر اقلیم نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بوڑھے کا کہنا تھا کہ وہ عمل کرنے والے کو بے پناہ طاقتیں مل جاتی ہیں۔ جن کو کام میں لا کر وہ مورتی حاصل کر سکتا ہے۔“ چونکہ میرا گھر اس کے گھر کے قریب تھا۔ اس لئے میں اکثر اس کے پاس جا بیٹھتا اور اس کی باتیں سنتا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اور اس بارے میں اس کی منطق نہ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ شادی کا مطلب ہے کہ اپنی فطری پیاس بجھائی جائے۔ لہذا بہتر ہے کہ پہلے بے پناہ طاقت حاصل کر لو اور پھر فطری پیاس بجھا لو۔ لیکن شادی کر کے نہیں۔ شادی سے آدمی بندھ جاتا ہے۔“

”بڑی نرالی منطق تھی اس کی۔“ رمیز نے مسکراتے ہوئے کہا تو اقلیم بھی ہلے سے مسکرایا۔ جاوید نے پوچھا ”لیکن یا اقلیم! امریکہ کے اس مادہ برست ماحول میں تمہیں اس جادوگر بوڑھے کی یاد کیسے آگئی؟“

”چلو ابھی اسائنمنٹ بھی تیار کرنا ہے۔ چھوڑو

ان باتوں کو۔“ پھر وہ تینوں کیفے سے اٹھ کر ہوٹل میں چلے آئے۔ لیکن تینوں اس مورتی کے بارے میں سوچ رہے تھے اپنی اپنی جگہ۔

پھر وہ تینوں اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ہر دیک اینڈ پر وہ ضرور ملتے اور اکثر دیشتر مورتی اور اس بوڑھے کے بارے میں بھی باتیں کرتے۔ لیکن اب وہ اس ٹاپک کو نبھانے سے باز رہے۔

ایک دیک اینڈ پر اقلیم نے کہا۔ ”دوستو! ہم تینوں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں مگر کیسے نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسے ساٹھی چاہئیں جو میرے خیالات سے متفق ہوں۔ میرے خیال میں تمہارے میرے خیالات کافی حد تک ایک جیسے ہیں۔ کیا تم اس کام میں میری مدد کر سکتے ہو؟“ رمیز نے انھیں آہستہ آہستہ میں پوچھا۔

”لیکن کام کیا ہے؟ کچھ تو بتا چلے۔“ اقلیم نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں اس بوڑھے اور مورتی کے بارے میں بتایا تھا اور پتا ہے وہ بوڑھا اب کہاں ہے؟“ اس نے سسٹی فیز لیمے میں ان سے پوچھا تو دونوں کے سر نیچے میں مل گئے۔

تب وہ کہنے لگا۔ ”میں اکثر اس بوڑھے کی باتیں سنتا تھا۔ مجھے اس کی کچھ باتوں کی سمجھ آتی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس مورتی تک پہنچنا چاہتا تھا۔“

”مورتی تک پہنچنا چاہتا تھا؟ لیکن تمہیں اس بارے میں کیسے پتا چلا؟“ جاوید نے قطع کلائی کرتے ہوئے پوچھا۔

تو اقلیم کہنے لگا۔ ”اس کی باتوں سے، میں اس وقت فٹسٹ ایئر میں تھا۔ اور مختلف ہارٹاؤنڈ پڑھتا تھا۔ سو مجھے اس کے خیالات کا تھوڑا تھوڑا پتہ چل گیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں یہ سب کچھ بیکواس تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر مجھے یقین کرنا پڑا۔ میں FSC کر چکا تھا کہ ایک دن اس بوڑھے کے گھر گیا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔ جبکہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ باہر نہیں گیا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد واپس

آجائے گا۔ اس لئے میں وہیں بیٹھ گیا اس کے کمرے میں وہاں مختلف کتب پڑی تھیں۔ پرانی بوسیدہ سی۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ایک کتاب اٹھائی۔ وہ کافی ضخیم بوسیدہ سی کتاب تھی۔ اس کے ٹائٹل پر سنسکرت میں کوئی عنوان لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پہلے تقریباً 50 صفحات پر ہندی میں لکھا ہوا تھا۔

”جس سے مجبور ہو کر میں اسے پڑھنے لگا۔ وہ کتاب پرانے زمانے کے بڑے بڑے جادوگروں یا خفی طاقتور چیزوں کے بارے میں تھی۔ بڑی مزیدار کتاب تھی وہ لیکن وہ ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ میں نے صرف دس صفحے پڑھے۔ اسی دوران میرے گھر سے ایک ملازم آ گیا کہ میرے بابا بلا رہے ہیں مجھے، وہ بوڑھا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مجھے وہ کتاب اتنی دلچسپ لگی کہ اسے گھر اٹھا لایا، سوچا کہ بعد میں، میں اسے بتا دوں گا اور معذرت کر لوں گا۔ میں گھر آیا۔ بابا نے کسی تقریب میں جانا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ سو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے دن اس کے گھر جا کر پتہ کیا تو وہ نہیں تھا۔ اڑدس پر دس سے پتہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ کل وہ گھر سے نکلا تھا۔ پتہ نہیں کہاں گیا؟ اس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ شاید کسی جادوؤں کے سلسلے میں غائب ہوا ہے۔ پھر میں اس کے گھر سے لائی ہوئی کتاب پڑھنے لگا۔ بہت پر اسرار باتیں لکھی تھیں۔ اس میں، اور پھر میرے لئے یہ مسئلہ بن گیا کہ وہ کتاب آگے سنسکرت میں تھی اور میں سنسکرت نہیں پڑھ سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی میں نے پڑھا تھا۔ اس نے میرے خیالات میں بالکل بچا دی۔ ان دنوں میں BSC میں تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر جادو سے ایسی عجیب و غریب باتیں ظہور ہوتی ہیں تو سائنس کون سا کم ہے؟ سائنس بھی تو ایک جادو ہے دور جدید کا۔ سو میں نے مختلف تجربات شروع کر دیئے۔

میں کمپیوٹر کے ذریعے جادو کے کمالات کرنے کا خواہش مند تھا۔ کمپیوٹر تو تھا ہی میرا پسندیدہ سہولیت۔ پھر میں نے سوچا کہ کمپیوٹر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ تبھی میں اپنی کوششوں اور خواہشات کی تکمیل کر سکوں گا۔ سو میں BSC کر کے یہاں آ گیا۔ اب تو تم کو پتا چل گیا ہوگا کہ میں کس کام کے لئے مدد چاہتا ہوں؟“ اقلیم نے مسلسل بولتے ہوئے ان سے سوال کیا جو اس کی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

چند لمحوں کے لئے وہاں خاموشی چھا گئی۔ پھر رمیز بولا۔ ”کیا اس بوڑھے کا مزید کوئی پتہ چلا؟“ اقلیم نے نفی میں ہلایا تو جاوید بولا ”ہمارا خیال تھا کہ یہاں سے واپس جا کر ہم سافٹ ویئر کا بزنس شروع کریں گے، تم کہتے ہو کہ تمہارے تجربات میں مدد کریں تو۔۔۔“ جاوید بول رہا تھا کہ رمیز بولا۔ ”ہم سوچتے ہیں پھر تمہیں بتائیں گے۔“ اقلیم کہنے لگا۔ ”کیوں نہ ہم تینوں اکٹھے بزنس کریں۔“

وہ دونوں اس کی تجویز پر غور کرنے لگے۔ تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا اور ان تینوں کے درمیان طے ہو گیا کہ وہ اکٹھے سافٹ ویئر کا بزنس شروع کریں گے اور اقلیم کے تجربات میں بھی مدد کریں گے۔ اقلیم کا کہنا تھا کہ اگر ہم اپنے تجربات میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً سفلی علوم سے بچانے کے لئے لوگوں کی مدد کر سکیں گے۔ بہر حال ان کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔

MSC کرنے کے بعد وہ اپنے ملک کو لوٹ کر آئے اور معاہدے کے مطابق مشترکہ کاروبار شروع کر دیا۔

تقریباً تین برس گزر گئے۔ ان کا بزنس کافی ممالک میں پھیل گیا تھا۔ ان کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے تجربات میں بھی لگے ہوئے تھے۔ اقلیم نے سنسکرت سیکھ کر بوڑھے ہندو کی ساری کتاب پڑھ لی تھی۔

کتاب میں بڑی حیرت انگیز باتیں اور عمل لکھے



تھے۔ اقلیم بوڑھے کی باتیں کروہ مورنی کے بارے میں بھی جان چکا تھا۔ اس مورنی کا نام ”برندرا مورنی“ تھا۔ اور وہ مورنی ایک شیطان کے قبضے میں تھی اور وہ مورنی تو پجاری کے لئے بہت اہم تھی لیکن شرط یہ تھی کہ وہ مورنی تب حاصل کر سکتا ہے جو تمام شراناک کو پورا کرے۔ یعنی شیطان کی خوشیوں کو پورا کرے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے ایک عمل بھی تھا کہ اگر کوئی اس کو حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو اس کتاب جو ایک منتر موجود تھا۔ اسے تنہائی میں بیٹھ کر پڑھے اور دنیا سے ناٹ توڑے اور وہ منتر پڑھتے ہوئے دل میں شیطان کا تصور ہونا چاہئے۔ وہ منتر اس وقت تک پڑھتا رہے۔ جب تک کہ شیطان خود منتر پڑھنے والے کے پاس نہ آئے اور اسے مزید ہدایات نہ دے۔ اس میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے کی عمر گزر جائے اور اسے مراد نہ ملے، یا مراد ملنے کے قریب ہو کہ غلطی ہو جائے تو پھر سب کا سب اکارت ہو جائے گا۔

کتاب میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ مگر ان کا اصل موضوع تو ”برندرا مورنی“ ہی تھا۔ بہر حال وہ تجربات کرتے رہے۔ لیکن منزل تک نہ پہنچ سکے۔ انہی دنوں ریمز اور جاوید کے گھر بیٹھے پیدا ہوئے مگر اقلیم کا آنگن ابھی خالی تھا۔ وہ بھی راضی برضائے اٹھی تھا۔ پھر ان تینوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کا سوچا اور برنزی چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایم فل کیا اور پھر PHD کے لئے مونزیال چلے گئے۔

مونزیال میں ایک دن وہ میر کرنے کے لئے نکلے ایک نبتا ویران جگہ پر آئے تو اقلیم نے جو ذرائع کر رہا تھا اچانک گاڑی روک دی۔ اور اسٹیزنگ جھوڑ کر اپنا پیٹ بڑھایا۔ اس کے چہرے پر کرب کے اثرات تھے۔ ریمز جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گھبرا کر پوچھنے لگا۔ ”کک کیا ہوا ہے اقلیم؟“ جاوید بھی گھبرا گیا تھا اقلیم کے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آنے لگے تھے اور وہ بدستور اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ جاوید نے پوچھا تو وہ

کراہ کر بولا۔ ”وہ م..... میرے، پپ، پیٹ، م..... میں درہ ورد.....؟“ اس کے منہ سے یہ بھلائی آواز نکلی تو ریمز اور جاوید گھبرا آ گئے۔ ”اس ویروانی میں کیا ہو سکتا ہے؟“ ابھی وہ اس مسئلہ کے حل کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک آواز آئی۔ ”بیٹا! مصیبت آگئی نا.....؟“

دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو مہبوت رہ گئے۔ ایک نورانی چہرہ والے بزرگ سفید لباس پہنے کھڑے تھے۔ سفید داڑھی سینے تک آ رہی تھی۔ نہایت شیریں زبان میں کہہ رہے تھے۔ ”مصیبتیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ انسان کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ ہر مصیبت کے پیچھے کوئی مصلحت ہوتی ہے۔“ ریمز اور جاوید کچھ نہ بول سکے جبکہ اقلیم ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ وہ بزرگ ڈرائیو تک سیٹ کی طرف آئے اور اقلیم کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اقلیم نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے چہرے سے کرب کے اثرات زائل ہونے لگے۔

بزرگ فرمانے لگے۔ ”تم نے بہت نیک کام کی ابتدا ہے۔ جاؤ ہم تمہیں کامیابی کی نوید دیتے ہیں۔ جاؤ اور جا کر ظہر کی نماز ادا کرو، تمہیں رہنمائی ملے گی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ تمہارے آنگن میں ایسا پھول کھلے گا جو سب سے زیادہ خوشبو والا ہوگا۔ اللہ تمہیں اور تمہارے دوستوں کو کامیاب کرے۔“

بزرگ کی باتیں سن کر ان کی آنکھیں جھک گئیں۔ پھر انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو انہیں جھکا لگا۔ بزرگ غائب تھے۔ لیکن کار میں انوکھی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جو اقلیم کے سر سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ”یہ کیا؟“ ریمز کے منہ سے نکلا تو اقلیم نے کہا۔ ”الہام! ہمیں اپنے مقاصد کی کامیابی کے لئے کسی روحانی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ جو پوری ہوگئی۔ اب کسی مسجد میں چلتے ہیں۔“

جاوید نے پوچھا۔ ”کون سی مسجد میں اور یہاں مسجد کہاں ہوگی؟ مجھے تو ان بزرگوں کی باتیں سمجھ نہیں آئیں؟“

اقلیم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”روحانی باتوں کی سمجھ دیر سے آتی ہے اس لئے اس میں الجھنا نہیں چاہئے اور بزرگ نے ظہر کی نماز ادا کرنے کے لئے کہا ہے اس لئے ہم مسجد میں چلتے ہیں۔ اب اپنے آپ کو مست الجھنا میں تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔“

جلدی ہی وہ ایک اسلامک سینٹر پہنچ گئے۔ ظہر کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ جب وضو کر کے مسجد میں پہنچے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ انہیں سنتیں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ وہ جلدی سے جماعت میں شامل ہو گئے۔ پھر جماعت ختم ہوئی۔ امام صاحب نے دعا مانگی اور سب لوگ باقی نماز ادا کرنے لگے۔ وہ تینوں بھی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو امام صاحب بولے۔ ”آپ تینوں حضرات ادھر آ کر نماز پڑھیں۔“ انہوں نے غراب کے قریب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اقلیم وہیں چلا گیا۔ انہیں سنتیں بھی ادا کرنی تھیں۔

جب وہ فارغ ہوئے تو دیکھا کہ مسجد خالی تھی۔ سب نمازی جا چکے تھے۔ سوائے امام صاحب کے۔ اچانک اقلیم کی نظر غراب کے قریب پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ امام صاحب کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ اچانک اقلیم کے ذہن میں جھمکا سا ہوا۔ ”جاؤ ظہر کی نماز ادا کرو۔ تمہیں رہنمائی ملے گی۔“ یقیناً یہ اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ اقلیم نے سوچا اور اس کاغذ کو اٹھایا۔ سفید رنگ کے اس کاغذ پر باریک الفاظ میں مسکرت زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اور اقلیم تو مسکرت جانتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اقلیم، ریمز اور جاوید جو کہ اب ڈاکٹر اقلیم، ڈاکٹر ریمز اور ڈاکٹر جاوید بن چکے تھے۔ اپنے ملک واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر ریمز کے گھر سب مدعو تھے۔ نقشہ گوشت رہے تھے۔ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر ریمز کا پانچ سالہ بیٹا عدنان اور ڈاکٹر جاوید کا چار

سالہ بیٹا اقبال کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں بھی کر رہے تھے۔ مزا اقلیم انہیں حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ”کاش میرا بھی کوئی بچہ ہوتا؟“ انہوں نے دکھ سے سوچا۔

اچانک مزر ریمز بولیں۔ ”ارے بھائی! اب کچھ کھا بھی لیں۔ اقلیم بھائی آ گئے ہیں۔ اب کہیں نہیں جائیں گے۔“ یہ سن کر مزر جاوید شرارت سے کہنے لگیں۔ ”ویسے اب آپ اقلیم بھائی کو لگام ڈال دینا بہت پڑھ لیا انہوں نے۔ اب گھر پر بھی توجہ دےں کچھ۔“ ان کی بات کا مطلب سمجھ کر مزر اقلیم سرخ ہو گئیں جبکہ اقلیم بھی جھینپ گیا۔

ریمز قہقہہ لگا کر بولا۔ ”زبردست بھابھی زبردست! اقلیم کو تو ہماری بہن کا خیال ہی نہیں۔ بس تجربات پر ہی لگا رہتا ہے۔“ اس نے یہ بات شرارت سے کہی تھی۔ ”اور ہاں اگر ثابت ہوئے تو ہم بھی مدد کریں گے۔ آپ کی۔ جری و مونزیال سے ہمیں یہ ایم فل اور PHD کھرا لائے لیکن ہماری بہن کو کتنی محنت منانے بھی نہیں لے گئے۔“ ڈاکٹر جاوید نے کون سا چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا کہ چپ رہے۔ ان چاروں نے ڈاکٹر اقلیم کو اچھا خاصہ نشانہ بنایا۔ بے چارہ۔ اقلیم خاموش ہی رہا۔

بہر حال یہ تقریب خوشی سے گزر گئی۔ ڈاکٹر ریمز اور ڈاکٹر جاوید ڈاکٹر اقلیم کے ساتھ مل کر اپنے کام میں لگ گئے تھے انہیں یہ تجسس تھا کہ ڈاکٹر اقلیم کو مونزیال کی مسجد سے جو کاغذ ملا تھا۔ اس پر کیا کچھ لکھا تھا۔ ڈاکٹر اقلیم نے انہیں بتایا۔ ”دراصل ہمارے مقصد کی تکمیل کے لئے روحانی مدد ہوئی ہے۔ اس مدد سے ہم ایک ایسی مشین بنا سکتے ہیں جو ہمیں جاودگروں کے ٹھکانے معلوم کرنے اور ان کے کالے عزائم سمیت ان کو دراصل جہنم کرنے میں مدد دے گی۔“ وہ دونوں حیران رہ گئے کہ کیا ایسی مشین بھی بن سکتی ہے جس سے جاودگروں کے کمالات دکھائے جاسکتے ہوں؟ ڈاکٹر جاوید نے پوچھا۔ ”اور تمہیں اس



بوڑھے جادوگر کے بارے میں پتا چلا اس کاغذ سے؟“  
 اقلیم نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”جب وہ مشین بن جائے گی تو پھر سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔“  
 رمیز بولا۔ ”بزرگ نے کہا تھا۔ آنگن کے پھول کے بارے میں کہ وہ سب سے زیادہ خوشبودار ہوگا تو اس کا کیا ہوا؟“  
 اقلیم مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”وہ میرے خیال میں مجھے اولاد کی نوید ہے اور زیادہ خوشبو کا مطلب کہ وہ بہت ذہین ہوگی یا کوئی ایسا کارنامہ سر انجام دے گی۔“  
 ”آمین آمین اللہ تیرے آنگن میں جلد پھول کھلائے۔“  
 اس تقریب والے دن بھائی کا چہرہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ ”جادو دینے کہا۔“  
 اور پھر وہ تینوں اس انوکھی مشین کی تیاری میں لگ گئے۔

ڈاکٹر اقلیم وغیرہ کو PHD کے دس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران ان کا بزنس وسیع پیمانے پر پھیل چکا تھا۔ اس دوران انہوں نے کئی کارنامے سر انجام دیئے تھے اور سائنٹ ویری کی دنیا میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اقلیم نے اپنے دوستوں کی مدد سے ایک ایسی مشین تیار کر لی تھی۔ جو ہر لحاظ سے انوکھی تھی۔ وہ مشین ڈاکٹر اقلیم نے اپنے بچکے کے تہ خانے میں رکھی تھی۔ اس مشین کا میکانزم اس طرح کا تھا کہ ایک چھوٹے ڈیپ فریزر جیسا اس کا CPU تھا۔ اس کی اسکرین دس فٹ لمبی اور پانچ فٹ چوڑی تھی۔ اسی حساب سے اس کے ساتھ ایکسز اور پرنٹر بھی منسلک تھے۔ اس کا کی بورڈ لاتعداد بٹنوں پر مشتمل تھا اور ماؤس نہیں تھا۔ اس لحاظ سے ایک طرح کا وہ کمپیوٹر ہی تھا۔ مگر اس کی انوکھی صلاحیت یہ تھی کہ مخصوص میٹھ یوز کرتے ہوئے اس کے ذریعے جادوگروں کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ چلا جا سکتا تھا۔ مثلاً کسی جادوگر کے بارے میں معلوم کرنا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ یا اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ تو ایک مخصوص طریقہ جو مونڈیا کی مسجد سے ملنے والے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ استعمال کرتے

ہوئے اس جادوگر کے بارے میں معلومات حاصل جا سکتی ہیں۔  
 مزید حیرت انگیز بات یہ کہ اس انوکھی مشین کے ساتھ ایک چھوٹی سی چپ بنائی تھی وہ چپ اگر کسی آدمی کے سر میں فٹ کر دی جائے تو اس کا زہریلے سم مشین کے کنٹرول میں آ جاتا اور مشین کنٹرول اس آدمی کو اپنے اشاروں پر بچا سکتا تھا۔ مزید وہ چپ جس کاغذ پر اس مشین کے CPU سے تھا۔ اتنی طاقتور تھی کہ مناسب جسم کے آدمی کو اس کے ذریعے چند منٹوں کے لئے ہوا میں اڑایا جا سکتا تھا اور یہی سب سے انوکھی خاصیت تھی اس مشین کی۔  
 بہر حال طویل عرصہ بعد جب مشین بن گئی تو وہ تینوں خوشی سے نہال ہو گئے۔ آخر ان کی برسوں کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔  
 ڈاکٹر اقلیم نے منکرت کی وہ کتاب جسے اس نے بوڑھے ہندو کے کمرے سے حاصل کیا تھا دوبارہ پڑھی اور اپنے دوستوں کو سنائی پھر ان کی اس موضوع پر طویل بحث ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اس عجیب وغریب مشین کو بھی استعمال کیا اور مونڈیا کی مسجد سے ملنے والے اس کاغذ سے بھی استفادہ کیا۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کتاب میں لکھی جانے والی تمام جادوئی چیزوں میں سب سے زیادہ طاقتور برہنہ روموٹی ہی ہے۔ جسے حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ وہ بوڑھا جادوگر۔ اگر وہ اسے حاصل کر لے گا تو یقیناً دوسروں کا جینا حرام کر دے گا۔ اب ان کا اصل ناکٹ اس بوڑھے کو مورتی حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ لہذا انہوں نے اس پر کام شروع کر دیا۔  
 جب وہ مشین پر اس کے بارے میں ریسرچ کرنے لگے تو حیران رہ گئے۔ مشین اس بارے میں کوئی مثبت جواب نہیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹر اقلیم کے ساتھ جادو اور رمیز بھی حیران تھے۔ وہ کیا جواب دیتے لیکن ڈاکٹر جادوید نے ایک مشورہ دیا۔ ”یہ مشین ابھی تیار ہوتی ہے اور برہنہ روموٹی“ تو بہت طاقتور ہے کیوں نہ پہلے

ہم چھوٹے قسم کے کمپلیٹ والے جادوگروں کی خبر لیں۔“  
 اقلیم نے تائید میں سر ہلایا۔ اور رمیز کہنے لگا۔  
 ”ہاں اس طرح ہمیں اس مشین کی خوبیوں، خامیوں کے بارے میں بھی صحیح طریقے سے پتا چل جائے گا۔“  
 اور وہ تینوں اس پر متفق ہو گئے۔ اور کمپلیٹوں والے جادوگروں سے زیادہ زیادہ حکمتیوں والوں تک جانے لگے۔ وقت گزرنے لگا۔ ان کے بال بھی سفید ہونے لگے۔ ان کی اولادیں جوان ہونے لگیں۔  
 البتہ ڈاکٹر اقلیم کی بیٹی انوشہ ابھی چھوٹی تھی لیکن تھی بڑی ذہین۔ اپنے باپ کی طرح کمپیوٹر سے دلچسپی رکھتی تھی۔ دس سال کی عمر میں وہ حیرت انگیز طور پر مکمل کمپیوٹر سیکھ گئی تھی، اب وہ اتنی تیز کمپیوٹر آپریٹ کرتی کہ ڈاکٹر اقلیم حیران رہ جاتا۔  
 ان تینوں کی ایجاد کی ہوئی مشین کے کارنامے بھی دن بدن بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کئی، کالے کرکوت والوں کے کالے کرکوت خاک میں ملائے اور انہیں سپرد ناز کیا۔ ساتھ ہی مشین میں نئی جدتیں بھی پیدا کیں اور اسے مزید اچھی طرح سمجھا۔ ان کی یہ مشین خفیہ تھی۔ منظر عام پر نہیں آئی تھی۔  
 پہلے پہل وہ پریشان رہتے تھے کہ ان کی یہ مشین ان کے بعد کون آپریٹ کرے گا کیونکہ رمیز کا بیٹا آدمی نہیں جانا چاہتا تھا جبکہ ڈاکٹر جادوید کا بیٹا ایزوروس میں، ان دونوں کو کمپیوٹر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سودہ پریشان رہتے تھے۔  
 لیکن جلد ہی ان کی یہ پریشانی دور ہو گئی۔ انوشہ اقلیم کمپیوٹر سے شدید دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ اکثر باپ سے بھی اس بارے میں بات کرتی تھی۔ ڈاکٹر اقلیم اپنی بیٹی پر فخر کرتا تھا۔ ڈاکٹر رمیز اور ڈاکٹر جادوید بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔  
 یہ ان دنوں کی بات ہے جب انوشہ دسویں میں تھی۔ وہ اس بچکے میں رہتی تھی۔ جہاں مشین پڑی تھی۔ ایک دن انوشہ نے سوچا کہ ”آخر تہہ خانے میں وہ کون سی چیز ہے کہ اس کے پاپا اور دونوں انگلی

وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ تبس سے مجبور ہو کر اس نے کمرے میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ مسز اقلیم کلب میں تھیں۔ انوشہ کے لئے اچھا موقع تھا۔ اس نے اپنے والد کے کمرے سے چابی ڈھونڈ لی اور مطلوبہ کمرے میں جا پہنچی۔ وہ اس عجیب وغریب مشین کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”یا اللہ خیر! یہ کیا بلا ہے؟“ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ کمرے میں گھوم گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ CPU اسکرین، کی بورڈ، آخر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس کا آئی کیو AO (150) تھا۔ مشکل سے مشکل بات بھی لحوں میں سمجھ جاتی۔ اس نے اسے آن کیا اور پھر کی بورڈ کے سامنے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ کی بورڈ کی بٹنوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔ بڑی سی اسکرین روشن ہو چکی تھی اور وہ مختلف پروگرامز بدل رہی تھی۔  
 ایک سیکنڈ تھا۔ جہاں ڈاکٹر اقلیم وغیرہ مدعو تھے اب یہاں سے فارغ ہو کر وہ سب داخل آرہے تھے۔ وہ تینوں ڈاکٹر اقلیم کے بچکے پر جا پہنچے۔ اقلیم نے گھر اطلاع کر دی تھی کہ وہ آرہے ہیں۔ اب وہ حیران رہ گیا یہ دیکھ کر کہ اس کی بیٹی اس کو ریسو کرنے کے لئے بچکے کے گیٹ تک بھی نہ آئی۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ ”اپنے کمرے میں ہوگی۔ بھمبریں میں اسے بتاتی ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد آ کر اس نے کہا۔ ”وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“  
 ڈاکٹر جادوید نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ کسی فرینڈ کے پاس چلی گئی ہو۔“  
 ڈاکٹر اقلیم بولے۔ ”دراصل مجھے یہ عادت ہو گئی ہے کہ کہیں سے بھی وہاں آؤں تو پہلے اس کا چہرہ دیکھوں۔ سلطانہ جب وہ آئے تو مجھے کال کر دینا اب ہم اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔“  
 وہ اپنی بیوی کو ہدایت کر کے اپنے دوستوں کے ساتھ تہہ خانے کی سمت چلے۔  
 تہہ خانے میں پہنچ کر انہوں نے جو دیکھا اس نے ان کے سر کا ٹیوڈ اڑا دیا۔ مشین والے کمرے کا دروازہ

کھلا تھا اور سامنے روشن اسکرین نظر آ رہی تھی۔ تینوں حیران رہ گئے۔ وہ دبے پاؤں کمرے کے دروازے پر پہنچے انوشہ کو کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے دیکھ کر ان کی آنکھوں کے دیدے پھیل گئے۔ انوشہ اپنے انداز میں تیز تیز انگلیاں چلا رہی تھی۔ اور اسکرین پر جو سین تھا۔ اس کو دیکھ کر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کیونکہ وہاں ایک بہت بڑا کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے کے درمیان ہوا میں ایک شید معلق تھا اور اس پر ایک بہت بڑے بد شکل بت کی تصویر تھی۔ شید کے نیچے شعلے تھے آگ کے آگ کے سامنے ایک بھیاک سا بوڑھا ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا، اچانک اسکرین پر سین بدل گیا۔ گھنے جنگلات دکھائی دینے لگے۔ پھر منظر بدلا اب کوئی تحریر دکھائی دے رہی تھی۔ پھر وہ تحریر زوم ہوئی یقیناً انوشہ اس کو پڑھ رہی تھی۔ تینوں ڈاکٹر ز پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ وہ PHD تھے اور کمپیوٹر کی دنیا کے مانے جانے والے وماغ تھے۔ انہوں نے PHD کر کے یہ مشین ایجاد کی تھی اور پھر اسے سمجھنے میں بھی برسوں لگا رہے تھے۔ لیکن یہ لڑکی 16 سال کی، دسویں میں پڑھنے والی اس کو اتنی تیزی سے آپریٹ کر رہی تھی۔ جتنی تیزی سے وہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تینوں کے دماغوں میں ایک شیریں آواز گونجنے لگی۔ ”ہم دعا کرتے ہیں تیرے آنگن میں ایسا بھول کھلے گا جو سب سے زیادہ خوشبو والا ہوگا۔“ ان کے دل سرت سے بھر گئے۔ اقلیم کی تو آنکھیں بھی غم ہونے لگیں۔ پھر وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ آہٹ سن کر انوشہ نے سر اٹھایا تو پہلے وہ گھبرا گئی پھر غصہ کر بولی۔ ”پاپا اور اٹکل! یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ میرے خیال میں آپ تینوں حضرات نے ہی بنائی ہوگی۔“ وہ معصومیت سے بول رہی تھی۔

ڈاکٹر اقلیم نے اسے گلے لگالیا۔ ”بہت خوب میری بچی۔ تم نے دل خوش کر دیا۔“ اس نے اس کی تعریف کی اور ڈاکٹر جاوید اور ڈاکٹر رمیز نے بھی اسے سراہا۔

”معاف کرنا پاپا! آپ اکثر و بیشتر اس کمرے میں رہتے ہیں اور دونوں اٹکل بھی۔ مجھے جس ہوا کر آخر بے کیا اس کمرے میں۔ سو آج میدان خالی پا کر میں نے آپ کے کمرے سے چابی چرائی اور یہ دریافت کر ہی لیا۔ پھر میں نے اسے آن کر کے چلانا شروع کیا۔ ہسٹری والے نوڈز کو پڑھ کر مجھے اپنے اوپر بہت فخر ہوا کہ میرے پاپا اور اٹکل اتنے عظیم ہیں لیکن چابی چرانے کی کوتاہی معاف کر دیں۔“ انوشہ نے مسلسل بولتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھ لئے۔

یہ دیکھ کر ڈاکٹر جاوید کہنے لگے۔ ”بہی! تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تم بہت ذہین ہو۔ اس مشین کو بنانے اور سمجھنے کے لئے ہمیں برسوں لگے۔ درمیان میں روحانی مدد بھی ہوئی۔ حالانکہ ہم PHD ہیں لیکن تم نے منٹوں میں اسے آپریٹ کر لیا۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔“ ڈاکٹر اقلیم اور ڈاکٹر رمیز اسکرین پر سوچو تحریر پڑھ رہے تھے۔ اچانک ڈاکٹر اقلیم بولا۔ ”وہ لکھا وہ مل گیا جس کی ہمیں تلاش تھی۔“ اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

”کیا مل گیا؟“ ڈاکٹر جاوید نے پوچھا تو دوسرے ہلاتے ہوئے جیسے پڑ جا بیٹھا اور بولا۔ ”نیچو جتنا ہوں انوشہ تم بھی نیچو“ وہ سب بیٹھ گئے۔ تو اقلیم نے کہا۔ ”وہ بوڑھا ہندو جادوگر! جو برہندرا مورتی کی حواش میں تھا۔ اس کا پتا ٹھکانہ مل گیا ہے۔“ اس نے خوشی سے کہا تو ڈاکٹر جاوید اور ڈاکٹر رمیز بھی چوک پڑے جبکہ انوشہ انہیں دیکھنے لگی حیرانی سے۔

ڈاکٹر رمیز کہنے لگے۔ ”اگر ایسا ہے تو یہ بہت بڑی کامیابی کی بات ہے۔“ ڈاکٹر اقلیم سر ہلاتا ہوا کی بورڈ کے سامنے جا بیٹھا اور کمپیوٹر آپریٹ کرنے لگا۔

3 گھنٹے بعد سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ اور وہ آئندہ کالاجل عمل بھی تیار کر چکے تھے۔ بوڑھا جس کا نام بسواس تھا۔ شیطان کی نظر کرم حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور شیطان نے اسے گیارہ سال پوجا کرنے کو کہا تھا، اس نے وہ پوجا ایک جنگل میں موجود

ایک کمرے میں کرتی تھی۔ جس میں ایک شیطان کا بت موجود تھا وہ کمرہ اور بت عرصہ پہلے شیطان نے اپنے ایک چیلے سے بنوایا تھا جو اس سے خاص طاقتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

بہر حال بسواس کو گیارہ سال پوجا کرنی تھی اور اس پوجا کا طریقہ کچھ اس طرح تھا کہ ہر سال کے اختتام پر اسے 15، 16 سال کی ایک حسین لڑکی کی بیعت دینی پڑتی۔ شیطان کے چلوں میں جلتی آگ میں اور پہلے سال اس کو یہ کرنا تھا کہ پورا سال پوجا کر کے جب سال ختم ہونے میں گیارہ گھنٹے رہتے ہوں۔ اسے پوجا چھوڑنی تھی اور بیعت کے لئے لڑکی کو ڈھونڈنا تھا۔ یہ شرط تھی اس پوجا کی۔ ان گیارہ گھنٹوں میں ہی اسے لڑکی کی تلاش کرنی تھی زیادہ وقت لگ جاتا مقررہ وقت سے تو پھر وہ نشت کر دیا جاتا۔

اور پھر جوں جوں سال گزرے اس لحاظ سے وہ گھنٹے کم ہوتے جاتے۔ یعنی پہلے سال اگر گیارہ گھنٹے تھے تو دوسرے سال دس۔ تیسرے سال 9، اسی طرح آخری بھی گیارہویں سال اسے ایک گھنٹہ ملنا تھا۔ اس ایک گھنٹہ میں اسے لڑکی تلاش کرنی تھی۔ یہ گیارہ سال کی ظلم تپسا اس لئے تھی کہ جہاں برہندرا مورتی رکھی گئی تھی۔ اس جگہ گیارہ ظلم تھے۔ ہر سال کی پوجا سے ایک ایک ظلم ٹوٹ جاتا اور گیارہ سال بعد مکمل طاقتیں حاصل ہو جاتیں۔ پھر برہندرا مورتی مل جاتی۔

بہر حال بوڑھا بسواس دس ظلموں کا توڑ حاصل کر چکا تھا اور گیارہویں ظلم کے لئے پوجا کر رہا تھا۔ یہ اس کا آخری مرحلہ تھا۔ پھر تخت یا تختہ ہو جاتا۔

ڈاکٹر اقلیم نے جو منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا سب سے اہم کردار انوشہ تھی۔ وہ اس طرح کہ جب بسواس کی پوجا ختم ہونے میں چند گھنٹے رہتے ہوں تو انوشہ کو اس مشین کے ذریعے اس جنگل میں پہنچا دیا جاتا۔ چپ اس کے سر میں ڈھتی ہوئی اور اس کا کنٹرول ڈاکٹر جاوید کے پاس ہوتا۔

ابھی بسواس کی پوجا ختم ہونے میں ایک ماہ باقی

تھا۔ اس دوران ڈاکٹر اقلیم اور اس کے ساتھیوں نے اس کیس پر مزید بحث کی۔ ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ ڈاکٹر اقلیم نے کچھ عرصہ پہلے جب بسواس کے بارے میں جانتا چاہا تھا۔ تو مشین کا جواب نفی میں تھا۔ اب یہ کیسے ممکن ہوا؟

تو ڈاکٹر جاوید نے کہا۔ ”اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ مشن بنائی ہے جبکہ اس کا ڈیزائن ہمیں روحانی طور پر مونیٹر یاں والے بزرگ نے دیا تھا۔ انہوں نے بھی پیشین گوئی کی تھی کہ اقلیم کے آنگن میں جو بھول کھلے گا۔ وہ سب سے زیادہ خوشبو والا ہوگا اور اب انوشہ بیٹی اتنی ذہین ہے کہ ہم بچپن سے ہی اس کی ذہانت کا مشاہدہ کرتے آ رہے ہیں۔ یقیناً یہ ذہانت اسے خصوصی طور پر عطا کی گئی ہے۔ ہم نے PHD ہو کر بھی اور روحانی مدد حاصل کر کے بھی اس مشین کو سمجھنے میں برسوں لگائے لیکن انوشہ بیٹی ایک گھنٹے میں ہی سمجھ گئی تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انوشہ کی روحانی طور پر مدد ہوئی ہے اور اس شیطان کا آخری وقت آ گیا ہے۔“ ڈاکٹر جاوید نے تفصیل سے کہا۔

ڈاکٹر رمیز بولا۔ ”ہاں! بالکل میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں کیونکہ کہتے ہیں ناکہ اللہ شیطانی کام کرنے والوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ اور پھر اچانک درمی سمجھ لیتا ہے۔ بسواس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔“

ڈاکٹر اقلیم نے تائید میں سر ہلایا پھر بولا۔ ”وہ بے میرا خیال ہے کہ انوشہ کو بیٹی کا پڑ کے ذریعے اس جگہ پہنچایا جائے۔ ایک مناسب جگہ پر بیٹی کا پڑ کھڑا کر دیا جائے۔ اور انوشہ سر کے لئے نکلے اور ٹھٹھے ٹھٹھے بسواس کی نظروں میں آ جائے۔“ وہ ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

بوڑھا بسواس اس کمرے میں جہاں شیطان کا بت ہوا میں معلق تھا۔ آگ کے سامنے بیٹھا مڑ پڑھنے میں مصروف تھا۔ بھڑکتی آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کی شکل بہت بھیاک لگ رہی تھی۔ آج وہ نہایت

خوش تھا۔ اس کا آخری سال مکمل ہونے کو تھا۔ اس کے بعد اسے وہ طاقتیں حاصل ہو جاتیں جن کے ذریعے وہ برادرِ مورتی حاصل کر لیتا۔

بہر حال جب وقت مکمل ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا تو اس نے منتر پڑھنا چھوڑا اور کسی لڑکی کی تلاش میں نکل پڑا۔ اگرچہ وہ بعد خوش تھا۔ لیکن اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ اگر اسے مطلوبہ لڑکی نہ ملتی تو وہ نشت کر دیا جاتا۔ جب وہ اس کمرے سے باہر نکلا تو اسے اپنی طاقتوں کے ذریعے پتہ چلا کہ یہاں سے تھوڑی دوری پر ایک بلی کا پتھر اتر ا ہوا ہے اور اس میں ایک نوجوان حسین لڑکی اور پائلٹ کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ اس خوشی سے نہال ہو گیا۔ ”اب میری منزل مجھے ملنے والی ہے۔“ اس نے سوچا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بلی کا پتھر میں موجود لڑکی جو یقیناً انوشہ تھی۔ بسواس کے پاس کمرے میں پڑی تھی وہ ٹرائی کی سی کیفیت میں تھی۔ درحقیقت اس وقت اس کا دماغ ہندوستان کے شہر ممبئی میں موجود ڈاکٹر جاوید کے کنٹرول میں تھا۔

وقت ختم ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ باقی تھے۔ بسواس نے شیطان کی اور زیادہ خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان پندرہ منٹوں میں منتر پڑھنا شروع کر دیا اور پھر مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ بسواس نے انوشہ کو آگ کے لالچوں میں ڈھکیل دیا اور پھر.....“

ڈاکٹر جاوید نے انوشہ کو بڑی مہارت سے کنٹرول کیا تھا۔ اب وہ بلی کا پتھر میں پہنچ چکی تھی۔ بلی کا پتھر اب اپنی سابقہ منزل کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ اقلیم وغیرہ بہت خوش تھے آخر انہیں اپنی محنت کا پھل حاصل ہو گیا تھا۔

چونکہ بسواس کامیابی کے قریب تھا۔ اس لئے شیطان نے اسے وارننگ دی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ توڑنے والے کوڑک میں پہنچائے۔ ورنہ اس کا انت وردناک ہوگا۔ سو بسواس بت کا ہاتھ توڑنے والے کی تلاش میں لگ گیا۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ اس لئے کہ اس کی

تنبیہ کو نقصان پہنچانے والے ڈاکٹر اقلیم، ڈاکٹر جاوید، ڈاکٹر ریمز اور انوشہ روحانیت کے زیر اثر تھے۔ اور پلید جاوید کو روحانیت تک کیسے رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ سو وہ بھی بری طرح ناکام ہو گیا تھا اس نے ایک عرصہ تک برادرِ مورتی حاصل کرنے کی خواہش میں گزرا۔ مگر اب اس کا دردناک انت ہونے والا تھا۔

ادھر ڈاکٹر اقلیم کے بیٹے کے تہہ خانے میں دردناک آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ آوازیں بسواس کی تھیں جو اس انوکھی مشین کے ذریعے سنائی دے رہی تھیں۔ بڑی اسکرین پر بڑا دردناک منظر نظر آ رہا تھا۔ بسواس کے جسم کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ سسک سسک کر مارتا تھا۔ شیطان کسی کا نہیں ہوتا۔ بیشک وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔

”چلو یہ بھی داخل جہنم ہوا۔“ ڈاکٹر ریمز بولا۔ تو انہوں نے شکر ادا کیا۔ پھر ڈاکٹر اقلیم نے مشین بند کی۔ اور تہہ خانے سے نکل آئے۔ تینوں کی بیویاں دوسری منزل پر موجود تھیں۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے شوہر کس عظیم کام سے فارغ ہوئے ہیں اور انوشہ کی قابلیت بھی ظاہر ہو گئی تھی۔ انوشہ بھی بلی کا پتھر کے ذریعہ اپنے بیٹے کے پہنچ چکی تھی۔ عورتیں حیران تھیں کہ انوشہ واقعی اور بھڑکتی ہوئی آگ میں سے بنی ہوئی عافیت کیسے باہر نکلی۔ تو ڈاکٹر اقلیم نے بتایا کہ یہ سب اس مشین کی وجہ سے ہوا، اور انوشہ کے کپڑوں اور پورے جسم پر فائر پروف کیمیکل لگا گیا تھا۔

تینوں دوست بہت خوش تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اللہ نے انہیں کامیابی عطا کی، اب ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ آئندہ بھی وہ ایسا قدم اٹھائیں گے ان اشخاص کے لئے جو انسانیت کے خلاف ایسے گندے علم کے ذریعہ کچھ کریں گے۔ بیٹے میں جیسے جشن کا سماں تھا اور اس خوشی میں سب نے مٹھائی کھائی۔



ڈر

### اسرارہ نوشین - فیصل آباد

رات کے ساڑھے بارہ بجے اچانک دروازہ کھلا اور ایک بالشت کی گڈیا دروازے پر کھڑی مسکرانے لگی اور پھر اس کا وجود بڑا ہوتے ہوتے اس نے مکمل ایک لڑکی کا وجود دھار لیا اور پھر وہ آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔

زہن پرستہ اور اچھے میں ڈالتی ہوئی ناقابل یقین تحیر انگیز اور حیرت انگیز کہانی

میں اپنے بچوں کو سختی سے منع کر رہی تھی کہ دوپہر میں باہر جا کر نہ ٹھیلیں مگر دونوں نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور باہر بھاگ گئے۔ اس بات کا مجھے شدید غصہ تھا اور میں نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ اب جب یہ دونوں واپس آئے تو ان کی خوب پٹائی کروں گی۔ کافی دیر کے بعد جب دونوں کھیل کر واپس آئے تو مجھ سے لپٹ گئے اور دونوں کو جلدی تھی کہ ہمارا کچھ کھانے کو دیں کیونکہ بہت بھوک لگی ہے۔ غصہ کہیں دور چلا گیا اور مجھے ان کی بھوک مٹانے کی فکر لگ گئی۔ جلدی جلدی کھانا دیا۔ مگر میں دیکھ رہی تھی آج کل دونوں میری بات کو یوں نظر انداز کر دیتے تھے اور اپنی من مانیاں کرتے تھے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں وہ واقعہ سناؤں جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں نے دونوں کو بیٹھا اور یوں شروع کیا۔ آج میں تم دونوں کو ایک سچا واقعہ سناتی ہوں۔

”جب میں چھوٹی تھی تو میں بھی تم لوگوں کی طرح اپنی امی کی بات نہیں مانتی تھی۔ خدا اور من مانی کرتی تھی جو دل میں آیا بس وہی کرتا ہے۔ چھٹیوں میں میری امی مجھے لے کر خالہ کے گھر گئیں۔ ان کا محن بہت بڑا تھا اور اس میں میری کارِ درخت بھی تھا۔ مجھے

خالہ کے بچوں نے بتایا کہ خالہ نے انہیں ہیری کی طرف جانے سے منع کیا ہے۔ وہاں آسیب ہے میں ان پر ہنسنے لگی کہ یہ کتنے ڈر پوک ہیں خالہ نے کہا اور انہوں نے مان لیا۔ میں نے آؤ دیکھنا تاؤ اور ہیری کے درخت کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ لوگ مجھے آوازیں دیتے رہ گئے۔ میں نے ہیری کے درخت کے نیچے پہنچ کر انہیں آواز دی کہ بتاؤ کہاں ہے آسیب؟ ہیری کے نیچے کچھ خوبصورت ہیر گرے ہوئے تھے میں نے وہ کھانے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ان کو چڑاتی رہی اور ان کی بزدلی پر ہنستی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پاؤں جل رہے ہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے آگ لگی ہوئی تھی میں وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر پاؤں جیسے زمین نے زور سے پکڑ لئے ہوں۔ چیخا چاہتی تھی مگر حلق سے آواز نہیں نکلی رہی تھی پاؤں جلنے کی تکلیف سے میں بے ہوش ہو گئی کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں بستر پر تھی اور سب میرے لئے فکر مند تھے۔ میری امی اور خالہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈانٹنے لگیں کہ جب منع کیا گیا تھا تو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ امی نے مجھے ”ذہیت“ اور ”خوسر“ تک کہہ





# بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 7

دھشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

بجس اور سپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ہر طرہ حیرت میں ڈال دیں گے

**وسیم** ان خیالوں میں ایسا تم تھا کہ اسے رشید کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

پھر اسے ایک نکتہ یہ احساس ہوا کہ رشید بھی جزیرے کے مشرقی کنارے پر اتڑ چکا ہوگا اور اب وہ سیدھا اس کی طرف چلا آ رہا ہوگا۔ رشید اپنے بارے میں پراعتاد ہوگا وہ اسے خنجر آزما کی بات دے دے گا۔ خنجر آزما کے لئے مقابل کا قریب آنا لازمی شرط ہے۔ اگر حریف قریب نہ آئے تو خنجر زنی کا ماہر کچھ نہیں کر سکتا۔

اگر اس کے پاس ایک خنجر ہو تو وہ اسے پھینک کر مار بھی نہیں سکتا۔ اسے ہمیشہ یہ خوف رہے گا کہ..... اگر دار خالی گیا تو وہ تنہا اور غیر مسلح رہ جائے گا..... رشید کے حق میں یہی نکتہ بہترین رہے گا کہ وہ یہ جنگ ایک خنجر سے لڑے تاکہ اسے وسیم پر جسمانی طور پر اور برتری حاصل رہے۔ اس طرح وہ با آسانی وسیم کو زیر کر سکتا تھا۔ وسیم کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ رشید مشرقی ساحل سے سیدھا جزیرے کے مرکز کی جانب رخ کرے گا۔ جزیرے کا مرکز اس کی یعنی وسیم سے بہت قریب تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے پیچھے میں زائد وقت لگے گا..... وہ رشید سے جسمانی زور آزمائی اور خنجر

آزمائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں کتنے اس کے نظریات اور منصوبے کے مطابق نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لاشی بھی ٹوٹ جائے اور سانپ بھی مرجائے اس کے ذہن میں تو کوئی اور ہی تدبیر آئی تھی۔ وہ رشید کے لئے ایک چوہے دان بنانا چاہتا تھا۔ جس میں مقابلہ کرنے سے پہلے ہی رشید اس میں جھنس جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مگزی کے جالے میں مکھی جھنس جاتی ہے۔

وسیم کے ذہن میں اچانک یہ خیال بجلی کی طرح آیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس چوہے دان کا خیال ایک خاک کی صورت میں پیدا ہوا تھا..... اسے یاد تھا کہ آخری مرتبہ وہ اس جزیرے پر آیا تھا۔ اس نے جزیرے کے مرکز میں گرے۔ درخت پر انگوڑی کی تیل لپٹی ہوئی دیکھی تھی..... اب اس میں نئی شائیں بھی پھوٹ آئی تھیں۔ پھر اس نے بڑی تیزی اور تندہی سے..... اپنا کام شروع کر دیا۔

وہ درخت جس کے گرد انگوڑی کی تیل لپٹی ہوئی تھی۔ وسیم نے اس کو صاف کئے اور تقریباً ایک ایک چالیں فٹ لمبی رسی تیار کی جو اطمینان بخش حد تک مضبوط اور پائیدار تھی..... وسیم کو معلوم تھا کہ وہ چوہے







ہے۔“ رشید نے بلند آواز میں کہا۔ وہ گھٹی جھاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔“ مجھے تم پر شرم آتی ہے۔۔۔۔۔! کوئی بھی اچھا شکاری ایسے چالوں کو تو راہی ٹاڑ لیتا ہے۔ کیا تم نے مجھے اندھا سمجھ رکھا ہے تم بےوقوف آدمی ہو۔۔۔۔۔!“

وسیم نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ زیادہ بہتر اور مناسب تھا۔۔۔۔۔ رشید کا مستمر انداز بھی اسے بولنے پر مجبور نہ کر سکا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یہ طنز برداشت نہ کر پاتا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رشید نے اس کی موجودگی کا پتہ چلانے کے لئے احمدیہ میں ایک تیر چلایا ہے۔۔۔۔۔ وسیم کا خیال تھا کہ وہ طفر کر کے اسے طیش دلا رہا ہے تاکہ وہ اس کے سامنے آجائے اور تیروں کا نشانہ بن جائے۔۔۔۔۔ پھر ادھر رشید نے ایک تیر کمان میں چڑھایا اور مخالف سمت جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس طرح وسیم کو ایک منہرہ موقع ہاتھ لگا جس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ ایسا احسن نہ تھا جیسا کہ رشید نے اسے سمجھ لیا تھا۔ نہ ہی وہ رشید کو احسن سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ جو دشمن کو احسن سمجھتا ہے وہ خود سب سے بڑا احسن ہوتا ہے، رشید کو احمدیہ نہ حرکت اسے اس کی توقع نہ تھی۔

”اب اس کے لئے رشید سے بچنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ وہ رشید کی عقابی نگاہوں سے اوجھل رہے اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ جتنا زیادہ رہے۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

وہ پھرتی سے جھاڑیوں کے عقب سے نکلا اور پوری قوت اور انتہائی تیز رفتاری سے رشید کی مخالفانہ سمت دوڑا۔۔۔۔۔ اسے احساس ہوا کہ رشید نے اس کا تعاقب بند کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اس نے سر گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا تو رشید کو اپنے سو قدم کے فاصلے پر بڑے ہی پرسکون انداز سے کھڑے پایا۔ اس نے ایک تیر کمان میں چڑھایا وہ اتھا اور بے حد اطمینان کے تھوہ دم کا نشانہ لے رہا تھا۔ اب وسیم کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اب رشید یقیناً اسے اطمینان سے نشانہ بنائے گا۔

وسیم کے پاس اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

پھر اسے سامنے جھاڑیاں نظر آئیں تو اسے اندھیرے میں امید کی کرن نظر آئی۔

وہ اس صورت میں رشید سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا کہ وہ جھاڑیوں تک پہنچ جائے۔۔۔۔۔ لیکن مسلمان جھاڑیوں تک پہنچنے کا تھا۔ جیسے ہی ایک تیر اس کے ذہن میں آئی اس نے ایک لمحہ بھی دیر نہیں کی۔ پھر وہ جھاڑیوں کی طرف کونڈا بن کر چلا۔ پھر چند قدموں کی دوڑ لگانے کے بعد وہ دانستہ ریت پر گر گیا جہاں وہ چہرے لئے کھڑا ہوا تھا۔ وہ پھر سرعت سے ریت پر کھڑے ہو کر تیزی سے دوبارہ بھاگا۔ لیکن اس مرتبہ وہ زنگ زنگ انداز میں بھاگ رہا تھا۔

اب وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ انتہائی تیزی سے دائیں جانب مڑا۔۔۔۔۔ اور پھر جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر ان کی طرف ایک لمبی جست لگا لی جیسے ہی وہ ان جھاڑیوں میں گھسا ایک تیر اس کے کولے میں پیوست ہو گیا۔ چوں کہ وہ کبڑی کمان سے نکلا ہوا تیر تھا اس لئے وسیم اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اندھے منہ گر گیا۔ اس کے پاس کچھ محسوس کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ خاردار جھاڑیوں میں زمین سے اٹھا اور اندھا وند جھاڑیوں میں گھس گیا اور پھر گھٹتا چلا گیا۔ تیر بدستور اس کے کولے میں پیوست تھا۔ تھوڑی دیر بھاگنے کے بعد وسیم نے مرکز دیکھا کہیں خون کے قطرے اس کے بھاگنے سے راستے کی تعداد میں نکل رہا تھا کہ وہ مارے کے سارا اس کی پتلون میں جذب ہو رہا تھا۔ دروکی پہلی میس کے ساتھ ہی اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اب شاید مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔ رشید نے خنجر کی جگہ تیر کا استعمال کر کے لڑائی کی شرائط کی خلاف ورزی کی تھی۔ اب اس پر مقابلے کو جاری رکھنے کا کوئی اخلاقی فرض باقی نہیں رہتا۔ اب اس کا صلہ یہ ہے کہ وہ کسی طرح جزیرے سے فرار ہو کر شہر پہنچے اور شہر جا کر

پولیس میں یہ رپورٹ درج کرادے کہ رشید نے اس پر چلقل کرنے کے ارادے سے کیا ہے اور یہ ختم کی موجودگی اس کے دعوے کو کوج ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس طرح رشید کو قاتلانہ حملے کے الزام میں دس بارہ برس کی قید ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اور اس کے مستقبل کے تمام خواب ریت کے گھر وندے کی طرح مسمار ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں ترنم اس کی ہو جائے گی۔ کیوں کہ وہ بارہ پندرہ برس رشید کا انتظار کرنے سے رہی۔

ایک لخت وسیم کو احساس ہوا کہ وہ غلط سمت جا رہا ہے۔ جزیرے کا مغربی کنارہ ایک پتلی اور لمبی پٹی کی شکل میں سمندر کے اندر دو رنگ چلا گیا تھا۔ وہاں سے تقریباً پانچ سو فٹ کے فاصلے پر وہ چٹانی سلسلہ تھا جو سیدھا خشکی سے جا ملتا تھا۔ وہ چٹانی سلسلہ ایک پتلی سی پٹی کی شکل میں تھا جو جوار بھاتا کے وقت پانی کے اندر روپوش ہو جاتا تھا اور جب پانی اتر جاتا تھا وہ پانی سے باہر نظر آتا تھا۔ اس کے لئے بہترین ترکیب یہ تھی کہ وہ جزیرے کے مغربی کنارے پر جا کر پانچ سو فٹ کا فاصلہ تیر کا پار کرے اور چٹانی سلسلے پر پہنچ جائے۔

وہ وہاں آسانی سے شہر جا سکتا تھا۔ اسے صرف یہ کہنا تھا کہ وہ کسی محفوظ جگہ چھپ کر بیٹھ جائے اور رشید جب اسے تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ جائے تو وہ خاموشی سے جزیرے کے مغربی ساحل کی طرف بڑھ جائے۔ ایسی صورت میں جب کہ رشید تیر کمان سے لپس تھا اور خود بخود حالت میں تھا۔۔۔۔۔ اسے رشید سے مقابلہ کرنے کا خیال اچھا محسوس نہ ہوا اور اب پوزیشن ایسی تھی کہ وہ اپنے خنجر سے رشید کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔

رشید جزیرے کی مشرقی سمت سے وسیم کو تلاش کرتا ہوا اور بوس گھٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے شکار کے اس طرح آسانی سے بچ کر نکل جانے پر سخت افسوس تھا۔ اس نے وہ جگہ جہاں وسیم چھپا بیٹھا تھا۔ وہاں اسے خون کے قطرے زمین پر پڑے دکھائی دیے

تھے جس سے اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی۔ وسیم خفی ہے اور پھر شرائط کے مطابق وسیم کے پاس صرف ایک خنجر ہے۔ لہذا وسیم اس سے بھڑکنے کی غلطی نہ کرے بلکہ بھی نہیں کرے گا۔

وسیم کے اس طرح جنگل میں روپوش ہو جانے سے اسے بے حد تشویش تھی۔ اس کا سارا مزاج کرکرا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اس کے لئے صورت حال سنگین ہو کر رہ گئی تھی۔ رشید نے خود کو وسیم کی جگہ رکھ کر سوچا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کرے گا۔۔۔۔۔؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ وسیم جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔ کیوں کہ اب وہ اس سے مقابلہ کرے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے چوں کہ شرائط کی خلاف ورزی کی تھی اس لئے وہ جزیرے سے فرار ہو کر شہر جائے گا اور وہاں پولیس اسٹیشن پہنچے گا اور اس کے خلاف قاتلانہ حملے کی رپورٹ درج کرادے گا تاکہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔۔۔۔۔ وہ کسی بھی قیمت پر وسیم کو جزیرے سے فرار ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔۔۔۔۔ اب تو وسیم کا جلد از جلد مر جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ خود اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ وسیم کے بچ جانے پر وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اب وسیم کی موت ہی خود اس کی آزادی، نیک نامی اور ترنم سے شادی کرنے کی ضمانت تھی۔

رشید کو ذرا سے غور و فکر کے بعد یہ احساس ہو گیا کہ وسیم فرار ہونے کے لئے کس راستے کو اختیار کرے گا تاکہ وہاں سے پانچ سو فٹ کا فاصلہ تیر کھٹے کر کے اور پھر پانی میں ڈوبے ہوئے چٹانی سلسلے کے ذریعے شہر تک پہنچ جائے۔ رشید نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے یہ کرنا ہوگا کہ شکار کسی بھی قیمت پر اس کے جال سے نکل کر جانے نہ پائے۔ لیکن شکار کو تلاش کرنے میں وقت لگے گا۔ اس لئے کہ شکار نہ صرف بہت تیز اور ہوشیار ہے بلکہ بے حد خطرناک ہو گیا ہے۔

وسیم نے اپنے فرار ہونے کی سمت تبدیل کر دی

تھی اور وہ گھوم پھر کر دوبارہ جزیرے کے مرکزی طرف آ گیا۔ اس نے چھینے کی ایک محفوظ جگہ ڈھونڈی اور زمین پر بیٹھ کر اپنے کو لمبے میں پوست تیر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں اسے بہت دقت پیش آئی۔ کیوں کہ وہ اس جگہ کو دیکھ نہیں سکتا تھا جہاں تیر پوست تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ انگلیوں سے تیر کی گہرائی اور زاویے کا اندازہ لگا کر تیر نکال لیا۔ ایسا کرنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن اس نے اپنے دانت مضبوطی سے سمجھ لے تاکہ اس کے منہ سے کوئی آواز اور کراہ نہ نکل سکے۔ تیر کے باہر نکلتے ہی خون اس کے زخم سے ابل پڑا۔ اس کے بخری کی مدد سے اپنی پتلون کا وہ پانچا پھاڑ لیا جو خون میں تر نہیں تھا اور اسے بھاڑ کر زخم پر پٹی باندھ لی۔ گو پٹی میں خاصا خون لگ گیا لیکن اس کی وجہ سے خون بڑی حد تک ٹھنکا بند ہو گیا۔

وسیم کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ یہ وقت سنانے اور آرام کرنے کا نہیں ہے کیوں کہ وہ موت کے حصار میں ہے۔ رشید اسے تلاش کرنا ہوا یقیناً اس کی طرف آ رہا ہوگا۔ جو غلطی اس نے غلط سمت ووڈ کر کی تھی اور جس کا اسے احساس ہوا تھا اس طرح رشید کو اپنے مرکز کی طرف آئے بغیر جزیرے کے مغربی کنارے تک پہنچنا بے حد دشوار تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ وہ غور سے اس خون آلود تیر کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے سرخ سرخ خون کو تیر کی نوک پر دیکھ کر وسیم کے جسم میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑنے لگی۔

رشید کو اس پر جو فوجیت تھی وہ تیر اور کمان کی تھی۔ وسیم کھڑا ہو گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں اب خون کا ایک ٹھاسا تالاب بن گیا تھا۔ جو تیر سے نکلتے ہی اچانک اس کے زخم سے بہنے لگا تھا۔ وسیم کچھ دیر تک سیکھے کی سی حالت میں اس خون کے تالاب کو دیکھتا رہا۔ جزیرے سے فرار ہونے کا خیال اس کے دل سے بالکل نکل چکا تھا اور رشید سے اس خون کی پوری قیمت وصول کرنے کا خیال اس کے دل کے ہر کونے میں تیزی سے جڑ پکڑ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر

اس کا سامنا رشید سے ہوگا اور وہ پورے جزیرے کو اس کی تلاش میں چھان مارے گا۔ اور اس کا چہرہ جب تک نہیں دیکھ لے گا وہ چین و سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ کیوں کہ اب وہ رشید کو قاتلون کے حوالے کر کے ہی دم لے گا۔ اس لئے وہ رشید سے غافل رہنے کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ رشید اسے رد کرنے کے لئے تاکہ بندی کی کوشش کرے گا۔ لیکن اب وسیم نے فرار کا خیال دل سے نکال پھینکا تھا۔ کیوں کہ اب یہ جنگ ایک لڑائی کو حاصل کرنے کے لئے نہیں رہی تھی بلکہ دو جانی دشمنوں کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔

اس نے ترم سے یہ بات کہی تھی کہ وہ سہاگ کی پہلی رات رشید کا سر منہ دکھائی میں وے گا۔ وہ ایسا کوئی ورنہ مفت، سفاک اور ظالم نہیں تھا۔ البتہ رشید ضرور ایسا کر سکتا تھا۔ وسیم لڑائی سے پہلے بہت پرامید تھا۔ پرامید تھا۔ مگر اس نے رشید کے بارے میں جو اندازے لگائے تھے وہ غلط ثابت ہوئے تھے جس کی قیمت اسے خون سے ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کے دشمن کو اس پر بڑی فوجیت تیر کمان کی تھی۔ لیکن اب اس کے پاس ایک تیر آ گیا تھا اور اسے ایک کمان کی ضرورت تھی۔ دوسرا تیر جو اس کے سر پر سے گزرا تھا وہ کہاں تھا اور اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔

وسیم اس جگہ گیا جہاں اس نے اپنی بیٹھ کے ذریعے سے چلک دار تنے کے درخت کو جھکا کر دوسرے درخت سے باندھا ہوا تھا وہ اس درخت کو آزاد کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی اس طرح کی آواز پیدا ہوئی تھی کہ اسے سن کر رشید اس کی پوزیشن کا با آسانی اندازہ لگ لیتا۔ اس نے اس کی مدد سے اس درخت کو اس طرح باندھ دیا اور اپنی بیٹھ پھندے سے آزاد کرانی۔ پھر وہ ایک ایسی خم دار ٹہنی کو تلاش کرنے لگا جو کمان کا کام دے سکے۔ وہ آہستہ آہستہ جزیرے کے مغربی ساحل کی

طرف بڑھتے ہوئے ایسی ٹہنی تلاش کرنے لگا۔ اسے اپنے مطلب کی ایسی پٹیاں اور ایک بڑی بڑی جھڑی۔ جوڑی پٹی سے اس نے کمان کے دونوں اڑوں کو مضبوطی سے باندھ لئے۔ اس طرح جو تیر کمان رشید کی تیر کمان کے مقابلے میں کم تر تھی لیکن استعمال کے قابل ضرور تھی اور کام دے سکتی تھی۔ اس نے رشید کے تیر کو کمان پر چڑھا کر پچاس فٹ کے واسطے پر ایک چیز کو نشانہ بنایا۔ تیر نشانے سے دس فٹ کے فاصلے پر سناٹا ہوا گز رہا۔ دوسری مرتبہ اس نے اپنے ہارٹ کا فاصلہ کم رکھا اور مشقیں شروع کر دیں۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اگر ہارٹ پر رشید جیسا لہا تو لگا آ دی ہو تو وہ تیس فٹ کے فاصلے سے سمجھ نشانہ لے سکے گا۔ لیکن ایک تیر اس مقصد کے لئے ناکافی تھا۔ اس نے چند مضبوط لکڑیاں چنیں اور انہیں جلدی جلدی چھیل کر تیر کی شکل کا بنا لیا اور اس کے منہ آگے سے چوڑا کیا۔ اب مسئلہ ان کا تھا۔ اس کے لئے اسے جزیرے کے ساحل تک جانا۔ وہاں اس نے چند سپیاں ڈھونڈیں۔ ان کے دو ٹکڑے کئے اور ان میں تیروں میں اپنی بیٹھ میں بچی ہوئی پتلی لٹائی۔ اسے باندھ دیا۔ بڑی مضبوطی سے خوب کس کر۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو شاید اسے بنائے گئے تیروں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

اسے اپنے بنائے ہوئے تیروں اور کمان پر اندازہ بھروسہ نہیں تھا۔ اسے شہ تھا کہ اس کے بنائے تیر کمان فٹ کے فاصلے سے بھی سمجھ نشانہ پر لگ نہ سکیں۔ لیکن کچھ نہ ہونے پر کچھ ہونے سے انسان کو اپنی فوجیت ملتی ہے۔ لہذا وہ اپنی تمام تیاریاں مکمل کر کے رشید کا انتظار کرنے لگا۔

رشید اس مرتبہ بڑی خاموشی سے آیا۔ وہ پہلے اس طرح چلڈی پر آ رہا تھا اور رک کر واپس بائیں طرف اور جہاں بھی وسیم کے چھینے کا شبہ ہوتا وہ اندر سے ایک خون خوار شکاری کتے کی طرح اس کا

مرتبہ وہ ایک چلڈی کو گھور رہا تھا۔ وہ وسیم کے بچھائے ہوئے کسی بھی جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے دشمن کے پاس صرف ایک خنجر تھا۔ تو کیا ہوا.....؟ آخر وہ اس کا دشمن تھا۔ وہ دشمن کو کمزور سمجھنے کا قائل تھا اور نہ ہی اسے کوئی ذرا سا بھی موقع دینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ ذرا سی رعایت اور بے پروائی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی۔

وسیم..... رشید کی ایک ایک حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک برق سرعت سے ایک منصوبہ آیا۔ ان جھاڑیوں سے نکل کر جہاں وہ چھپا ہوا تھا کھلی جگہ میں جلدی جلدی ریت کھودنے لگا۔ رشید اب بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ جلد ہی اسے ایک گھونگھل گیا۔ اسے ٹھٹھی میں دبا کر واپس اپنی جگہ آیا۔

رشید جب اپنی تیر کے مطابق چلڈی پر اس کے قریب آیا اور پہلے دائیں طرف جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا تو وسیم نے اس پر نظریں جمادیں۔ اس نے رشید کے بدن کو جھٹکا لیتے ہوئے دیکھا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے اور وہ اس کی نظروں کی گرفت میں ہے۔ وہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا خیال تھا وسیم اس جھنڈ میں نہیں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ وسیم کے قریب جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب کہ وسیم چلڈی کی دوسری جانب چھپا ہوا ہے دیکھ رہا تھا۔

رشید نے تیر کمان میں چڑھایا ہوا تھا اور بڑی خوریت کے عالم میں اسے تمام حواسوں کی مدد سے وسیم کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وسیم نے گیند بھینکنے کے انداز میں نشانہ باندھ کر گھونگھلے جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف اچھال دیا۔ گھونگھلے فضا میں اوپر بلند ہو کر سیدھا جھاڑیوں کے جھنڈ میں گر۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر رشید کو یقین ہو گیا کہ وسیم اس جھنڈ میں چھپا ہوا ہے۔ وہ حملہ کرنے کے انداز میں تیر کمان پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور تیر قدموں سے اس جھنڈ کو



دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا لیکن بے حد محتاط تھا۔ وہ اپنے دشمن کو اوپر حادی ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔

وسیم سرعت سے اپنی جگہ سے نکلا اور بلی کی طرح دبے پاؤں تیزی سے چمڈنڈی کے دوسری طرف بڑھا۔ رشید جویت کے عالم میں بدستور بھاڑیوں کے اس جھنڈ کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب وسیم اس سے تیس فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے رشید والا تیر کمان پر چڑھایا اور چلا کھینچا۔

”رشید! میں یہاں ہوں۔“ وسیم نے اسے انتہائی سرو لیجے میں مخاطب کیا۔ ”ادھر دیکھو۔“

پھر جو کچھ ہوا وہ وسیم کی توقعات کے خلاف تھا۔ رشید اپنی جگہ سے اتنی تیزی سے اچھلا جیسے ہندو کی نالی سے گولی نکلتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وسیم کی طرف مڑتے مڑتے جیسے ہی اس کی نظر وسیم پر پڑی اس نے گھٹنی ہوئی کمان سے تیر چھوڑ دیا۔ وسیم نے رشید کے سینے کا نشانہ لے رکھا تھا۔ جیسے ہی رشید کا جسم چند لمحوں کے لئے ساکت ہوا اس نے پوری قوت سے تیر چلایا۔

یہ وہی لمحہ تھا جب رشید نے اپنا تیر چھوڑا تھا۔ جو رشید نے بغیر نشانے کے چلایا تھا۔ وہ ایک زنانے کے ساتھ وسیم کے کان کے پاس سے نکل گیا۔ وسیم نے نشانہ لے کر تیر چلایا تھا لیکن اس کے باوجود وہ نشانے پر نہیں لگا۔ جبکہ سینے کے بجائے پسیلیوں میں گھس گیا تھا۔

رشید آدھا زمین پر تھا اور آدھا فضا میں۔ اس نے جلدی سے دوسرا تیر نکالا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے تیر ایک طرف پھینک دیا اور پھر اس نے خنجر نکال لیا۔ یہ دیکھ کر وسیم نے اپنے تیر کمان پھینک دیے اور رشید کی طرف لپکا۔ اپنے ناکارہ تیروں اور کمان پر ترجیح دیتا تھا۔ خنجر سے مقابلہ کرنے میں اسے زیادہ اطمینان تھا اور بے جگر سے لڑ سکتا تھا۔ اس کی ہمت اور طاقت عموماً آتی تھی۔ وہ رشید سے پانچ قدم پر رک گیا۔

اب دونوں دشمن ایک دوسرے کے متقابل کھڑے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے غضبناک نظروں سے دیکھ رہے تھے اور رشید وحشی لگ رہا تھا۔ رشید کمری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے حقارت نفرت اور ورنڈگی جھانک رہی تھی۔

بجلی کی سی سرعت سے رشید کا خنجر والا ہاتھ ایک دم سے پیچھے ہوا۔ وہ حرکت اتنی تیز تھی کہ جس کی آنکھوں سے دیکھا جانا ناممکن تھا اور پھر تیر کی طرح خنجر رشید کے ہاتھوں سے نکل کر وسیم کی طرف لپکا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وسیم اس کے جواب میں بے بس تھا۔ اسکیل کا خنجر بجلی کی طرح اس کی طرف آ رہا تھا۔ بے اختیار وسیم نے ہانگس کے انداز میں اپنا ہاتھ خنجر روکنے کے لئے آگے بڑھایا۔ شاید وسیم کی قسمت اچھی تھی۔ اگر وہ خنجر ہاتھ کی کہنی کے قریب نہ لگتا تو وہ سیدھا سینے میں اتر جاتا۔ خنجر اتنی قوت سے پھینکا گیا تھا کہ وسیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کی کہنی کو توڑتا ہوا اندر گھس گیا ہو۔ کیوں کہ اب وسیم کے زندہ رہنے کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ وسیم نے رشید کا خنجر کہنی سے کھینچ کر بغیر دیکھے پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ فوراً ہی اس کی کہنی سے خون بہنے لگا۔ لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ سیدھے ہاتھ میں وہ خنجر دبائے رشید کی طرف بڑھا۔ اسے صرف ایک ڈر تھا کہ نہتا ہونے کے بعد رشید کہیں بھاگ نہ جائے۔ وہ رشید کا پیچھا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے کولہے کا زخم سوچ رہا تھا۔ اگر رشید بھاگ کر کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ رشید سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رشیدی فطری طور پر بزدل تھا۔ رشید شاید تنہا ہونے کے بعد واقعی بھاگ جاتا۔ لیکن وہ ایک طویل عرصے وسیم کو حقارت بھری نظروں سے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ وسیم اسے جسمانی طور پر نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ

اس کی نفرت اتنی شدید تھی کہ وہ اپنی دوسری ناکا کی پر غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس کا چہرہ دیوانگی کے عالم میں اس بری طرح مسخ ہو گیا کہ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشتانہ پین صاف جھلک رہا تھا۔ وسیم کو قریب پا کر وہ اس طرح سے پیچھے ہٹا جیسے کوئی شیر اس پر حملہ آور ہونے والا ہو۔ پھر رشید تیزی سے زمین پر بڑی خشک ٹہنی اٹھانے لگا۔ جیسے اس کے نزدیک کوئی ہتھیار ہو۔

وسیم بہت محتاط اور چوکنا تھا اور اس کی بدلتی ہوئی کیفیات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے رشید دیوانے ورنڈے کی طرح نظر آیا جو غصے اور دیوانگی سے اندھا ہو رہا تھا۔ رشید نے بڑی ٹہنی کو اٹھا کر ہوا میں اس طرح لہرایا جیسے وہ ہلکی سی چمڑی ہو اور وسیم پر عقاب کی طرح چھٹا۔ وسیم پھرتی سے اسے جھونک کر ایک طرف ہٹا اور اس کے ساتھ اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ پوری قوت سے رشید کی طرف بڑھایا۔ خنجر رشید کی پسیلیوں میں گھس گیا۔ رشید ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ خنجر اس کی پسیلیوں سے باہر نکل گیا۔ وہ بدستور وسیم کے ہاتھ میں اس سے پہلے کہ وسیم گھس کر اپنا دوسرا وار کرنے کی سوچا جس نے رشید کو دونوں ہاتھوں میں بھاری بھرکم ٹہنی لاش کی طرح بکڑے خود پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ اس لمحے وسیم سب کچھ بھول گیا۔ اس پر رشید کے جسم میں خنجر اتارنے کا بہت سوار ہو گیا تھا۔ اس نے لکڑی کے وار سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر رشید سے ٹکرایا۔ اس کے خنجر والا ہاتھ ورتے تک رشید کے سینے میں پھوست ہو گیا۔ اس نے خنجر باہر کھینچا اور دوبارہ رشید کے سینے میں پوری قوت سے گھمایا۔ خنجر گوشت کو چھانٹتا ہوا اور پسیلیوں کو توڑتا ہوا رشید کے سینے میں وحشتا ہوا چلا گیا۔ وہ عمل اس قدر پرسکون تھا کہ وسیم نے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

وسیم کو جب ہوش آیا تو دوسری صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وسیم بہت دیر تک آنکھیں کھولے اپنی یادداشت کو ذہن کے تاریک گوشوں میں ڈھونڈتا اور جھانکتا رہا تھا۔ پھر اسے رشید کا مروہ جسم اپنی ناگوں پر بڑا ہوا نظر آیا۔ وہ اس لمحے بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کولہے اور کہنی کے زخم سے کافی خون بہا تھا لیکن ہوش میں آنے پر اس نے اپنے زخموں کو بہتر حالت میں پایا۔ خون نکلتا بند ہو چکا تھا اور زخموں کے منہ پر خشک ہوا سے کھرند سا جم گیا تھا۔ پھر اس نے دھکا دے کر رشید کو اپنی ناگوں سے ہٹایا اور لاش کے بلے لہو چرے کو دیکھنے لگا۔

جب ان دونوں کے دوست جزیرے پر دوسری صبح قاتح کو لینے پہنچے تو انہیں وسیم رشید کے مروہ جسم کے پاس لیٹا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان اور فلاسک میں گرم گرم کافی لائے تھے۔ فرسٹ ایڈ کا سامان بھی تھا۔ وسیم کا دوست ایک بڑا سڈاریف کیس لایا تھا جسے لانے کے لئے وسیم نے کہا تھا۔ وسیم جو تیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ وسیم نے ان دونوں سے کہا کہ رشید کی لاش کو کہیں دور لے جا کر کسی گہرے گڑھے میں دفن کر دو۔ کسی قریبی گڑھے میں دفن کرنا مناسب نہیں۔ اگر اتفاق سے کسی ندی کی موپائل لالچ آگئی جیسا کہ کسی بھی وقت آسکتی ہے اس نے دیکھ لیا کہ لاش کی تدفین کی جارہی ہے لینے کے دینے بڑ جائیں گے۔ اس کی بات مان کر وہ رشید کی لاش کو اٹھا کر جنوب کی جانب چل دیے۔ جہاں بادش سے چھوٹے بڑے گڑھے پڑے تھے۔ وسیم نے دیکھا کہ نشن میں پراٹھے، ابلے ہوئے انڈے، بکھن ملائی اور انڈوں کا آملیت تھے۔ وہ ان سے پیٹ کی آگ بجھانے لگا۔ پھر اس نے فرسٹ ایڈ بکس دیکھا۔ اس میں درو کے کپسول، زخم کا مرہم اور مسکن گولیاں بھی تھیں۔ اس نے پانی کی مدد سے انہیں ایک ایک کر کے نگل لیا۔ وہ پانی بھی دو بوتلوں میں بھر کر لائے تھے۔ پھر وہ گرم گرم کافی پینے لگا تو اسے بڑا آرام، فرحت اور سکون کا احساس ہوا۔ اس نے رشید کو دفن



کرنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس لئے کہ اس کی حالت اس وقت اس قابل نہیں تھی کہ چند قدم بھی چل سکے اور پھر رشید کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس قابل تھا وہ درندہ صفت تھا۔

چند قدم پر چڑھا تاں ہاں دسم نے کپڑے اتار کر ایک کپڑے سے سارا جسم صاف کیا۔ منہ دھویا۔ پھر اس نے ریف کس میں سے ایک جوڑا نکال کر بہن لیا اور خون آلود کپڑے ساتھیوں کو دینے کہ کسی قریبی گڑھے میں دفن کر دیں۔ اس ریف کس میں جو اور چیزیں موجود تھیں وہ اس نے کیوں اور کس لئے رکھی تھیں وہ خود ہی جانتا تھا۔

دسم نے اپنے دوست مجید سے درخواست کی کہ اسے واپس شہر لے جانے کے بجائے اس مسافر جہاز پر سوار کر اے جو مسند پیر بار یاں اور ایک اور شہر ہوتا ہوا ڈھاکا جاتا تھا۔ پھر دونوں اسے لے کر دریا کی حدود کی طرف بڑھے۔ اتفاق سے دور سے ایک مسافر اسٹیمر آتا دکھائی دیا۔ کارگو بھی تھا اور مسافر اسٹیمر بھی۔ اس اسٹیمر کو ان کی سمت آتا دیکھ کر دسم شش دہج میں پڑ گیا۔ اس کے دوستوں نے اس کی یہ بات سن کر شہر واپس نہیں جائے گا۔ عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

دسم کو احساس تھا کہ اب اسے اس شہر کو چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیوں کہ اب اس کے راستے میں کوئی دیوار نہیں رہی اور نہ ہی پتھروں میں کوئی زنجیر۔ اب وہ ایک فاتح تھا۔ اس دنیا میں رشید کے عہد تراک انجام سے واقف تھے۔ مجید اور اناچو۔۔۔۔۔

وہ قتل و قمار اور قابل اعتماد دوست تھے۔ اسے معلوم تھا کہ کسی کی زبان سے بھی کبھی رشید کے انجام کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔۔۔۔۔ وہ شہر جاسکتا تھا۔ بیماری کے بہانے مجید کے ہاں چند روز علاج کے لئے رہ سکتا تھا۔ وہاں اس کے زخموں کو چھپا سکتا تھا اور زخموں کے مندل ہو جانے کے بعد وہ اپنی پرانی دوبارہ شروع کر سکتا تھا اور فاتح ہونے کی حیثیت سے ترم کو حاصل کر سکتا تھا۔ اسے ترم کے وعدے پر اعتبار تھا۔ وہ

اس کی پابند بھی تھی اور اس نے یہ ہر پیمانہ پڑھا۔ لیکن ترم کو رشید کی فتح کا پورا یقین تھا۔ اب اگر وہ فاتح کی حیثیت سے ترم کے سامنے جائے گا تو ترم بھی اس کے فاتح ہونے کا یقین نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ یہی کہے گی کہ اس نے رشید کو دھوکے اور فریب سے شکست دے کر مردوں کی طرح مقابلہ کر کے نہیں۔ اور پھر وہ ایسے دھوکے باز فاتح سے نفرت کرنے لگے گی جو اس کے محبوب کو شکست دے کر اس کے جسم کا مالک بن گیا تھا اور پھر اس کا یہ خیال بھی ہوگا کہ وہ اسے کھلونا یا کر خوب کھیلے گا۔ اور اس پھول کو دن رات روندنا سکتا اور سفاکی بے رحمی اور دوندگی سے کھینچتا رہے گا۔ اس میں محبت نام کی ایک رت تک نہیں رہے گی۔ اسے جو ان ہی سمجھے گا۔۔۔۔۔ اسے مجبور کرے گا وہ اسے ہر طرح سے خوش کرے۔ اس کے پیر کی جنتی بن جائے۔۔۔۔۔ وہ اس نفرت کا بدلہ لے گا جو بات اس نے اس روز باغ میں کہی تھی۔

اگر رشید اسے شکست دے کر ترم سے شادی کر لیتا تو کچھ رے ترم پر رشید کی حقیقت سامنے آ جاتی اور اس کا اصل چہرہ جو بے حد مکروہ اور گھٹا تھا اور جو چہرے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ دیکھ لیتی اور وہ اسے بزدل، کمینے اور اس سچ آوی سے نفرت کر لے لگتی۔ پھر اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ رشید وہ نہیں ہے جو اسے نظر آتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اب رشید اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور مرنے کے بعد ترم کی نظروں میں رہتی دنیا تک ہیرو بن گیا تھا۔

اس کے دل کے کسی کونے میں ایک احمقانہ کوشش سرا بھار رہی تھی۔ وہ واپس شہر چلا جائے اور ترم کو حاصل کرے جس کے حصول کی تمنا شہرت اور دنیا کی روئیں پرورش پارہی تھی اور اپنی باقی زندگی نفرت کی کڑی دھوپ میں گزارے۔ اب اس کے دل میں ترم کی محبت کی رت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ کہیں گہرائیوں میں دفن ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ترم نہایت حسین۔۔۔۔۔ جاذبیت

سے بھر پور۔۔۔۔۔ بجلی بھرے گداز اور پر شباب بدن کی۔۔۔۔۔ پر کشش اور رشید کی طرح میٹھی تھی۔۔۔۔۔ اس رات ترم نے بس خود سپردگی اور دلہانہ انداز سے رشید سمجھ کر اپنے آپ کو جس فحاشی اور مہربانی سے نوازا تھا وہ اسے کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔۔۔۔۔ وہ جوان تھا۔ طاقت ور تھا۔۔۔۔۔ اس کے دل میں جوانی کی انگلیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ وہ اسے کھلونا اور کتیا سمجھ کر حقارت اور نفرت کا سلوک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ رشید نہیں تھا۔

ترم نے اسے کسی مار مار ی تھی۔ مگر وہ جیت کر بھی مار گئی تھی۔ اس نے نفرت کی۔۔۔۔۔ تو بہن و تذلیل مار مار ی تھی اب ساری زندگی وہ خود اس کی آگ میں جلتی رہے گی۔۔۔۔۔ اب اس کی عزت داغ وار ہو چکی تھی۔ اور پھر اب خالی برتن تھی۔ ایسی ذلت جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دسم ڈھاکا جانے والے جہاز میں سوار ہو کر اس وقت اس کشتی کو دیکھتا رہا جس میں مجید اور اناچو بیٹھے ہوئے تھے جب تک وہ ایک بار ایک نقطہ بن کر دریا کی سرکش اور پر جوش موجوں میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

جب وہ ڈھاکا پہنچا تو اس نے ایک اسپتال میں تیس دن تک رہ کر اپنا علاج کرایا۔ علاج تو ایک بہانہ تھا۔ آرام کرنا اور سوچنا تھا کہ اب اسے اپنی زندگی کیسے اور کس طرح گزارنی ہے۔ جیل میں اس نے جو کچھ سیکھا تھا اس نے اسے مثبت زندگی اور دردی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کا بیڑا اٹھالیا۔ اس نے بڑی بڑی مہم سرکیں اور کارنامے انجام دیے۔ یوں اس کی آمدورفت ہندوستان گاہے بگاہے ہوتی رہی تھی۔۔۔۔۔ پھر وہ بلیک ٹانگیر بن گیا۔۔۔۔۔ اسے اپنا ماضی یاد آ جاتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی نیلوفر کی زندگی میں جھانکا نہیں۔ لیکن یہ اس کے لئے بڑی مسرت افزا خبر تھی کہ اس کا شوہر صحت یاب ہو کر ملازمت کر رہا تھا۔ وہ آسودہ حال زندگی گزار رہا تھا۔ ترم کو بڑا شکی مزاج شوہر ملا تھا جس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس کا سارا غرور، گھمنڈ، تکبر اور

پندار حسن خاک میں مل چکا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے دھتک کر رکھ دیتا تھا۔ اسے خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے جو سزا مل رہی تھی وہ اپنے کئے کا بھگت رہی تھی۔

☆.....☆.....☆  
اب وہ بلیک ٹانگیر عرف دیوکار تھا۔ ممبئی شہر میں رہ کر وہ ہری زندگی گزار رہا تھا۔ ایک روز وہ سہ پہر کے وقت شام کے اخبارات دیکھ رہا تھا کہ کتنی کتنی خوشبو کی مہک نے نہ صرف اسے معطر کر دیا بلکہ اس کے دفتر کو بھی۔۔۔۔۔ یہ مہک کسی لڑکی یا جواں سال عورت کے لباس سے پھوٹی ہوئی اس کے دفتر میں پھیل گئی تھی۔ راہ داری سے شاید کوئی صنف نازک مہکتی، تھرکتی اور لپکتی گزر رہی تھی۔ یا ابھی اس کے دفتر کے سامنے سے نہیں گزری تھی اور بس گزرنے والی تھی۔

یہ کوئی نئی اور حیرت اور تعجب کی بات نہیں تھی۔ بازاروں میں، تقریبات اور بسوں میں صنف نازک خوشبوؤں میں بسی ہوتی تھی۔ جیسے پانی سے نہانے کے بجائے سنٹ یا عطریے غسل کیا ہو۔۔۔۔۔ شیشی انڈلی ہو جیسے شیشی مفت میں ملی ہو۔۔۔۔۔ عورت مردوں کو متوجہ کرنے کے لئے نامناسب، بھڑکیلے اور ایسے لباس میں ملبوس ہوتی ہے کہ وہ بے حجاب سی دکھائی دیتی ہے۔ یا پھر خوشبو سے متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب کہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ تو خود خوشبو ہوتی ہے۔

ٹانگیر اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر خوشبو جیسے دروازے کے نیچے سے گھس آئی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ دستک خوشبو دے رہی ہے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ممکن تھا کہ وہ ہڑ بڑا کے پیچھے ہٹ جاتا۔ لیکن شاید اس میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ ماضی میں جس حیرت اور صدمے سے گزر چکا تھا اب اس کے نزدیک بڑی بڑی باتوں کی اہمیت نہیں تھی۔ سرو جاس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہی مہتاب چہرہ۔۔۔۔۔ وہی زلفوں کی سیاہ روشنی

گھٹائیں، وہی رخساروں کے کنول..... وہی ہونٹوں کے گلاب..... جھیل سی آہ آنکھوں میں وہی چمک جیسے کوئی جوشیلا پھر دنیا کے سارے بھید جان لینے کے لئے گھر سے نکلا ہوا..... ذرا بھی تو فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی شکستگی اور شادابی میں.....

ساجن نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا مگر سرو جانے کیسی سنگ دلی سے اسے دھوکا دیا تھا..... اس کے بعد تو ٹائیگر کے خیال میں اس کے وجوہ سے تعفن اٹھنا چاہئے تھا..... مگر وہ بہک رہی تھی۔ رات کی رانی کی طرح..... اس کا گمان غلط تھا کہ سرو جانے اسے سڑک کے پار کھڑے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”کیا اندر آنے کو بھی نہیں کہو گے.....؟“ اس کے لہجے میں مان بھی تھا..... اور مسامت بھی، التماس بھی تھی۔ تکنت بھی۔

ٹائیگر خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ قامت میں ٹائیگر سے قدرے نکلتی ہوئی تھی۔ اس کے پاس سے گزر کر دفتر والے کمرے میں آ گئی۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے چند لمحوں کے لئے ادھر ادھر جائزہ لیتی رہی۔ پھر دیوار پر آویزاں تصویروں کو دیکھنے لگی۔ پورا دفتر ہمک اٹھا تھا۔

ٹائیگر نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ اس کے دفتر کی دیواروں پر جو تصویریں آویزاں تھیں ان میں ایک تصویر شہزادہ گھوڑے کی تھی۔ دنیا کا انتہائی تیز رفتار عربی اسل گھوڑا جس نے اب تک اپنی تیز رفتاری کی مثال قائم کی ہوئی تھی۔

”تم ابھی تک اس گھوڑے کو عزیز رکھتے ہو.....“ آخر وہ کب تک ریس کے میدان میں بادشاہ بنا رہے گا..... شبیب و فرناز..... ہار جیت مقدور کی ہوتی ہے..... کل اس کی جگہ کوئی اور گھوڑا لے لے گا۔“

ٹائیگر نے اس کی بات پر کوئی تہمرہ نہیں کیا، وہ جس لباس میں تھی نامناسب اور بے حجاب سا کر رہا تھا۔ یہ تو فیشن تھا۔ عربی غیر محسوس انداز سے رہبر سل کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ ساجن نے اسے جو پرس لا کر دیا

تھا۔ وہ فرانس کا تھا۔ ٹائیگر اسے دیکھا رہا چند گھنٹے پہلے وہ اس کے متعلق کیسے محترم اور خوب صورت احساسات رکھتا تھا کہ وہ سر بہ سر ساجن کے لئے۔ آخر دم تک میاں بیوی نے شریک سفر رہنے کا جو وجہ ایک دوسرے کو دیا ہے۔ انہیں موت ہی ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے۔

اب ٹائیگر کی دانست میں وہ کسی کے لئے بھی تھی۔ یہاں تک اس کے لئے بھی ہو سکتی تھی۔ وہ انسانوں کو پڑھنے میں اپنے آپ کو بہت ماہر سمجھتا تھا۔ لیکن پہلی بار اسے احساس ہوا کہ سرو جا کو شاید وہ کبھی صحیح طور پر نہ پڑھ سکا اور اس وقت صحیح طور پر نہیں پڑھ رہا ہے۔ سرو جا کے چہرے پر ندر مسامت، خوف اور تانسف کی کوئی علامت نہیں تھی..... وہ کسی بھی بڑی اداکارہ سے کم نہیں تھی۔ اس لئے اس نے خود پر قابو پا کر اپنے تاثرات کو عیاں ہونے نہیں دیا تھا۔ اس کے دفتر میں وہ پہلی بار آئی تھی لیکن اس کے کسی انداز سے اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

سرو جا نے بغیر کسی تہمید کے دھبی آواز میں کہا۔ ”معلوم نہیں تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔“ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر اس کی آنکھوں میں منجمد آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

ٹائیگر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کل شام میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“ سرو جا نے مثبت لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھے دیکھ لیا تھا..... اسی لئے میں پہلی فرصت میں اپنی غرض سے آئی ہوں۔ میں نے تمہارے بشرے سے بھانپ لیا تھا کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔“ ”بس میں نے دیکھا اور خاموش رہا۔ اس لئے کہ میں کسی کے ذاتی معاملات میں بلاوجہ ٹانگ اڑانے کا عادی نہیں ہوں۔“

”میں یہ بات جانتی ہوں کہ ساجن نے مجھے چوں کہ اس کے ساتھ نہیں دیکھا اس لئے اپنی لاپٹی کی وجہ سے اس انتشار اور اذیت سے دوچار نہیں ہے۔“

سرو جا کی زبان میں ذرا بھی ارتعاش نہیں تھا۔ آواز کا ترنم بھی برقرار تھا۔ وہ اس کی طرف جھک گئی۔ ”مگر اس معاملے کا تعلق ساجن سے نہ ہوتا تو تم بھی شاید اتنے پریشان اور دل گرفتہ نہ ہوتے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”لیکن چند لمحے کے لئے مجھے فرض کر دو کہ تم ساجن کو بھی نہیں جانتے اور مجھے بھی نہیں..... فرض کر دو کہ تمہاری عدالت میں ایک ایسی جڑ سے کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔ اس ضمن میں تمہیں میرا موقف سننا ہے۔ ٹھنڈے دل سے میری بات سن کر تم جو کچھ بھی کرو گے۔ میں تمہیں حق بجانب سمجھوں گی۔ کیوں کہ تم میرے ماضی اور حال سے واقف نہیں ہو بلکہ اندھیرے میں ہو۔“

☆.....☆.....☆

حقیقت بھی یہی تھی۔ ٹائیگر کی اس سے اور اس کے شوہر سے تقریبات میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ پھر ان کے درمیان خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ساجن اس لئے بھی اس کا دوست اور مداح تھا کہ اس نے ساجن کے ایک دوست کو ایک کیس میں اذیت، ذلت اور پریشانی سے نجات دلائی تھی۔ ورنہ وہ پٹائی چڑھ چکا تھا۔ اس لئے بھی ساجن اس کی بڑی عزت کرتا تھا بلکہ محبت کرتا تھا۔ یہ اعزاز ساجن کے دوستوں میں سے شاید ہی کسی اور کو نصیب تھا۔

ایک غلط کا خنجر چھ برس تک ساجن کے دل میں بیوست رہا..... ایک راز کی غلط کا یہ راز اس کے سینے میں ماسور بن گیا تھا۔ ابتدا میں اس راز کا تعلق صرف ساجن تک ہی تھا۔ بعد میں ٹائیگر سے ہو گیا تھا۔ ساجن کے کرب میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو راز دار نہیں بنایا تھا۔ یہ شخص اتفاقاً صرف ٹائیگر کے علم میں آ گیا تھا۔ اس سے التجا کی گئی تھی کہ یہ راز اپنی ذلت تک مخفی رکھے۔ ٹائیگر نے بغیر کسی غرض کے ساجن کو غلاظت کے ولدل سے نکالا جس میں سے اسے گرا دیا گیا تھا تاکہ اس کی عزت کو روک دیا جائے اور اسے بلیک میل کر کے لاکھوں ماہانہ وصول کیا

جائے..... جب ٹائیگر نے اسے اذیت ناک عذاب سے نجات دی تو وہ اسے پوچھنے لگا۔ ٹائیگر نے بلیک چیک واپس کر دیا۔ ساجن کو یقین نہ آیا کہ اس دنیا میں ابھی بے غرض، پر غلوں و دوست لوگ موجود ہیں۔ ریا کاری اور منافقت کے اس دور میں اگر ایک مرد دوسرے مرد سے محبت کا دعویٰ کرے تو لوگ نہ جانے کیا مطلب اخذ کریں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ٹائیگر کا ساجن سے ایک ذریعہ خاص تھا اسے صرف لفظ محبت کے ذریعے سے بیان کیا جاسکتا تھا اور یہ محبت مثبت پہلو تھی..... ٹائیگر کو نہیں معلوم تھا کہ ساجن جتنا بڑا دولت مند ہے اتنا ہی عظیم الشان ہے۔ اسی لئے تو ساجن کو ذلت و رسوائی کے دلدل سے نکالا تھا۔ وہ ساجن کا وفادار بن گیا تھا۔

ساجن کوئی معمولی آدمی یا دولت مند نہیں تھا۔ ساجن لال کپور ہندوستان کے چوٹی کے دس بڑے سرمایہ داروں میں سب سے بڑا شمار کیا جاتا تھا۔ جنہیں درجن بھر آئی بی ایم کی بیوروں پر اپنی دولت کا شمار کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ فقہہ الونو عظیم الشان الینیشن کارخانے، رہائشی و دفتری عمارتیں، مرغ بانی اور گلہ بانی کے فارم، وسیع و عریض چراگاہیں، پرفضا مقامات پر بیٹیں بیٹیں کمروں اور ممبئی کی ساحلوں پر بنگلے بٹس..... ذاتی طیارے..... نادروں گاڑ گاڑ تھیں کیلری..... لمبوسات کے کمرے کی دیواریں محفوظ جواہر کا ذخیرہ اور نہ جانے کیا کیا۔

ساجن لال کپور سے ملنے پہلے ٹائیگر کے ذہن میں کسی بڑے ہندوستانی سرمایہ دار کا تصور عجیب سا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بیشتر بڑے سرمایہ دار حلیہ یا عادات کے اعتبار سے سرمایہ دار نظر نہیں آتے..... وہ عموماً بوڑھے مجبوں اور پانی پانی پر جان ویسے والے ہوتے ہیں مگر ساجن اس تصور اور مشاہدے سے بہت مختلف تھا۔

ساجن جوان سال تو نہیں تھا لیکن بڑھاپے کی حدوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ قلموں کے چند سفید بالوں سے اس کی وجاہت میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ فلموں

## اسی کا ہوجا.....!

پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو چیونٹیاں اسے کھا جاتی ہیں۔ وقت کبھی بھی بدل سکتا ہے۔ ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلیاں بنا سکتا ہے مگر..... ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔ تو زندگی میں کسی بھی فرد کو مت ستانا..... کیونکہ اس وقت شاید آپ طاقتور ہوں مگر وقت آپ سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن..... جب انسان مرتا ہے تو اسے اپنا رزق بتا لیتی ہے۔ تو اسے بنی نوع انسان! بادلوں کی گرج اور رات کی سیاہی سے اپنے رب کو پہچان..... چھوڑ دے سب خرافات، گناہ اداری کا ہوجا۔

(محمد وارث آصف - واں بھجراں)

”کیا میری پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔ جو آپ اس قدر اعتماد سے کہہ رہے ہیں.....؟“

”میں نے ویسے ہی ایک معتبر آدمی سے آپ کی بڑی تعریف سنی تو کشاں کشاں چلا آیا ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اب آپ سے مل کر بات کر کے اندازہ ہو گیا کہ واقعی بہت نیک شخص ہیں..... میں دو ایسے پرائیویٹ سرانگ رسالوں کو جانتا ہوں جن کی خدمات دو نام دہیر دنوں نے حاصل کی تھیں۔ دس دس لاکھ کے معاوضہ کے عوض..... یہ دونوں ہیروئوں کو پہلی فلم ملی..... ان دونوں نے بولڈ مناظر سے راتوں رات شہرت، دولت اور مقام حاصل کر لیا۔ دولت کی ہوس نے انہیں راتیں کالی کرنے پر اکسایا۔ جب کوئی اداکارہ شہرت کے بام عروج پر پہنچتی ہے ان سے منہ کالا کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ ان کی کالی راتوں کو عکس بند کر کے بلیک میل کیا جانے لگا۔ پھر ان دونوں اداکاروں نے پرائیویٹ رسالوں کی خدمات حاصل

کوئی چیز نہیں ہے..... مجھے عزت جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میں اس دنیا میں عزت سے اس وقت تک جینا چاہتا ہوں جب تک آخری سانس باقی ہے۔“ اس نے ہاتھ سے لہجہ میں کہا۔

”میرے خیال میں اس بلیک میل سے نجات کے لئے آپ کسی بھی پرائیویٹ سرانگ رسال کی خدمت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ ٹائیگر نے مشورہ دیا۔ ”چالیس پچاس ہزار ملے آپ کی جان اور عزت چھوٹ جائے گی۔“

”ہاں.....“ وہ متحجب لہجہ میں بولا۔ ”آپ آج بڑی رقم ٹھکرا کر مجھے بڑے فائدہ مند مشورے دے رہے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں اور کس لئے..... جب تک آپ سے میری ملاقات ہے۔ شامائی بھی نہیں ہے۔ یہ بے فربہ کیسی ہے؟“

”اس لئے مجھے دولت کی ہوس اور لالچ نہیں.....“ ٹائیگر نے کہا۔ ”مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں کسی مظلوم اور پریشان حال کے کام آؤں..... دولت آتی جانی چیز ہے۔ یہ بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔“

”میں کسی بھی سرانگ رسال کی خدمت اس لئے حاصل کرنا نہیں چاہتا کہ وہ ان ممنوعہ اور غلاطی سے ہماری تصاویر حاصل کرنے کے بعد مجھے بلیک میل کرنے لگے گا۔ اس کی نیت میں فوراً آجائے گا۔ پیسہ کسے برا لگتا ہے..... دولت جتنی اچھی ہے..... اس سے کہیں بڑی ہے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میری شخصیت ہی ایسی ہے..... ان سرانگ رسالوں کی نظر میں میں سوئے کا انڈا دینے والی مرغی ہوں۔“

”میں ایک عام سا آدمی ہوں..... میری بھی نیت میں فرق آ سکتا ہے.....؟ میں آسمان سے اترا ہوا اداکار تو نہیں ہوں؟“

”آپ ہرگز ایسے آدمی نہیں..... آپ ایک فربہ صفت اور مخلص انسان ہیں، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں؟“

حاضر ہوا ہوں۔ معاوضہ منہ لگا پیش کر دوں گا۔“

”دس لاکھ روپے.....؟“ ٹائیگر نے مذاق میں کہا۔

”دس لاکھ کیا..... میں لاکھ بھی دے سکتا ہوں۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں لاکھ.....؟“ ٹائیگر جیسے اچھل پڑا۔ اسے اپنی سماعت پر جیسے یقین نہ آیا۔ ”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔“

ساجن نے جواب میں وہ بریف کیس کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا جو ساتھ لایا تھا۔ اس میں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔

”یہ کل رقم چالیس لاکھ روپے ہے..... اس میں سے پچیس لاکھ روپے لے لیں۔ من چاہے تو پوری رقم رکھ لیں۔“

ٹائیگر کی حیرت دو چنڈ ہو گئی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کہیں یہ شخص برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کی حریف پارٹی کا آدمی تو نہیں ہے جو صدر اور وزیر اعظم کو قتل کرانا چاہتا ہو..... اتنی بڑی رقم اس طرح پیش کر رہا ہے جیسے چار سو روپے ہوں۔

”اس قدر گراں قدر معاوضہ.....؟“ ٹائیگر نے چکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کسی سیاسی رہنمایا حکومت کے کسی وزیر یا.....“

”یہ خطرہ رقم ایک بلیک میل سے نجات دلانے کے عوض ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس شہر میں ایسے اجرتی قاتلوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو دس روپے کے لئے بھی قتل کریں۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”لیکن میں اس کی جان لینا نہیں چاہتا بلکہ اس کے قبضے میں میری جو غلاطی ہے میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اس کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا چاہتے ہو.....؟“ ٹائیگر نے کہا۔

”اس لئے دنیا میں عزت اور جان سے بڑھ کر

کے کسی ہیرو سے زیادہ چاقو و چو بند تھا۔ دولت اگلنے کی پیشتر کا نہیں اسے درے میں ملی تھیں۔ ان کی افزائش اس کی غیر معمولی ذہانت کے بل پر ہوئی تھی۔ قدرت نے جس حساب سے اسے نوازا تھا اس تناسب سے وہ خرچ بھی کرتا تھا۔ صرف اپنی ذات اور اپنے متعلقین پر ہی نہیں اس کی دولت کا ایک معقول حصہ سماجی خدمات پر بھی صرف ہوتا تھا۔ کئی چھوٹے بڑے اور پس ماندہ شہروں میں اس کے باپ کے نام پر اوقاف قائم تھے۔ ان کی آمدنی سے غریبوں اور ناداروں کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ طبی تحقیق، فنون، لطیفہ کے فروغ اور تعلیمی خدمات کے لئے ساجن لال کپور فاؤنڈیشن کے تحت بڑے بڑے فنڈ قائم کئے گئے تھے۔ تعلیمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی اس کے ارادے کوئی نہ کوئی نمائی پروگرام ایسا سر کرتی رہتی تھیں۔ تعمیری فلمیں بنانے فلم سازوں کو اگر نقصان ہوتا تو اس کی تلافی کے لئے بھی ساجن نے ایک الگ فنڈ قائم کر رکھا تھا۔ یوں اس کا بانی ووڈ کی مشہور ماند فلمی دنیا سے بھی رابطہ تھا۔ بھی کھارہ کوئی اچھا ناول اور کہانی پسند آنے پر اس پر فلم بنواتا تھا۔ اس کی دو ایک فلمیں ہٹ بھی ہوتی تھیں۔ لیکن فلمی دنیا کی تمام رنگینیوں اور بے پناہ آمدنی اس کی ذاتی توجہ نہ تھی۔

اس مثالی سماجی رتبے کے باوجود ٹائیگر جیسے سرانگ رسال سے اس کا رویہ نہایت مریانیہ اور دوستانہ تھا..... نہایت ذاتی..... اس تعلق میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ شفقت بھی شامل تھی۔

یہ کوئی تین برس پہلے کی بات تھی جب ٹائیگر ممبئی آیا تھا اور اس دفتر میں ساجن قدرے بہروپ بھر کر آیا تھا۔ ٹائیگر ان دنوں اس سے ذاتی طور پر ناواقف تھا۔ البتہ اس نے ساجن کا نام اور اس کی شخصیت کے بارے میں سنا تھا۔ کسی بھولے سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

”میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ بنگال ٹائیگر ہیں۔ میں آپ کی خدمات حاصل کرنے



کریں۔ لہذا وہ ایک ٹکٹ میں دوسرے کر رہے ہیں۔  
انہیں ہر ماہ ایک لاکھ روپے اور انہیں خوش کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ ان کی مجال نہیں کہ بلیک میلروں کی کوئی بات سے انکاری ہو جائیں۔۔۔۔۔

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔۔۔۔۔؟“  
ٹائیگر بولا۔ ”جو بدنامی اور رسوائی سے اس قدر دہشت زدہ ہیں۔“

”میرا نام ساجن لال کپور ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں ایک بزنس مین ہوں اور۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ ٹائیگر چونک کر بولا۔ ”اب میں جان گیا کہ آپ کو اپنی عزت اتنی کیوں پیاری ہے۔۔۔۔۔ ہر عزت دار کو اپنی عزت اپنی جان سے پیاری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایسا کرتے ہیں کہ کسی بڑے ہوٹل میں چل کر بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا جو بلیک میلر آپ کی عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔“

کسی بھی ہوٹل کے مقابلے میں آپ کا دفتر ہر لحاظ سے مناسب اور بہتر ہے۔ وہ کہنے لگا۔ ”اس لئے کہ وہاں میرا کوئی بھی شناسا، دولت اور بزنس مین آسکتا ہے جو مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر چونک جائے گا کہ وہاں میں کچھ کالا ہے۔ یہاں کسی کے آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ کوئی آئے گا تو آپ اس سے معذرت کر کے کوئی اور دن مقرر کر سکتے ہیں۔“

”جی جناب۔۔۔۔۔!“ ٹائیگر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تو آپ اپنی رام کہانی سنائیے۔“

”لیکن اس کا معاوضہ طے ہو جانا چاہئے تاکہ میں اپنے سر سے ایک بوجھ اتار دوں۔۔۔۔۔ معاوضہ پیشگی دوں گا۔“

”بالفرض میں ناکام ہو جاتا ہوں تو اس صورت میں آپ کا معاوضہ پانی ہو جائے گا۔“

”مجھے امید تو نہیں کہ آپ ناکام ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ پھر ہم سوچیں گے کہ کرنا کیا ہے۔“ ساجن نے کہا۔ ”میں آپ کو بچیں لاکھ روپے پیشگی دوں گا۔۔۔۔۔

کامیابی کی صورت میں مزید پندرہ لاکھ روپے۔۔۔۔۔“  
”اس کے علاوہ آپ کو ایک شہ کام کرنا ہوگا۔“  
ٹائیگر نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ کل چار مریض ہیں جن کے علاج معالجے اور اسپتال میں داخل کرانے کے لئے ایک بڑی رقم درکار ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک غریب ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کی شادی کے لئے جہیز کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آپ ان کے بارے میں پڑھیں۔ میں اتنی دیر میں چاہئے بنا کر لاتا ہوں۔ پھر چائے کے دوران آپ کی زبانی اور آپ کی کہانی سنوں گا۔“ پھر ٹائیگر باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

جس وقت ٹائیگر دو کپ چائے اور ٹکٹ لے کر آیا ساجن اس کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ تو آپ نے میرے ذمے بہت چھوٹا سا کام سونپا ہے۔۔۔۔۔ میرا ایک ادارہ ہے جو روز ہی ایسے کام انجام دیتا رہتا ہے۔ اس لڑکی کا جہیز اور شادی بیاہ کے دیگر اخراجات دو لاکھ کی رقم کل مچ پینچا دی جائے گی۔۔۔۔۔ ان چاروں مریضوں کو یہاں سے جانے کے بعد کسی اچھے سے اسپتال میں علاج شروع ہو جائے گا۔ جب تک وہ مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو جاتے وہ زیر علاج ہی رہیں گے۔“

پھر ساجن نے چائے کا ایک گھونٹ طاق سے اتارتے ہوئے اپنی کہانی سنائی شروع کی۔

مجھے کبھی عورت کی تمنا اور خواہش نہیں رہی اور میری کمزوری۔۔۔۔۔ البتہ عورت کی رفاقت میری ضرورت رہی۔ میری زندگی میں دو عورتیں آئیں۔ ہماری ازدواجی زندگی دو برس سے زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میری پہلی جتنی بڑی عورت تھی شادی سے پہلے اس کی دوستی اور تعلقات نہیں برس کے ایک لڑکے سے تھے۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ مجھے قتل کر دے۔ میں نے انہیں ایک دن ایک کمرے میں میرے خلاف منصوبہ بناتے سن اور دیکھ لیا۔ میں نے

پولیس کو فون کر کے بلایا۔ وہ دونوں ناقابل حالت میں تھے۔ میں نے پولیس کو ایک موٹی رقم دے کر کہا کہ وہ اس واقعے کی تہہ نہ کریں۔ پھر میں نے بیوی کو طلاق دے دی۔۔۔۔۔ دو برس بعد میں نے دوسری عورت سے شادی کی۔ وہ ماڈل گرل تھی مجھے ایک شریک حیات کی ضرورت تھی۔۔۔۔۔ دو برس کے بعد ہم دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ پھر تین برس کے بعد میری زندگی میں سروجا آ گئی۔ ہم دونوں کی ازدواجی زندگی اب تک تو کامیاب جا رہی ہے۔

میری گاڑی کا ڈرائیور سری کانت ایک مرتبہ مجھے ایک بھانے سے اپنے ہاں لے گیا۔ اس کی جوان سال بیوی اور چودہ برس کی لڑکی نے میرا سواگت کیا۔ ماں بیٹی نہایت حسین اور پرکشش تھیں۔ سری کانت نے دھوکے سے مجھے وہ مال منگھلایا جو کلوروفارم میں بیہوش ہوا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بڈروم میں تھا۔ میں کیسے اور کس وقت آیا مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو میری نظروں کے سامنے انتہائی شرمناک مناظر گھومنے لگے۔ ماں اور بیٹی کے ساتھ۔۔۔۔۔ پھر دوسرے دن مجھے ایک لفافہ ملا جس میں تین تصویریں بھی تھیں۔۔۔۔۔ دس عدد سری کانت کی بیوی کے ساتھ۔۔۔۔۔ دس عدد اس کی بیٹی کے ساتھ۔۔۔۔۔ ان تصویروں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں نے گمن پوائنٹ پر انہیں درندگی سے نشانہ بنایا ہے۔

پہلے تو ہر ماہ پچاس ہزار کی رقم چھ ماہ تک دیتا رہا۔۔۔۔۔ پھر ایک لاکھ۔۔۔۔۔ اب تین لاکھ۔۔۔۔۔ گزشتہ ماہ مجھ سے کہا گیا کہ میں سروجا کو طلاق دوںے کر اس کی بیٹی پورینا سے شادی کر لوں ورنہ یہ تصویریں تیرے ساتھ کے ہاتھوں دو کروڑ میں فروخت کر دی جائیں گی۔ تیج تاچہ نہ صرف میرا کاروباری حریف ہے بلکہ جانی دشمن بھی ہے۔ اس کے ہاتھ تصویریں لگنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نہ صرف سروجا سے محروم ہو جاؤں گا بلکہ بھکاری سے بھی بدتر بن جاؤں گا۔ میں کسی کو نہ نہ کھا سکوں گا۔“

اس کی کہانی سن کر ٹائیگر نے اسے دلاسا دیا۔

”آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ یہ تو میرے ہاتھ کا کھیل ہے۔۔۔۔۔ میں دو ایک دن میں تمام تصویریں ان کے ٹیکیکو زسیت آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

☆۔۔۔۔☆۔۔۔☆  
اس نے جو کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ وہ دوسرے دن سری کانت کے ہاں پہنچا۔ سری کانت پہلے جب وہ ملازمت کر رہا تھا تب داروت کے علاقے میں ایک بوسیدہ فلیٹ میں رہتا تھا۔ اب تین کمروں کے لکڑی فلیٹ میں کرائے پر بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس نے سری کانت سے کہا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں کہ ساجن لال کپور کس مہلک بیماری میں مبتلا ہے؟“  
”نہیں تو۔۔۔۔۔“ سری کانت نے سر ہلایا۔  
”وہ ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی صرف تین ماہ کی رہ گئی ہے۔“  
”کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ تینوں اس طرح اچھل پڑے جیسے کرنٹ لگا ہوا۔

سب سے زیادہ صدمہ سری کانت کی بیٹی پورینا کو ہوا۔ اس پر چھہ کوئی بجلی آ گری ہو۔ اس کے تمام سینے کر چپاں بن کر اس کے سینے میں چھہ گئے۔ ان تینوں کو سکتے کی ہی حالت میں دیکھ کر وہ کہنے لگا۔  
”آئندہ ہفتے وہ سروجا کو طلاق دے کر اس کے دوسرے دن آپ سے شادی کر لے گی من منانے لے جائے گا تاکہ وہ بیماری آپ کو منتقل کر دے۔ اس لئے کہ آپ نے اسے بلیک میل کر کے اس سے لاکھوں روپے اٹھنے ہیں۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہے۔“ پورینا نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔  
ٹائیگر نے بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک فائل نکال کر پورینا کے ہاتھ میں تھما دی۔

”آپ خود ہی دیکھ لیں۔۔۔۔۔ جے جے اسپتال کے ڈاکٹر سرجن فرینچن ڈاکٹر زیندر کا میڈیکل رپورٹ ہے۔ یہ خفیہ فائل ہے جو ایک نرس مالا سہا کو دس ہزار روپے رشوت دے کر تین دن کے لئے

حاصل کی ہے۔“

پورینا، ماضی میں اسی اسپتال میں نرس رہ چکی تھی اور اس کی ماں بھی۔۔۔۔۔ اس اسپتال سے انہیں اس لئے نکال دیا تھا کہ دونوں بدچلن اور بدکردار تھیں۔ ان کے کئی ڈاکٹرز سے تعلقات تھے۔ اسپتال کا ماحول خراب کر دیا گیا تھا۔ پورینا کی ماں نے بیٹی کے ہاتھ سے فائل لے کر دیکھی۔ پھر اس نے کہا۔

”ساجن کے تعلقات نہ صرف ماڈل گریز بلکہ ہیر وٹوں اور بازاری عورتوں سے بھی تھے۔ ظاہر ہے یہ مرض اسے لاحق ہونا تھا۔“

یہ بات کہتے کہتے اچانک اسے کچھ احساس ہوا۔ کیوں کہ وہ اور اس کی بیٹی بھی تو فحاشوں میں سے تھیں۔ اس لئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر موضوع بدلا۔

”آپ کون ہیں۔۔۔۔۔؟ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔۔۔۔۔؟“ پورینا کی ماں بولی۔ ”آپ کس لئے یہاں آئے ہیں؟“

”میں ایک انشورنس کمپنی کا سراغ رساں ہوں۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”مسٹر ساجن نے جو بیہ پالیسی لی ہوئی ہے وہ کروڑوں کی ہے۔ اس نے کمپنی کو دھوکا دیا ہوا ہے۔ اس لئے کمپنی چاہتی ہے کہ اس کے کروت اس پر ظاہر کرے اس کی بیہ پالیسی کو کنسل کر دے اور پھر یہ طبی رپورٹ۔۔۔۔۔“

”اس کے کروت۔۔۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔؟“ پورینا کی ماں کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”آپ کے پاس اس کی کچھ نامناسب تصویریں ہیں۔ انشورنس کمپنی اسے آئینہ دکھا کر اس کی پالیسی ختم کر دینا چاہتی ہے۔“

”لیکن انشورنس کمپنی کو اس کے اخلاق و کردار سے کیا تعلق۔۔۔۔۔؟ اس کی صرف طبی رپورٹ سے تعلق ہونا چاہئے۔“

”جب ہم اسے طبی رپورٹ دکھائیں گے تو وہ برا شور و شوعا کرے گا اس لئے کہ اس نے جب

انشورنس کرایا تھا تب اسے یہ مرض لاحق نہیں تھا لیکن جب اسے اس کی نامناسب تصویریں دکھائیں گے تو وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“ ٹائیگر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”لہذا آپ وہ تصویریں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔ میں ایک لاکھ کی رقم لایا ہوں۔“

”وہ تصویریں چار لاکھ میں۔۔۔۔۔؟“ پورینا کی ماں تمسخر سے بولی۔ ”آپ کو شاید علم نہیں کہ اس کے کاروباری حریف اور ملک کے دو صنعت کار اور اب پتی سچ ناتھ ان تصاویر کے دو کروڑ دینے کو تیار ہیں۔ اور پھر ساجن سر جو کو طلاق دے کر پورینا سے شادی کرنے پر آمادہ ہے۔“

”جب ڈاکٹروں نے مسٹر ساجن کو بتایا کہ ان کی زندگی صرف چار سے چھ ماہ کی ہے تو انہوں نے ایک حقیقت پسند آدمی کی طرح ایک وصیت نامہ تیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام دولت اور جائیداد فلائی اور خیراتی اداروں کے نام لکھ دی ہے۔ ایک ٹرسٹ بنایا ہے جو کاروبار چلائے گا اس کی آمدنی فلائی اور خیراتی اداروں کو ہر ماہ دی جائے گی۔۔۔۔۔ سر جو کا کو اس کی زندگی تک ہر ماہ دس ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ اس کی زندگی صرف ایک برس کی ہے۔ کیوں کہ ساجن کو جو مرض لاحق تھا وہ اسے بھی لگ چکا ہے۔ یہ مرض ہر اس عورت اور لڑکی کو تختے میں مل چکا ہے جس سے ان کے تعلقات رہے۔۔۔۔۔ آپ ماں بیٹی کو بھی یقیناً لاحق ہو چکا ہوگا۔ کیوں کہ ان سے ہر ماہ رقم وصول کرنے کے آپ اور بیٹی باری باری جاتی رہی ہیں۔ رات سے صبح تک وہ کر آتی رہتی ہیں۔ پہلی فرصت میں آپ دونوں اپنا اپنا چیک اپ کرائیں۔ یہ مرض بڑا چور ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا ہے اور پھر ایک دم عود آتا ہے۔ آپ کے پتی کو بھی یہ مرض ہو سکتا ہے۔ انہیں بھی چیک کرالینا ہوگا۔ کیوں کہ آپ سے انہیں منتقل ہو چکا ہوگا۔ اور

ہاں ایک اور ضروری، اہم اور خطرناک بات جو اس وصیت میں درج ہے۔۔۔۔۔ میرا ڈرائیور سری کانت جودس برس سے میرا فانی ڈرائیور رہا۔ میں نے ہمیشہ اس کا

خیال رکھا اور فوفا فوفا اس کی مالی مدد کرتا رہا۔۔۔۔۔ خلوص اور انسانی جذبے کے تحت۔۔۔۔۔ میں نے کبھی اس کی بیوی اور بیٹی کو نہیں دیکھا تھا۔

ایک روز یہ تنگ حرام اور ذلیل شخص مجھے ایک بھانے سے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں مجھے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کیا گیا۔ پھر انجشن سے میرا داغ معطل کر کے اس کمینہ نے میری تصویریں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بٹھا دیں۔ شاید ماں اور بہن بھی ہوتی ان کے ساتھ تھیں۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا ذلیل، بیچ اور بیچ آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ دولت کے پیچھے اندھا ہوتا ہے اور ساری اخلاقی قدریں پامال کر دیتا ہے۔ پھر وہ مجھے بلیک میل کرنے لگا۔ اس کی بیوی اور بیٹی باری باری ہر ماہ رقم وصول کرنے آتی رہیں۔ ماں اور بیٹی تنگ کے میٹھے سے وابستہ رہیں چوں کہ ماں بیٹی نے اسپتال کا ماحول آلودہ کر دیا تھا انہیں نکال دیا گیا۔ پھر انہوں نے میرے خلاف منصوبہ بنا کر شرمناک تصاویر بنا کر بلیک میل کرتی رہیں۔ اس بات کی خبر پولیس کو دے دینا۔۔۔۔۔ میرے پاس چوں کہ ان کے ٹیکو نہ نہیں ہیں۔ صرف تصویریں موجود ہیں وہ پولیس کو دے دیں۔“

ٹائیگر نے توقف کر کے اپنی تقریر کا رد عمل دیکھنے کے لئے ان کا چہرہ دیکھا۔۔۔۔۔ ان پر جیسے کوئی بجلی کی آن گری تھی۔ ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا اور ان کے چہرے بے لہو ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ٹائیگر نے کہا۔ ”آپ لوگوں نے کیا سوچا۔۔۔۔۔؟ کیا فیصلہ کیا۔۔۔۔۔؟ کیا میرے ہاتھ تصویریں اور ٹیکو زبردستی کر رہے ہیں؟“

پورینا کی ماں مسروٹی بڑی تیز اور گھاگ عورت تھی۔ گھٹ گھٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتی تھی۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”سچ ناتھ دو کروڑ کی رقم دے رہا ہے اور تم ایک لاکھ۔۔۔۔۔؟ ہمیں بلیک میل کرنے آئے ہو۔ کیا تم ہمیں بے وقوف اور احمق سمجھتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”اب تو سچ ناتھ دو کروڑ کیا دو روپے بھی نہیں دے گا۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ اب بساط الٹ چکی ہے۔“

”اس لئے کہ ساجن کی میڈیکل رپورٹ اور وصیت نامہ۔۔۔۔۔ دیکھ کر۔۔۔۔۔ ٹائیگر نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر ان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ ”یہ وصیت نامہ ہے۔“

”ان تصویروں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ مسروٹی غرائی۔ ”تم ہمارا بال تک بچا نہیں کر سکتے۔“

”کیا تم نے ان تصویروں کا ایک سیٹ ساجن کو نہیں دیا تھا۔۔۔۔۔؟“ ٹائیگر نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ”یہ بتانے کے لئے کہ تمہاری عزت، دولت اور شہرت ہماری ٹمٹی میں ہے۔ انہیں دیکھ کر کوئی فیصلہ کرو۔ ہر ماہ کتنی رقم دو گے۔ میں اور پورینا ہر ماہ تم سے رقم لینے باری باری آتی رہیں گی۔“

”ہاں دیا تھا۔۔۔۔۔ پورینا نے درمیان میں اعتراف کیا۔ ”میں نے خود لے جا کر تصویریں دی تھیں۔“

ٹائیگر کے علم میں ساجن نے یہ بات لائی تھی کہ اس نے ان تصویروں کو نذر آتش کر دیا تھا کہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائیں لیکن اس نے یہ بات ماں بیٹی کو نہیں بتائی تھی۔ ٹائیگر نے جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔

”دیکھو۔۔۔۔۔ ہٹ دھرمی اور ضد نہ کرو۔ میں جو ایک لاکھ کی رقم پیش کر رہا ہوں اسے بھاگتے بھگتے لنگوٹی سمجھ کر قبول کرلو۔ ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا۔۔۔۔۔؟“ سری کانت جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا اس نے بھنا کر زبان کھولی۔

”میں وہ تصویریں لے کر سیدھا پولیس کے پاس جاؤں گا۔ پولیس والوں کو کہوں گا کہ ایک لاکھ روپے دے کر ان خبیثوں کو لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔ مسٹر ساجن کی موت تک یہ بات منظر عام پر نہ آنے دو۔ یہ تصویریں اور ٹیکو زان کے باپ بھی دے دیں گے۔ صرف ان ماں بیٹی کے چہروں اور

بھی ایک ملک میں زلزلے سے دوڑا ہوا ہے۔



تکوار۔۔۔ اور پھر بلک مٹکر خواہش ہوگی کہ تم کھ پتلی بن جاؤ۔۔۔ اس لئے کہ تم نہایت حسین و جمیل ہو بلکہ کشش کا خزانہ ہو۔۔۔ ایسا مشکل ہے کہ تم آج سے محفوظ رہو۔“

”آج کل۔۔۔ ایک ہوا چلی ہوئی ہے۔۔۔ اغوا، تادان، تصویروں کی مدد سے بلیک میلنگ۔۔۔ کیوں کہ دولت ہی دولت ہے۔۔۔ پھر اس میں نہ محنت ہے اور نہ گھائے کا سودا۔۔۔ پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں۔“ سرد جانے کہا۔ ”وہ بھی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی ہے۔۔۔ میں اذیت اور جتنی انتشار کا شکار ہوں۔۔۔ میں آخری سانس تک کھلونا بننا نہیں چاہتی۔۔۔ میں راتوں کو اکثر سوچتی ہوں کہ کاش۔۔۔! میں اتنی حسین نہ ہوتی اور ساجن کی چٹی نہ ہوتی۔۔۔ اس عذاب سے دوچار نہ ہوتی۔“

”ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بلیک میل ساری زندگی بھٹی گنگا میں ہاتھ دھوتا رہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”اس کے وارے بنارے ہوتے ہیں۔ جرم بہر حال جرم ہوتا ہے۔۔۔ سب کے کی ماں کب تک خیر مانی ہے۔“

”کیا میں تم سے امید رکھوں کہ تم میرا کس حل کرو گے۔۔۔ اور ساجن کو اس کی ہوا لگنے نہیں دو گے۔۔۔؟“ اس نے امید بھری نظروں سے ٹائیگر کو دیکھا۔ ”تم مجھے پاپس نہیں کرو گے۔۔۔؟“

”میرے کاروبار میں راز داری پہلی شرط ہوتی ہے۔“ ٹائیگر نے اسے دلاسا دیا۔ ”تم جانتی ہو میری فیس کیا ہے۔۔۔؟“ اس نے توقف کر کے کہا۔ ”میرے کاروباری لہجے کا معاف کرنا۔۔۔ کیوں کہ اس وقت میں تمہارے بچے کا دوست بن کر نہیں۔۔۔ بلکہ سراغ رساں دیوکار بن کر بات کر رہا ہوں۔۔۔ اس لئے بھی کہ تم میری خدمات حاصل کرنے لگی ہو۔“

”میں تمہاری منہ مانی فیس ادا کرنے کو تیار ہو۔“ سرد جانے کہا۔ ”تم فیس کی پروا مت کرو۔ کتنی رقم۔؟ میرے پاس تو لاکھوں کا بلیک میلنس ہے۔ میں پوری فیس پیشگی بھی دے سکتی ہوں۔“

”تمہاری پوری کہانی سننے کے بعد اپنی فیس بتاؤں گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”فیس کس کی نوعیت پر ہوتی ہے۔۔۔ اس لئے کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔؟ گھمبیر ہے۔ خطرناک ہے یا پیچیدہ اور ناممکن سا ہے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میری مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“ سرد جانے بنجیدہ ہو کر کہا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔۔۔؟“ ٹائیگر انجان سا بن گیا۔

”مجھے تم پر ہر طرح کا ایسا ہے کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو اس لئے میں تمہاری خدمات حاصل کرنے آئی ہوں۔“ وہ بولی۔

”میں بہرہ پر بدل کر دو بڑے پرائیویٹ سراغ رساؤں کے پاس گئی تھی جو ماضی میں انجیلز اور ڈی ایس بی تھے۔ رہناڑ ہونے کے بعد انہوں نے یہ پیشہ اپنالیا۔ جن کی پورے شہر میں بڑی دھوم ہے۔ گویا طوفانی بول رہا ہے۔ معمولی سے معمولی کس کے وہ ایک لاکھ روپے سے کم فیس نہیں لیتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک فرضی کہانی سنائی۔ بہرہ پر بھرنے کے باوجود انہیں میرے حسن کا اندازہ ہو گیا۔ لیکن میری شناخت نہ ہو سکی۔ انہوں نے کہا کہ فیس تین لاکھ ہوگی جو مجھے ادا کرنی ہوگی۔ یعنی پیشگی۔۔۔ پوری فیس ادا کرنا ہوگی۔“

جب آپ کو مطلوبہ تصویر مل جائیں گی اس وقت تک دو ایک دن میں وقت مقررہ پر تین گھنٹے کے لئے آ کر خوش کرتے رہنا ہوگا۔ گویا آسمان سے گرا سمجھور میں اٹکا۔۔۔ میں نے کہا یہ بات کیا ہوئی۔ آپ مجھے خلافت کے دلدل سے نکالنے کے بجائے پھر چستی میں گرانا چاہتے ہیں۔۔۔ وہ بولے۔۔۔ شہریت جب آپ اسے خوش کر چکی ہیں جس کی وجہ سے بلیک میل ہو رہی ہیں اور پھر بلیک میلر بھی فائدہ اٹھا رہا ہے تو پھر ہم نے کیا قصور کیا۔۔۔؟ آخر ہمارا بھی ادھر کا رہنا ہے۔“

”میں ان دونوں کو جانتا ہوں جو اس مقدس پیشے پر بدعنوانی رہے ہوئے ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں ادھر سے فرصت پالوں یا اس دوران موقع ملا تو ان دونوں کو بلیک میل کروں گا۔ وہ ایک ایسی شادی شدہ لڑکی کو ہراساں کر رہے ہیں اور اس سے دل بہلا رہے ہیں اور دونوں کی ماں کو بھی۔۔۔ وہ دونوں ایک نمبری شیطان ہیں۔“

”بھگوان تمہاری رکشہ کرے۔۔۔ اچھا اب تم میری کہانی سنو۔“ سرد جانے لگی۔ ”میرے والدین جب مجھے بنگلور سے لے کر گئے اس وقت میری عمر دو برس کی تھی۔ جب واپس آئے تو میں بارہ برس کی عمر کی ہو چکی تھی۔ بنگلور میں چھ برس رہنے کے بعد کاروبار کے لئے ممبئی شہر مستقل رہائش پذیر ہو گئے۔ جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو میرے حسن نے دھوم مچادی۔ میری ہم جماعت لڑکیاں اور لڑکے بھی مشورے دینے لگے کہ میں کیوں نہیں فلمی دنیا میں چلی جاتی۔ دولت، عزت اور شہرت بھی ہے۔ اس وقت تمہاری جیسی حسین اور پرکشش لڑکی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ تم تمام ستاروں کو ماند کر کے رکھ دو گی۔“

مجھے گریجویشن کرنے میں ڈیڑھ برس کا عرصہ گیا تھا۔ مجھے بھی بواشوٹ بلکہ جنون تھا کہ فلمی دنیا میں جا کر کروڑوں شائقین کے دلوں پر راج کروں۔ لیکن میرے والدین نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں جب تک گریجویشن نہیں کر لیتا اس وقت شہر میں جانا نہ تو سوچوں گی اور نہ ہی خواب دیکھوں گی۔

میری ہم جماعت شلا مشہور فلم ساز و ہدایت کار راج پال کی بیٹی تھی۔ جب اس نے ایک روز اپنے ہاں لے جا کر اپنے چاچے سے ملایا تو وہ مجھے دیکھ کر جیسے پھڑک اٹھے۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے اپنی ایک نئی فلم میں ہیروئن بننے کی پیشکش کر دی۔ میں نے معذرت کر لی اور ان کی پیشکش مسترد کرنے کی وجہ بتادی۔ پھر انہوں نے میرے چاچا کی اور میری سے رابطہ کیا تا کہ ان کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ چاچا نے صاف انکار کر دیا۔

عالمی مقابلہ حسین منعقد ہونے والا تھا۔

ہندوستان سے چار لڑکیاں اس مقابلے میں شرکت کرنے جا رہی تھیں۔ مجھے سے بھی کہا گیا۔ لیکن میرے گھر والوں نے صاف منع کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی قیمت پر اس مقابلے میں شرکت کی اجازت نہیں دیں گے۔ میری ایک ہم جماعت لڑکی نے بھی جو نہایت حسین اور بے پناہ سیکسی تھی اس مقابلے میں شرکت کرنے گئی۔ دو ماہ کے بعد آئی۔ وہ عالمی حسینہ منتخب کر لی گئی تھی۔ دولت، عزت اور شہرت اسے نصیب ہوئی تھی۔ ہندوستان میں بھی اسے بڑی شہرت ملی تھی۔ اس کی سواگت کی گئی۔ وہ میری ہم زاد سہیلی تھی۔ اسے کئی فلموں کی پیشکش بھی ہوئی۔ میں نے اسے اپنے ہاں مدعو کیا۔ میں اسے اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ اسے عزت، شہرت اور دولت کی مبارک باد دی تو وہ بولی دولت اور شہرت۔۔۔ عزت نہیں۔۔۔ میں نے حیرت سے کہا کیا یہ عزت نہیں ہے جو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ عزت نہیں۔۔۔ اسے عزت مت کہو۔ مقابلہ حسن میں مجھے اپنی عزت جیوری کے ہاتھوں دان کرنی پڑی۔ پھر مجھے ملکہ حسن کا تاج پہنا دیا گیا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔۔۔ مجھے بھی یہاں فلموں میں ہیروئن کی پیشکش کی گئی۔ لیکن اس کے لئے شرط یہی تھی کہ عزت کھونا پڑے گی۔ فلم ساز، ہدایت کار اور کیرہرہ بین اور بھی دو ایک لوگوں کو خوش کرنا ہوگا۔ یہ میری ایک دوست ساجنا نے بتایا جو آج جگ مگنا ہوا ستارہ ہے۔ کوئی بھی ایسی ستارہ نہیں ہے جس نے یہ شرط پوری نہ کی ہو۔۔۔ وہ کسی بھی اداکار کی بیٹی، بہن اور بیوی کیوں نہ رہی ہو اور ہے۔ اس شرط کے بغیر وہ فلمی دنیا میں نہیں آ سکتی۔

ہاں تو میں کیا کہنا چاہتی تھی میں کیا قصہ لے بیٹھی۔ میں فلمی تقریبات میں شرکت کرنے لگی۔ ایک نام ور، انتہائی وجہ اور خوب صورت بہرہ و جن کو دل دے بیٹھی۔ اس کے پرستاروں میں لڑکیاں بہت



# قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ساتی مجھے نہ جام نہ پیانہ چاہئے  
تیری نگاہ مست کا نذرانہ چاہئے  
مرہم عداوتوں کا یہاں لگ چکا بہت  
اے دُغم بے حس تجھے بھر جانا چاہئے  
(شرف الدین جیلانی.....نژاد الیاز)

چاک قبا پہ میری نظر تھی کہ یار نے  
جلدی سے رکھ دیئے مری آنکھوں پہ آکے ہاتھ  
ساتی نے کتنے پیار سے دیکھا فراز جب  
ماگی شراب میں نے پیالہ بنا کے ہاتھ  
(انتخاب: جاوید.....کراچی)

دل کے گلشن سے محبت کے کنول لایا ہوں  
اپنے دل کے کسی کونے میں گھورا کرو  
(انتخاب: نصیر ملک.....کراچی)

میرا تیرے پھول کھلاتی تھی جو دل میں  
اب شام وہی درد سے خالی نہیں جاتی  
ہم جان سے جا سیں گے تمہی بات بنے گی  
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی  
(انتخاب: عاشر ارم.....پشاور)

تمہیں یاد کئے بغیر نہیں گزرتا کوئی دن بھی ہمارا  
جس دن تمہیں نہ سچوں وہ دن جانے کیسے گزرے ہمارا  
تمہاری یاد کے سہارے ہی زندگی ہے اب یہ دل ہمارا ایس  
آ جاؤ کہ تم کہ تم بہت اداس ہے اب یہ دل ہمارا  
(محمد شائق ساغر.....جنگی برہان)

عشق کی منزلیں دشوار کیوں ہیں  
چار سون پھیلی ہوئی دیوار کیوں ہے  
جس کو کبھی میری یاد تک نہیں آئی  
مجھ کو اس کا ہی انتظار کیوں ہے  
(انتخاب: شگفتہ کنول.....لاہور)

عجب اب کے بہار گزری ہے  
تیرے بغیر بیقرار گزری ہے  
تیرے بعد تو میرے اے میر  
ساری خوشیاں سو گوار گزری ہے  
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

تمہارے آنے کی اک آہٹ سی ہوتی ہے  
نہ جانے کیوں دل میں پھلنے سی ہوتی ہے  
تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے احسان  
تمہاری آنکھوں میں اکثر ایک شرارت سی ہوتی ہے  
(احسان سحر.....میانوالی)

کہا اس نے محبت کو شریک غم بنا مجھ کو  
میں کروں گا زمانے کی خوشی سے آشنا تم کو  
(بلقیس خان.....پشاور)

یہ پیار محبت کھیل نہیں یہ اک دوجے کا میل نہیں  
یہ پائیزہ رشتہ ایسا جس نے کھیلنا وہ کھیل نہیں  
یہ پیار محبت بندھن ہے یہ رشتوں کا اک سنگم ہے  
جو پیار کرے گا سچا، وہ پاس ہوا ہے فیل نہیں  
(عثمان غنی.....پشاور)

دل جو لوہا تو دل کے کونوں سے  
تیری میری نشانیوں نکلیں  
تو گیا تو میرے یاروں میں  
کیسی کیسی کہانیاں نکلیں  
(انتخاب: دلہا باسط مظہر.....حامد تھکلی گوجرانہ)

خواہشوں کی ساری طلب بس تم پر ختم ہے  
میری زندگی میں مسکراتی خوشی تم سے ہے  
تم بن کر سمت اندھیرا ہر سو اداسی ہے  
میری تو آنکھوں میں چلتی رہتی تم سے ہے  
(انتخاب: احمد حسین.....نژاد الیاز)

ہم سے اک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی  
وہ تو ہم جان کے کھالیتے ہیں ماتیں اکثر  
ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ  
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں باتیں اکثر  
(انتخاب: شہریار علی.....حیدر آباد)

☆ ☆



جب تک میرے اندر کوئی پادل نہیں ہوتا  
بہ میرا بارش سے جل ٹھل نہیں ہوتا  
برسوں سے اٹھا رکھا ہے انا کا پرچم  
لیکن میرا بازو کبھی ٹھل نہیں ہوتا  
بنا ہے تجربات کی آگ میں شاعر  
ایسے تو وہ شاعر صاحب غزل نہیں ہوتا  
ہر شخص یہاں سود و زیاں سے ہے واقف  
نہ دور کا مجنوں بھی پاگل نہیں ہوتا  
وقت کے مسائل تو حل ہوتے ہیں فوراً  
مسئلہ حقیقی محبت کا ہے حل نہیں ہوتا  
وقت کے شب و روز مجھے ہوش نہیں رکھتے  
وقت میں بھی دل میرا بے کل نہیں ہوتا  
اس کو بھی بچھڑ کر میرا رنج ہوا واحد  
یوں تو پہلے میرا عشق نہیں ہوتا  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گینگوی.....کراچی)

قوس قزح کے بدلے غم سے سمجھوتہ کروں کیسے  
لوگوں پہ چھا گئے مگر دل پہ اختیار نہیں  
غزل نصیب ہیں لوگ رتے ہیں جو پھولوں میں  
نہوں میں سکتے رتے ہیں دل کو قرار نہیں  
پہاڑی ہے اداسی کی لہر پہنٹے مسکراتے چہروں پہ  
کون کسی کو پرکے گا دل میں مگر پیار نہیں  
روز جیتے دیکھتے ہیں ہم پھول اپنے آگن میں  
کسی کے آنے کی امید کسی مگر اب انتظار نہیں  
رگ خود کو ردگ لگا لیتے ہیں جاوید  
خوشیاں تھیں یہاں بھی اب وہاں بہار نہیں  
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

کس قدر آگ برقی ہے یہاں  
عشق شبنم سے ترش ترش ہے یہاں

صرف اندیشہ انہی ہی نہیں  
پھول کی شاخ بھی ڈنٹی ہے یہاں  
رخ کدھر موڑ گیا ہے دریا  
اب وہ لوگ نہ وہ بہتی ہے یہاں  
رند درگور ہوئے اہل نظر  
کس قدر مردہ برقی ہے یہاں  
زیست وہ جنس گراں ہے کہ ناصح  
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں  
(انتخاب: نوشین خان.....کوٹ مظفر علی)

ذہب تو جانا ہے حسرت سے کنارہ دیکھ لوں  
اپنے گھر سے نکل کر اب شہر سارا دیکھ لوں  
موت کو کبھی ٹھہر جا منزل بڑی نزدیک ہے  
جس کی خاطر تو ملی اس کو دوبارہ دیکھ لوں  
سچ تو یہ ہے کون رکھے پاس عمر بھر ہم کو  
چند دن کا ہی اس بے وفا کا سہارا دیکھ لوں  
پیار کیسا کھیل ہے دیکھو تو اس کو کھیل کر  
کس قدر ہوتا ہے بازی میں خسارہ دیکھ لوں  
اور بھی لوگ تھے طلعت بھرے بازار میں  
کس نے مجھ کو پیار سے پکارا دیکھ لوں  
(شرف الدین جیلانی.....نژاد الیاز)

مرتی ہوئی زمین کو پہچانا پڑا مجھے  
پادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے  
یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فردخت بھی  
اس گھر کی دیکھ بھال کو جانا پڑا مجھے  
نئی رہتی تھی چٹکوں پہ ہمیشہ  
اس فنی کو صحرا تلک لانا پڑا مجھے  
(انوری رمضان.....پنڈ وادخان)

برسوں کی چاہت کو ہل بھر میں بدلتے دیکھا ہے  
ہر دم چاہنے والوں کو چاہت سے مسکراتے دیکھا ہے  
وہ جو ہمیشہ اپنے پیار پر فخر کی باتیں کرتے تھے  
ان کو ہم نے سچ بازار میں آنکھیں بدلتے دیکھا ہے



ہم نادان تھے پہنے سجائے تھے پیار کے  
پھر ان سینوں کو روز بکھرتے دیکھا ہے  
کہتے تھے جو ہر رستے پر تیرا ساتھ نبھائیں گے  
ان کو ہم نے بن بتلائے راہ بدلتے دیکھا ہے  
جنہوں نے قسمیں کھائی تھیں دل توڑنے کی  
ان کو ہم نے پل بھر میں قسمیں توڑتے دیکھا ہے  
(محمد امین تولی..... اسلام آباد)

کبھی دل نہ ان کا ٹوٹے، کبھی چوٹ نہ وہ کھائیں  
ان کو وفا کے یارب اتنا قریب کر دے  
ان کے لبوں پہ یارب سدا ہوا مسکرائیں  
قسمت میں ہر پل بننا ان کا نصیب کر دے  
چل کر جہاں بھی جائیں پھولوں کے رستے ہوں  
منزل ہر خوشی کی ان کے قریب کر دے  
(انتخاب: صدف حسین..... کراچی)

آسمانوں پر کوئی بشارت نہیں اور زمین منگ ہے  
دقت اک بیوہ ماں کی طرح سوگ میں مبتلا اور  
سسکیاں لے کے چلی ہے کالی ہوا  
خواہشوں کے کنول دردی پھیلے سر اٹھاتے نہیں  
خواب تک بند آنکھوں میں آتے نہیں  
ساری بچی کتابوں میں یہ درج ہے  
ایسے حالات میں  
آسمانوں سے نیکی یا تباہی زمین کی طرح  
بھیجے جاتے رہے ہیں  
مگر ان کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے  
نبی اب نہیں آئیں گے!!

اے میرے ہدم لوٹ کے آ جا  
تجھ کو پکارے میرا یہ من لوٹ کے آ جا  
جانے کہاں تم کھو گئے ہو  
دل ہے دیران میرا لوٹ کے آ جا  
پیار کی قسمیں کیا تم بھول گئے ہو  
قسمیں نبھانے لوٹ کے آ جا  
تم کہاں گئے خوشیاں روٹھ گئیں  
اب مجھ کو منانے لوٹ کے آ جا  
تیرے آنے سے پہلے دم ٹوٹ نہ جائے  
سانوں کو ہے تیرا انتظار لوٹ کے آ جا  
(زاہدہ عطا محمد..... کراچی)

چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا کب کا  
تمہارے چاہنے والا تو مر گیا کب کا  
نہ میری روح میری ہے نہ میرا جسم میرا  
ترا وجود تو مجھ میں اتر گیا کب کا  
وہ ایک شخص جو سب کو سنبھالے رکھتا تھا  
جہیں خبر ہی نہیں ہے بکھر گیا کب کا  
تو جس کے وعدوں کو دل سے لگائے بیٹھا ہے  
وہ اپنی بات سے پیارے مگر گیا کب کا  
وہی میں عشق میں رد بھی چکا ہوں مر بھی چکا ہوں  
حدود جسم سے میں تو گزر گیا کب کا  
(راجہ باسط مظہر..... گوجرانہ گاؤں حامد چھکھی)

یہ زرد چوں کی بارش میرا زوال نہیں  
میرے بدن پہ کسی دوسرے کی شال نہیں  
اداس ہو گئی اک فاختہ چپکتی ہوئی  
کسی نے قتل کیا ہے یہ انتقال نہیں  
تمام عمر غریبی میں بادقار رہے  
ہمارے عہد میں ایسی کوئی مثال نہیں  
میں آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہوں  
کہاں ملی تھی یہ دنیا مجھے خیال نہیں  
کوئی خوشی ہو میں اپنی حدوں میں ہوں  
میرا ملال بھی حد سے سوا ملال نہیں  
(سنبل مایین..... سرگودھا)

سارے جہاں کی خوشیاں ان کا نصیب کر دے  
ہٹے رہیں خدا وہ انہیں خوش نصیب کر دے

تحقیق کی راہوں میں ہوتے نہیں فسانے  
تحقیق تیری تھی اب گزرے وہ زمانے  
(سمنگ..... کراچی)

ہشی کے دن ہمارے اب بن گئے انسانے  
جو دل ہی نہیں واقف تھا غم کی جلن سے  
آج آئے تم ہو کیوں میرے دل کو چلانے  
جی آنکھوں میں خوشیاں جھی ہوئی تھیں  
اب آئے ہو اسی پلکوں کو بھگانے  
جس کو ہر دعا میں مانگتی تھی بخشش  
اس نے کسی اور کے نام کے بجائے شادیانے  
(انتخاب: بلقیس خان..... پشاور)

بریں آنکھوں میں بہت خواب ہے  
چپ ہے نا کہ بہت سراب ہے  
تھیں ہیں الگ یہ چائیں ہیں الگ  
مگر باوجود یہ کیسے نفرتوں کے عذاب ہے  
یہ کیسی مدہوشی سی چھا رہی ہے مجھ پر  
یہ کیسے میرے نصیب کے سوکھے گلاب ہے  
اس کی دیدار کی خاطر ہیں اس کی گلی جاؤں  
میں اس کو دیکھوں، لیکن اس کے چہرے پہ نقاب ہے  
اک دن میں بھی کروں گا اس سے ساری پیار کی باتیں  
میرے دل میں تو صرف اس کا حساب ہے  
آج وہ دل گئے سر راہ، مجھ سے منہ پھیر کے بولے  
یہ پاگل دیوانہ کس کے لئے اتنا بے تاب ہے  
(عثمان غنی..... پشاور)

تص کرتی ہوئی سوچ کی لہر میں  
آج پھر رات کے آخری پہر میں  
باد آیا مجھ کو میرا ماضی  
میرا ماضی اک جس میں سکھن سر ملے  
حسرت دیاس کے ان گت سلسلے  
غم ابھرتے گئے  
لہجے سے کاجیون میں جیتا رہا  
نہر پتار رہا

نما ہے سکتے ماضی سے  
جان چھڑا نہ سکا  
(زین جاوید..... پشاور)

چلو کچھ دیر بہتے ہیں  
محبت پر عیادت پر بے بنیاد باتیں ہیں  
سبھی رشتے سبھی ناتے  
ضرورت کی ہیں ایذا دین  
کہیں کوئی نہیں مرناسکی کے واسطے جاناں  
کہ سب ہے پھیر لفظوں کا، ہے سارا ٹھیک حرفوں کا  
نہ ہے محبوب کوئی بھی جھٹلے سے کہتے ہیں  
چلو کچھ دیر بہتے ہیں

ای کو یا د کرتے ہیں، جسے ہم زیت کہتے ہیں  
کہ لیا سانس بن جس کے ہمیں اک جرم لگتا تھا  
کہ رنگ جس کے ہر اک لہو خوش و خرم گزرتا تھا  
جسے ہم زندگی کہتے جسے ہم شاعری کہتے  
غزل کا قافیہ تھا جو، تھا جو جوان نظموں کا  
وہ لہجہ جب بدلتا تھا، قیامت خیز لگتا تھا  
دقت سے آگے چلتا تھا، بلا کا تیز لگتا تھا  
جو سایہ بن کے رہتا تھا جد اب اس کے راستے ہیں  
چلو کچھ دیر دوتے ہیں  
چلو کچھ دیر بہتے ہیں

(احسان سحر..... میانوالی)

میں حال دل کا بنا رہا ہوں  
یوں عمر اپنی گھٹا رہا ہوں  
دیئے جو تو نے تھے دکھ مسلسل  
وہ غم میں سب سے چھپا رہا ہوں  
اشک اندر ابل رہے ہیں اے منیر  
مگر میں سب کو ہنسا رہا ہوں  
دقت نے بھر دیئے جو دغم دل کے  
میں پھر سے ان کو دکھا رہا ہوں  
جو چار سوں تھیں دل میں میرے  
وہ دیوار دل کی گرا رہا ہوں  
پھر کہاں تک ستم میں نے جھیلے  
میں کہاں تک بادشاہ رہا ہوں  
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے کیسے دل یہ میرا  
پھینک کے پتھر یہ شیشہ دکھا رہا ہوں  
سائبر بعد تیرے، کئی یہ زیت کیسے؟

میں زندگی سے بھی خفا رہا ہوں  
منیر یہ اشک تیری رفاقتیں تھیں  
لو میں آج تجھ کو لٹا رہا ہوں  
(منیر احمد ساغر..... میاں چنوں)

اک روز جیتی جاگتی الفت طے نہیں  
قمر مسکراؤ نصیبی کا بھڑکا  
مرمر کر زندہ رہنے کی عادت طے نہیں  
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... مکان)

لکھی ہے یہ غزل صرف تیرے لئے  
ہم بنے بھی تو صرف تیرے لئے  
کسی کو نہیں دیکھیں گی اب یہ آنکھیں  
نظریں ترسیں گی بھی تو ایسے صرف تیرے لئے  
ہر سانس نکلے گی بھی تو صرف تیرے لئے  
ہر پیار سے پیاری لگتی ہو تم مجھے  
میں نے پیار سیکھا بھی تو صرف تیرے لئے  
(محمد شائق ساغر..... چنگی برہان)

ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے  
فاصلہ قربتوں کا بڑھنے لگتا ہے  
دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے  
پریشانی کے عالم میں دم گھٹنے لگتا ہے  
پرانی یادوں کے افسانے بن جاتے ہیں  
آنکھوں میں ہٹا نقش بھی مٹنے لگتا ہے  
کچھ بھی باقی نہیں رہتا یادوں کے سا  
جب سانس کا رشتہ جسم سے کٹنے لگتا ہے  
ہر انسان کے ساتھ یہی مسئلہ ہے  
کہ وہ انا کی چکی میں پسے لگتا ہے  
وقت خود ہی دغی دل پر مزہم لگا دیتا ہے  
آہستہ آہستہ زخمِ جدائی بھرنے لگتا ہے  
خود ہی اپنے پیدا کردہ مسائل میں ڈاکر  
ایک دن انسان گھٹ گھٹ کر مرنے لگتا ہے  
(محمد ذاکر ہلال..... آزاد شیر)

رد واد محبت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے  
دو دن کی مسرت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے  
کچھ حال کے اندھے ساگھی تھے، کچھ ماضی کے عیار بن گئے  
احباب کی چاہت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے  
کانٹوں سے بھرا ہے دامن دل، شبنم سے سلتی ہیں پلکیں  
پھولوں کی خدادت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے  
اب وقت کے نازک ہونٹوں پر، مجرد حزن و غم تھا  
بیداو مشیت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے  
اب اپنی حقیقت بھی ساغر بے ربط کہانی لگتی ہے  
دنیا کی حقیقت کیا کہیے، کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے  
(انتخاب: نجم عثمان علی..... میاں چنوں)

ہوا نہیں تو یہ ممکن ہونے لگ جائے  
ہوا چراغ کا دکھ سن کر رونے لگ جائے  
زمین کا ہاتھ پکڑنے کی اندھی خواہش میں  
فلک سرکتا سرکتا نہ کونے لگ جائے  
ہم ایسے لوگ سفر پر نکل بھی آئے اگر  
تو سنگ میل مسافت کو رونے لگ جائے  
یہ کیسا گھر ورثے میں مل گیا مجھے  
کہ در جگہوں تو دیوار سونے لگ جائے  
(عبدالحسین نوری..... چنڈاؤ ڈھان)

مولا! یہ تیری خاص عنایت طے نہیں  
غم کی سیاہ رات سے فرصت طے نہیں  
ہم تو تیرے وصال کو گنتے تھے ہر گھڑی  
کس نے کہا تھا تجھ سے کہ فرقت طے نہیں  
قاصد کو روتا دیکھ کر دل نے یہی کہا  
اک روز راستے میں قیامت طے نہیں  
قلب و جگر کے جب وہ سیما ہی ہو گئے  
زخموں کو سپہ کر چنے کی عادت طے نہیں  
نہی نفرت عداوتیں کرنی نہ ہے بلکوں کی  
نہی نفرت عداوتیں کرنی نہ ہے بلکوں کی

لکھوں نعت نئی میں، اتنا مجھ میں کمال کہاں  
نہ کرے جس دم ورد آپ کا، دل کو یہ حال کہاں  
نہ کرے جس دم ورد آپ کا، دل کو یہ حال کہاں  
نہ کرے جس دم ورد آپ کا، دل کو یہ حال کہاں

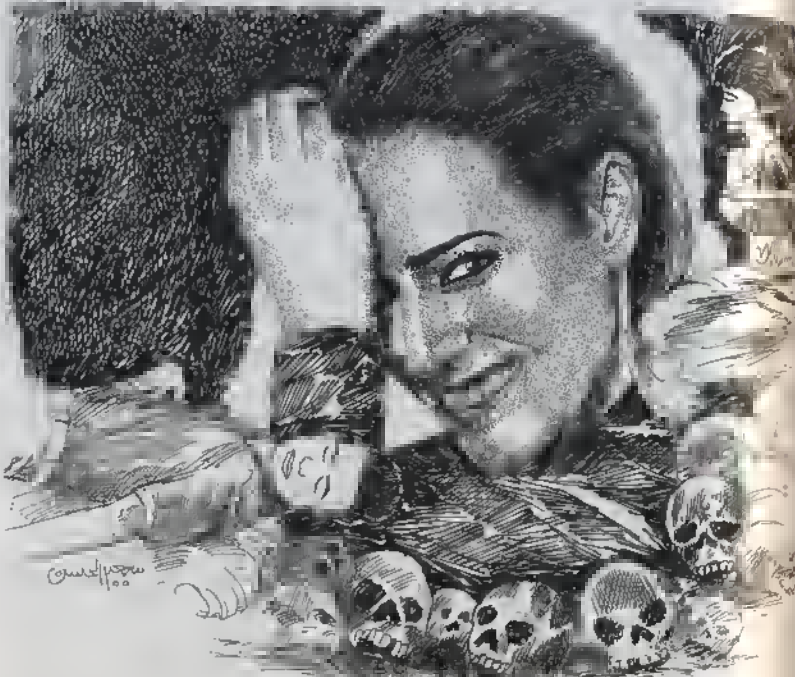
یہ بھی سچ، میرے نئی سا آئیں جہاں کہاں  
شیدائے مصطفیٰ ہوں، گدائے بھینسی ہوں  
اسی پہ ناز ہے مجھے اور میرا کوئی کمال کہاں  
کروں دیدار آپ کا، حاصل ہو یہ سعادت مجھ کو  
پر سوچوں تو میں کہاں اور میرا سوال کہاں  
(افضل رباب..... کراچی)

اکیلے پن میں بھی حیات گزر جاتی ہے  
لماقات وہی بار بار یاد آتی ہے  
اس کی باتوں کو جب بھی سوچتا ہوں میں  
ہونٹوں پر مسکان سی آکر گزر جاتی ہے  
ہائے رے گزرے وقت تجھے میں کیا کہوں  
امید لگتی ہے پر آس گزر جاتی ہے  
باتوں باتوں میں جب ذکر تیرا چھڑ جائے  
جاگ کر ہی سہی پر رات گزر جاتی ہے  
شوخ نظروں سے تیرا سر کو جھکا کے کہتا  
تیری یادوں میں شب و رات گزر جاتی ہے  
کبھی ملتی تھی وہ دن میں کئی بار مجھے  
اب قریب طے چپ چاپ گزر جاتی ہے  
(سلیم عباس کنول..... چنیوٹ)

(اذان عزیمت..... بخند و آدم)

سال نو تو آ رہا ہے دلہیز پر  
الوداع ہو رہا ہے یہ سال  
ان محبت دکھ سکھ رنج و ملال  
مہنگائی غربت و افلاس کا جال  
باپ کا سایہ اٹھنے کا ملال  
شہر نگار میں خونی بھگڑے  
ڈوب کر پیاروں کے مرنے کا ملال  
سال نو آرہے ہو تم مرحبا!  
سکھ اور دکھ کا لے کر قتال  
دے دو سب کو قہقہے مسکان، امید وصال  
(عروج ماہین طہ..... سرگودھا)

☆ ☆ ☆



## ذرا سی بات

عامر ملک - راولپنڈی

اچانک چار پائسی پر پڑا ہوا مردہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کی شعلہ بار آنکھیں انگارہ برسانے لگیں، اس کے منہ سے دو دو انچ لمبے دانت باہر کو نکل آئے، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے کو بڑھنے لگا کہ اچانک.....

خود غرضی کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک انوکھی خواہش کا دردناک اور بھیاں تک انجام

میں لائیں بچانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے زور زور سے دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا تو سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس وقت اسے پہچان نہ سکا۔ معمولی علیک سلک کے بعد میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لائسنس تھی جو جل رہی تھی۔ اس نے وہ لائسنس میری لائسنس کے قریب رکھی اور چار پائی پینٹنے لگا۔ وہ لائسنس کی روشنی

میں جب تک زندہ ہوں۔ میں وہ رات بھی نہیں بھول سکوں گا۔ آج بھی جب میں وہ وقت یاد کرتا ہوں۔ تو سارے جسم پر چیسے لرزہ طاری ہو جاتا ہے اس وقت میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ سر دیوں کے دن تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد سب گھر والے سو گئے تھے مگر میں جاگ رہا تھا اور اسکول کا کام کر رہا تھا۔ رات کافی گزر گئی تو غصہ کی وجہ سے میری آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی تھی۔

چاند رویا تھا ستارے ٹوٹے ہم سے جب یار پرانے پھڑپھڑے ہم نے اس وقت ڈوب دی ناؤ ہم سے جس وقت کنارے چھوٹے ان کے چہرے پہ ہے ایسی روشنی جیسے پانی میں کوئی پھول کھلے دن گزرتے ہیں ہمارے ایسے جیسے آندھی میں کوئی دیپ جلے دل کو دلیر پہ رکھ دیتے ہیں ہم چراغوں کی طرح شام ڈھلے کوئی منزل ہے نہ رستہ میرا کس طرح کوئی مرے ساتھ چلے (حکیم خان حکیم..... ایک)

جن کی تعبیر تو ممکن ہی نہیں ہم نے ایسے بھی خواب دیکھے ہیں ایک ہی لفظ میں جو بات مکمل کر دیں ہم نے ایسے جناب دیکھے ہیں ساتھ رہتے تھے مگر پھر بھی مخالف تھے امتیاز ہم نے ایسے احباب دیکھے ہیں (ایس امتیاز احمد..... کراچی)

اے دوست بن فریاد میری کبھی دنیا تھی آباد میری میں پریم مگر کا باسی تھا اور پیار کا اتنا عادی تھا کہ سانس پیار سے چلتی تھی دھڑکن بھی گیت سناتی تھی نہ کھانا پینا عشق سدا نہ چلنا پھرنا عشق سدا جیون میں ہر سو رنگ ہی رنگ ہر پل جینے کی ترنگ پھر پینا میرا ٹوٹ گیا وہ ویس بھی مجھ سے چھوٹ گیا اب بستی بستی گھومتا ہوں جینے کا سہارا ڈھونڈتا ہوں (ایم عبداللہ..... ایک)

اس کی یادوں کا تھا سفر لوگو خند آتی کیا رات بھر لوگو زخم مجھ کو لے جہاں میں میں رہا پھر بھی بے خبر لوگو کس طرح سے اسے مناتا میں لفظ سارے تھے بے اثر لوگو صرف آنکھوں میں اٹک رہے تھے خواب سارے تھے در بدر لوگو تھا تھا ہے آج بھی رانا زنگی ہوگی کیا بسر لوگو (قدیر رانا..... راولپنڈی)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے نہ جانے دل کے سہارے ہم خون میں ہم رنگ جاتے ہیں کانٹوں کو چٹنے، چٹنے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کو شمع کے مانند پھل رہے ہیں رنہ رنہ بجنے لگے ہیں (عثمان غنی..... پشاور)

ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں

ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں

ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں

ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں

ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں ہم نے ایسے شباب دیکھے ہیں انہیں راتیں نہ آتیں۔ کون سے خواب ہیں



میں۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ہمارے ایک قریبی رشتہ وار فیض عالم خان تھے۔ اس وقت وہ بہت ہی پریشان لگ رہے تھے ان کے سر پر سفید رنگ کی پکڑی بندھی ہوئی تھی۔ لیلیا کی تمغیں شلوار پہنے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں انہوں نے لٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے جب انہیں پہچان لیا تو ان کے ہاتھ سے لٹھی لینے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے وہ بہت ہی مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”بچا اس وقت کیسے آتا ہوا؟“ کہنے لگے۔ ”بیٹا ذرا اپنے والد صاحب کو جگادو تا کہ وہ میری کچھ مدد کریں۔ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔“

میرے چگانے سے پہلے ہی ہماری آواز سن کر والد صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور پھر وہ خودی اٹھ بیٹھے تھے۔ اباجان نے ان سے پوچھا۔ ”بھائی فیض عالم خیرت تو ہے ناں؟“ تو وہ بولے اور کہنے لگے۔ ”آج میری بیوی غائب ہوگئی۔ میں شام کو جب گھر واپس آیا تو مغرب کا وقت تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ نظر نہ آئی۔ میں نے سمجھا کہ شاید کنویں سے پانی لینے گئی ہو۔ یا کہیں اڑوس بڑوس میں ہوگی تو آج ملے گی۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب اندھیرا پھیل گیا اور وہ نہ آئی تو مجھے گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے بڑوس والوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بھی لٹھی کا اظہار کیا۔ اور کہنے لگے آج تو ہم نے تمہاری بیوی کو دیکھا ہی نہیں۔ ان کی پھوٹی بیٹی سے معلوم ہوا کہ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے میری بیوی کنویں سے پانی کا گھڑا بھر کر لائی تھی۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کہاں گئی؟ ویسے مجھے شک ہے کہ وہ شاید قریب کے جنگل میں نہ چلی گئی ہو۔“ میرے اباجان نے کہا۔ ”رات کو اس کا جنگل میں کیا کام؟ ویسے ہی کہیں ادھر ادھر ہوگی۔“ کہنے لگا۔ ”بھائی صاحب ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ رات تک کسی کے پاس رہ سکتی ہے۔ مجھے جنگل کا شک اس لئے پڑ رہا ہے کہ وہ کئی دنوں سے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ نزدیک ہی ساگ اگا ہوا ہے سب عورتیں جن کر لاتی ہیں۔ میں بھی لے کر آؤں گی۔ مگر میں نے

تو اس کو بخ کر دیا تھا۔ وہ اکثر ضد کرتی رہتی تھی۔ اور مجھے اس لئے بھی یقین ہے کہ ابھی تک چوبیسے میں آگ بھی نہیں جلی اور نہ ہی کوئی ہانڈی وغیرہ پکی ہوئی ہے۔“ میرے والد نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ابھی تک تمہارے لئے ساگ ہی جن رہی ہوگی۔“ وہ کہنے لگے۔ ”یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ شاید رات پڑ گئی ہو۔ اور یا تو اسے کسی درندے نے ہلاک کر دیا ہو یا وہ راستہ بھول کر آگے چل گئی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ وہ یہاں کی رہنے والی تو ہے نہیں کہ اسے جنگل کے راستوں کا علم ہو۔ لیکن شوق میں چلی گئی اور مجھے پریشان کر دیا۔“

اباجان نے کہا۔ ”اب تمہارا کیا خیال ہے کیا اسے اس وقت جنگل میں تلاش کرو گے؟“

”میرا تو یہی ارادہ ہے۔ اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آج میری مدد کریں کہ شاید اس کے زندہ یا مردہ ہونے کا پتہ چل جائے۔“ والد نے کہا۔ ”چلو میں تیار ہوں۔ ایک دو آدمی اور بھی ساتھ لے لو۔ اور یہ دوسری لٹھیں بھی لئے چلے ہیں۔“ یہ کہہ والد صاحب تیار ہونے لگے۔ ان کو دیکھ کر میں نے کہا۔

”اباجان۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ میں تیار ہوتا ہوں۔“

”اباجان نہ مانے۔ مگر میں نے ضد کی تو وہ رو رہی ہو گئے اور میں بھی ان کے ساتھ چچا فیض عالم کی بیوی کو تلاش کرنے کے لئے چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر چچا فیض عالم نے چار آدمی اور دو بچے ساتھ لے لئے۔ ان میں ایک میرا چھوٹی بھئی زاد بھائی فیض بھی شامل ہو گیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا مڈ بے حد خراب تھا۔ شاید نیند میں اٹھا اسے بہت ہی ناگوار گزرا تھا۔ اب ہم کل چل فرہو ہو گئے ان میں سب سے کم عمر میں ہی تھا۔

تین گھنٹے تلاش میں گزر گئے۔ فیض عالم سب سے آگے چل رہے تھے اور اپنی بیوی کا نام لے لے کر پکارتا جا رہا تھا۔ ویسے تو سارا جنگل چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ مگر بعض جگہوں پر بالکل اندھیرا ہو جاتا تھا۔ جہاں سے

گزرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لٹھیں کی روشنی نا کافی ثابت ہو رہی تھی۔ تلاش کرتے کرتے ہم سب ہی تھک گئے تھے اب تو جنگل کے پرندے بھی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔ فیض عالم اب بھی اپنی بیوی کو پکارا رہے جا رہا تھا۔ اب ہم سب ایک کشادہ جگہ پہنچ گئے۔ تب فیض نے کہا۔ ”بھائی۔۔۔ میں تو بالکل ہی تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے ہم سب لوگ وہیں آئے سانسے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ چچا فیض عالم کی بے چینی نمایاں تھی اب سب لوگ واپس جانے کے لئے مشورہ کرنے لگے۔ میں نے چچا فیض عالم سے کہا۔ ”چچا۔ اب ہم نے جنگل کا کافی حصہ تھکھا لیا ہے۔ مگر چچی کا کوئی نام نشان نہیں ملا اس لئے اب یہاں پھرتے رہنا بے کار ہے۔ چلیں واپس گاؤں چلتے ہیں۔“

چچا فیض عالم کچھ دیر چپ رہ کر سوچتے رہے اور پھر کہنے لگے۔ ”ہاں تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ اب واپس ہی چلنا چاہیے مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس راستے سے واپس جانا چاہئے۔ انہوں نے مشرق کی طرف اپنی لٹھی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ایک اور آدمی نے کہا۔ ”میں فیض عالم! ہم لوگ ادھر نہیں جائیں گے تمہیں معلوم ہے کہ وہ جگہ بہت ہی خطرناک ہے۔ وہاں تو دن کے وقت لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“

مگر فیض عالم نے کہا۔ ”اب اتنی محنت آپ لوگوں نے کی ہے تو تھوڑی سی ہمت اور کریں میرا شک دور ہو جائے۔“ یہ کہہ کر وہ سب کے آگے چل پڑے ہم لوگ بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ دراصل وہ جگہ بھول ہمارے ساتھی کے بہت ہی خطرناک تھی سامنے کی پہاڑی ایسی تھی کہ اس کے تمام پتھر سیاہ رنگ کے تھے اور اکثر ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے کھائی میں گرے رہتے تھے اور بعض پتھر تو سینکڑوں ٹن وزنی تھے۔ اس سے ذرا آگے بڑھیں تو پہاڑی کے بائیں طرف ایک بڑا سا پانی کا گڑھا تھا۔ جس کی لمبائی چھ گز کے قریب تھی اور چوڑائی بھی اس

سے کچھ ہی کم تھی۔ اس کے ایک طرف پہاڑی کا حصہ پانی کے اوپر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ وہ بہت بڑا غار معلوم ہوتا تھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں جاتا تھا بلکہ آج تک بھی کوئی نہیں گیا تھا اور گڑھے کی گہرائی کا اندازہ بھی کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ چند آدمیوں نے اس کی گہرائی تاپنے کی کوشش کی تھی اور ایک بہت بھاری پتھر ایک رسی کے ساتھ باندھ کر اس کی گہرائی تاپنے کی کوشش کرنے کے لئے پانی میں ڈال دیا تھا۔ اور رسی کے ساتھ مزید رسی باندھتے گئے یہاں تک کہ ایک چار پائی کا پورا بان ختم ہو گیا۔ پتھر بھی تھک نہیں جاسکتا تھا۔

جس آدمی نے رسی پکڑی ہوئی تھی اس کے ہاتھوں سے اب خون رسنے لگا تھا۔ اور رسی کی وجہ سے رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تو اس کے بعد دوبارہ کسی نے ایسی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لئے اس کی گہرائی کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔ کچھ عرصہ اس گڑھے کی وجہ سے اور کچھ دہاں کا ماحول ہی ایسا برسرِ ارتقا کیا کہ آدمی تو اس طرف سے گزرتا ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ یہاں جنگلی ہلاکین رہتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم لوگ ادھر جانے سے کتراتے تھے جب ہم لوگ پہاڑی سے کوئی آٹھ گز کے فاصلے پر پہنچے تو صبح ہو گئی تھی۔ اب ہم لوگ لٹھیں کی روشنی کے تحت چلی نہیں رہے تھے۔

اجانک چچا فیض عالم جو سب سے آگے تھے کہنے لگے۔ ”بھائی۔ وہ سامنے پتھر کے سہارے دیکھو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی انسان کھڑا ہے۔“

ہم لوگوں نے ادھر دیکھا تو واقعی وہ کسی انسان کی پرچھائیں کی نظر آ رہی تھی۔ جب ہم آہستہ آہستہ نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی انسان ہے بلکہ ایک عورت ہے اور وہی ہی نظر میں ایسا معلوم ہوا کہ وہ پتھر کے ساتھ لگ کر کھڑی ہے اور بازو جو پتھر کے اوپر کی طرف رکھا وہ انظر آ رہا ہے اس میں ایک ٹوکی لٹک رہی ہے اور اس کا بایاں ہاتھ نیچے کو لٹک رہا ہے اور وہ سیاہ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے سر کھڑی ہے۔ اس کا خوفناک چہرہ ہمیں صاف نظر آ رہا تھا بڑے بڑے دانت آگے

کو نکلے ہوئے تھے پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ عورت ہنس رہی ہے۔ مگر جب ذرا غور سے دیکھا تو دانت بے شک باہر نکلے ہوئے تھے مگر وہ سادگیتھے۔ یہ جان کر مجھے ہلکی سی آگئی۔

اور بحر فیض عالم آگے بڑھے اور اس کے پاس جا پہنچے اور اس کو چھوڑنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہ اس کو نورینکیم بنوینکیم پکارنے لگے۔ اب تو انہوں نے رونا بھی شروع کر دیا۔ ہم سب بھی آزاداروں سے کھڑے اپنی اپنی جگہ محسوس کر رہے تھے فیض عالم نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ جو نوکری اس کے بازو سے لٹک رہی تھی اسے اتار کر دور پھینک دیا اور کہنے لگا۔ ”تم نے اس کی وجہ سے جان دے دی۔ اگر تو ساگ نہ کھاتی تو کون سا فرق پڑ جاتا۔“

اس کی حالت دیکھ کر ہم لوگوں کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی اور آنسو تو رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ خیر تھوڑی دیر تک ہم اسی حالت میں رہے۔ پھر میرا لڑکا نعیم بولا ”چچا فیض عالم۔ اب میرا کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ نقد پرنے چچی کی موت ایسے ہی لگتی تھی۔ اب رونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں گاؤں چلنا چاہیے۔ اچھا ابھی ہونے والا ہے۔“ ہم نے دو آدمیوں کو گاؤں کی طرف روانہ کیا کہ وہ ایک چارپائی اٹھالیں تاکہ میت کو گاؤں لے چلیں۔ اب میں ذرا میت کے اور قریب ہو گیا تو دیکھا کہ اس کے دائیں کندھے سے فیض کا ایک حصہ پھٹ کر پیٹ کی طرف لٹک رہا تھا جس سے اس کی دائیں چھاتی کا ایک حصہ بالکل برہنہ ہو گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھتے ہوئے شرم محسوس ہوئی تو میں وہاں سے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب لوگ چارپائی لے آئے تو فیض عالم نے لائین مجھے پکڑا دی اور خود اپنی مرده بیوی کو اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا جب وہ میت اٹھا رہا تھا تو میری نظر پھر اس کے عریاں حصے کی طرف اٹھ گئی۔ اب مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا کہ اس کی چھاتی پر ہلکے ہلکے زخموں کے نشان برابر لکیروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ یہ ضرور کسی بھیاک جانور یا کسی بلا کی حرکت تھی۔ مگر جو بات حیرت انگیز تھی وہ یہ کہ زخموں میں سے خون بہتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس سے مجھے یقین ہوا کہ اس بدنصیب عورت کو کب سے ہوئے بہت دیر ہو گئی اور یہ جو ختم مجھے نظر آیا ہے۔ یہ تو شاید ابھی تھوڑی دیر قبل کا تھا۔

میرا داغ مزید اچھا لگا کہ آ خر چچی نورینکیم کی موت کس طرح واقعہ ہوئی ہے۔ کوئی درندہ اگر ان کو مارنا تو یہ ہمیں اس حالت اور اس انداز میں نہ ملتیں۔ اگر انہوں نے خودکشی کی ہے تو پھر یہ یہاں کھڑی کس طرح ہو گئی؟ اب مجھے وہ نوکری یاد آ گئی جو اس کے بازو کے ساتھ لٹک رہی تھی اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ نوکری تو ادھر ہی رہ گئی ہے۔ میں ان ہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ میت کس نے اٹھائی ہے اور ہم کب وہاں سے روانہ ہوئے۔

اب کافی روشنی پھیل گئی تھی اور جو درآ دی ہم نے چارپائی لینے کے لئے گاؤں روانہ کئے تھے۔ شاید انہوں نے گاؤں میں یہ خبر کروی تھی۔ اس لئے گاؤں کے اور بھی کئی آدمی ہم لوگوں میں شامل ہو گئے تھے اور وہ لوگ فیض عالم سے اظہار محسوس بھی کر رہے تھے۔ اب میت کے ساتھ اچھا خاصا قافلہ بن گیا تھا۔ مجھے اب پھر نوکری کا خیال آیا اور میں ان لوگوں سے الگ ہو کر واپس پلٹ آیا۔ ان لوگوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن میرے کزن نعیم کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ بھی رک گیا اور جب وہ سب لوگ آگے بڑھ گئے تو وہ میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔

”اب واپس کیوں جا رہے ہو کیا تمہاری کوئی چیز وہاں رہ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں وہ نوکری دیکھنے جا رہا ہوں کہ آ خراس میں کون سی چیز تھی۔“

وہ بولا۔ ”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں وہ نوکری جھاڑی میں بھنسی ہوئی ملی۔ مرده تو خالی تھی۔ ہم نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ تو ہمیں ہرے ہرے پتوں کی ایک چھوٹی سی گڈی مل گئی۔ یہ یقیناً اس نوکری میں تھی۔ مرده ساگ نہیں تھا۔ بلکہ ایسے ہی جنگلی پتے تھے ایسے لگدہا تھا کہ کسی نے جلدی سے پتے نوج کر نوکری میں رکھ دیے ہوں۔ نعیم نے سنی

خیر نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”بھائی اللہ رحم کرے۔ معاملہ گڑبگڑا ہے۔ ان پتوں کا نوکری میں کیا کام تھا۔“ وہ کہنے لگا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ چچی نور کو کسی آدمی نے مارا ہے۔ یہ سب کچھ یہاں ہی رہنے دو اور جلدی داپس چلو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہم لوگوں پر کسی قسم کا شک کرے۔ اب ہم جلد از جلد ان لوگوں کے پاس پہنچنا چاہتے تھے۔ راستے میں ہم لوگوں نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ لوگ میت کو فیض عالم کے گھر لے گئے اور میں اپنے گھر جا کر فوراً ہی سو گیا کیونکہ پوری رات کا جاگا ہوا تھا۔ دوپہر کو میری آنکھ کھلی تو میں وہاں گیا جہاں قبر کھودی جا رہی تھی قبر تیار تھی۔ مگر فیض عالم کے گھر ایک طوفان برپا تھا۔..... فیض عالم کے بڑے بھائی سرور خان کی بیوی نہیں چاہتی تھی کہ میت آج ہی دفن کی جائے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ جب تک نورینکیم کے ماں باپ یا بھائی وغیرہ نہ آئیں اسے دفن نہ کیا جائے کیونکہ وہ دونوں آپس میں رشتہ دار تھے اس لئے میں اس کا موقف صحیح تھا۔

مگر فیض عالم غصے میں لال بھسوکا ہو رہے تھے اور لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ ”میری بیوی مر گئی۔ میرا گھر برباد ہو گیا۔ مگر میری بھابھی کو میرا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ نہ معلوم یہ کل کس وقت فوت ہوئی ہوگی۔ اسے اگر آج دفن نہ کیا گیا تو کل تک اس کی لاش خراب ہو جائے گی۔ سرور خان بھی اپنی بیوی پر زور دے رہا تھا کہ میت دفن کرنے دو اس کے رشتہ دار اب اگر آئے بھی تو فائدہ ہی پڑھیں گے اور اگر بعد میں آئے تو تب بھی دعا کر کے چلے جائیں گے۔ ان کے آنے سے یہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہو جائے گی۔“

مگر سرور کی بیوی ان کی بات ماننے پر بھی تیار نہ تھی۔ اس نے صبح ہی اپنے بوئے لڑکے کو نورینکیم کے والدین کے گاؤں خبر دینے روانہ کر دیا تھا۔ جو ہمارے گاؤں سے تیس میل دور تھا اور اب اس کا خیال تھا کہ وہ آنے والے ہی ہوں گے۔ اب چونکہ قبر تیار تھی۔ اس لئے لوگ فارغ ہو کر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسٹن میں نماز کا وقت ہو گیا اذان ہوئی تو سب لوگ نماز

پڑھنے چلے گئے جوں ہی لوگ نماز سے فارغ ہوئے نورینکیم کے والد۔ والدہ اور دونوں بھائی بیچے گئے۔ دس منٹ تک وہ لوگ میت کے پاس ٹھہرے ہوں گے کہ نورینکیم کی والدہ جو برابر پرودے جا رہی تھی اس نے نورینکیم پر سے بے اختیار ہو کر پڑا اٹھایا تو فوراً ہی اپنے سینے پر دو ہاتھ مارنے ہوئے اپنے خاندان کو دور سے آواز دی وہ قریب ہی کھڑا تھا چونکہ میت کے پاس عریاں بہت تھیں۔ اس لئے وہ ذرا دور ہٹ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ بیوی کی غیر معمولی آوازیں کر وہ فوراً قریب آ گیا۔ بیوی نے کہا کہ ذرا یہ دیکھو ہلدی بیٹی مری ہیں اسے مارا گیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے کے دروازے کی طرف مڑی۔ وہ بالکل بوڑھی تھی مگر اس وقت نہ معلوم اس میں اتنی طاقت کہاں سے آئی تھی کہ جیسے ہی دروازے میں اسے سرور خان نظر آیا تو اسے دوڑ کر اسے اس طرح پکڑا جیسے وہ بھاگنے والا ہو۔ اور اسے گھسٹ کر وہ میت کے سر ہانے لے گئی اور بولی۔ ”..... دیکھ ظالم انسان! تم لوگوں نے اس غریب پر کتنا ظلم کیا ہے اور اوپر سے کہتے ہو کہ جنگل میں راستہ بھول گئی تھی سرور سے اس کی موت واقع ہو گئی ہے ایک بچہ بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ اس مظلوم کو قتل کیا کیا ہے۔“ سرور خان کے پیچھے فیض عالم بھی اندر آ رہے تھے مگر وہاں کی حالت دیکھ کر واپس پلٹ گئے۔ نورینکیم کا باج خاموش کھڑا تھا۔ جب اس کی بیوی ذرا خاموش ہوئی تو اسے بولنے کا موقع ملا اور اس نے سرور خان کو مخاطب کر کے کہا کہ.....

”سرور خان! میں یہ معاملہ تمہارے اور عدالت میں لڑنے لگا جاؤں گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہم چپ ہو جائیں۔ میری لڑکی نے آ خر کون سا ایسا جرم کیا تھا کہ اسے جان سے مار دیا گیا۔ پرسوں ہی تو میں اور میرے بیٹے یہاں آئے تھے اور وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اس نے کھانا پکایا تھا اور ہم لوگ کھانا کھا کر گئے تھے۔ اس وقت وہ بالکل خوش باش تھی۔ اور آج میں اس کی لاش کے سر ہانے کھڑا ہوں۔“ سرور خان نے بات گڑتے دیکھی تو فیض عالم کو بلانے باہر چلا گیا مگر تھوڑی دیر بعد پریشان سا ہو کر







# پہاڑی کے جن

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

بزرگ نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو سامنے میدان میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور پھر جب دھواں چھٹا تو اس جگہ عجیب و غریب شکل کی وحشت ناک مخلوق کھڑی تھیں جن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور پھر.....

لفظ لفظ سطر سطر دماغ کو ماؤف کرتی اور لرز ابرام کرتی انوکھی اور حقیقی کہانی



لیڈی ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی اور پیشانی غرق آلود تھی۔ ”ڈاکٹر خیریت تو ہے۔“ ارجن نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔

”سک..... کچھ نہیں۔“ لیڈی ڈاکٹر گڑبڑا گئی۔ ”آپ کی جتنی اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں ہمیں ذرا جلدی ہے۔“ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کوریڈور سے باہر چلی گئیں۔

اگر جن ٹھک گیا، ضرور کوئی خاص بات ہے ورنہ ڈاکٹر نے اس طرح ایک دم رخصت نہ ہوتی انعام تو اپنی جگہ پر لیڈی ڈاکٹر اور دانی نے جاتے ہوئے اس سے اپنی فیس بھی نہیں لی تھی۔ ارجن الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ڈبل بیڈ پر راوہا لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ کے قریب رکھے مٹی اور خوبصورت جھولے میں ایک نومولود خوبصورت بچہ لیٹا تھا۔ وہ چند لمبے نازک انڈیگو ہونے سے بچے کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر بچے کے جسم سے لپٹا ہوا تولیہ جیسے ہی کھولا تو اس کا دماغ جھک سے اڑ گیا۔ وہ غصے سے بھنایا ہوا رادھا کی طرف بڑھا۔ اس کا دایاں بازو حرکت میں آیا اور ایک زوردار تھپڑ رادھا کے چہرے پر

**بمبئی** میں واقع ایک شاندار کونجی کے اندر ایک کمرے کے بند دروازے کے باہر کھڑا ارجن مضطرب نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے اندر اس کی بیوی راوہا، ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک ماہر دانی کے ہمراہ موجود تھی۔ ارجن اس وقت اپنی ہونے والی اولاد کے بارے میں سوچتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ بے پناہ دولت اور اثر و رسوخ کے مالک ارجن کی شادی کو پانچ سال بیت چکے تھے۔ وہ تیز اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اب جا کر اس کی مراد پوری ہو رہی تھی۔

ارجن بذات خود کوئی اچھا انسان نہیں تھا وہ وسیع پیمانے پر منشیات اور غیر قانونی اسلحہ کا کاروبار کرتا تھا۔ شہر میں اس کے کئی جوئے کے اڈے تھے۔ بمبئی میں ایک بڑی ٹیکسری اور کئی اناج کے گودام اس کی ملکیت تھے۔ غریب اس کی نظر میں کینڑے مکوڑوں سے بھی بدتر تھے۔ کسی انسان کو اس کی زندگی سے محروم کرنا اس کے پائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ارجن کٹر قسم کا انتہا پسند ہندو تھا۔

اچانک ارجن کے کانوں سے بچے کے رونے کی آواز نکلائی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور جوان سالہ لیڈی ڈاکٹر اور ادھیڑ عمر دانی کمرے سے باہر نکلیں۔

پڑا۔ ”یہ تو نے بہت بڑا ابرادھ کیا ہے نہ دہ جانے کس جنم میں تو نے کیسے پاپ کئے ہیں۔ جن کے کارن آج تو نے اس بھروسے کو ختم دیا ہے، دل بھر کر آخری بار اسے دیکھ لے۔“

ارجن کی زبان زہر لگنے لگی پھر وہ کمرے میں رکنا نہیں دندا تا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور کوڑی در میں چلنا ہوا ایک دوسرے کمرے کے دروازے پر جا پہنچا۔

اس کمرے کے دروازے کے باہر ایک لمبا ڈنگا سانولے چہرے اور گھٹی موچھوں والا قوی ہیکل شخص کندھے پر رائفل لٹکائے کھڑا تھا۔ ”مہندر ایک گھنٹے کے اندر اندر پاپوں کی اس گھڑی کو مار کر علاقے سے دور پھینک آؤ تا کہ کوئی نہ جان سے کہ یہ ہماری اولاد ہے۔“

مہندر کو حکم دے کر وہ کمرے میں داخل ہو گیا کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک طرف ریک میں رکھی شراب کی بوتلوں کی طرف بڑھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ شراب سے اپنا غم غلط کرتا رہا اس دوران کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ”اندر آ جاؤ“ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ مہندر کمرے میں داخل ہوا۔ ”کام ہو گیا ہے باس۔“ مہندر سر جھٹکا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ مہندر سر جھٹکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دوبارہ شراب نوشی میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر بعد نشے میں ڈولتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ اب اس کا رخ رادھا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ چلتا ہوا رادھا کے کمرے میں داخل ہوا۔ رادھا بیڈ پر لیٹی رو رہی تھی۔ ”آخری بار! رو لے تیرے سوگ میں جانے کا سہ ہو گیا ہے۔“ ارجن کی بات سن کر رادھا خوف زدہ ہو گئی اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ چہ کی طرح کاہنے لگا۔ ارجن نے دونوں ہاتھوں سے رادھا کی گردن دیوچی۔ رادھا نے مزاحمت کی مگر وہ ارجن کی طاقت کے سامنے بے بس ہو گئی اس کی مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی کچھ دیر بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

اس جگہ سے دور ایک سنسان سڑک کے کنارے گھٹی جھاڑیوں میں ایک نوزائیدہ معصوم بچہ چلتی پھانڈ کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ شاید اوپر والے مالک سے فریاد کر رہا تھا کہ اس ظالم دنیا میں اسے کس لئے بھیجا گیا ہے۔ جہاں ارجن جیسے دندنے لیتے ہیں پھر اپنی پوری رفتار سے رو رہا تھا۔

اچانک ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی جھاڑیوں میں لپٹل سی بچی اور ایک خوشخوار کتا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ اب وہ غراتا ہوا روتے ہوئے بچے کی طرف بڑھ رہا تھا بچے کے رونے میں تیزی آچکی تھی شاید اسے بھوک لگی تھی وہ معصوم اس سفاک حقیقت سے بے خبر تھا کہ ماں جیسی انمول ہستی ایک شیطان نے اس سے چھین لی ہے۔ ادھر کتا بھی شاید کٹی وقتوں سے بھوکا تھا۔

بچے کی صورت میں اسے اپنی خوراک نظر آنے لگی۔ کتے نے بچے کے قریب آ کر غراتے ہوئے اس کی دائیں ٹانگ میں اپنے دانت تھسیر دیئے۔ روتا ہوا بچہ اب موت کے منہ میں تھا۔ ٹانگ کتے کے منہ میں ہونے کی وجہ سے بچے کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ درد کی شدت سے اس کے رونے کی رفتار میں شدت آتی جا رہی تھی۔ کتا بچے کو کھینچنے ہوئے ایک طرف لے جانے لگا۔

اسی وقت اس سڑک سے گزرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار غفار کی موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر پتھر ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل سے اترا تو اچانک اسے بچے کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ آوازیں قریبی جھاڑیوں سے آرہی تھیں۔ غفار دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے خوفناک منظر تھا۔ ایک گرائڈل کتا بچے کی دائیں ٹانگ اپنے منہ میں دبوچے گھسیٹا ہوا ایک طرف لئے جا رہا تھا۔ غفار نے زمین سے چند پتھر اٹھائے اور کتے پر برسائے شروع کر دیے کتا پتھر لگتے ہی بچے کو چھوڑ کر ایک طرف بھاگ گیا۔

غفار نے روتے ہوئے نوموود بچے کو زمین سے اٹھالیا۔ بچے کی دائیں ٹانگ پر کتے کے دانتوں کے نشان تھے جن سے خون نکل رہا تھا۔ اچانک غفار کی نظر زمین پر پڑے ایک خشنی کارڈ پر پڑی اس نے خشنی کارڈ اٹھا کر جب میں ڈالیا۔

نام تو اس کا راجہ ناصر تھا پر سب اسے راجہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کی زندگی کی کہانی عجیب تھی۔ وہ غفار کو جھاڑیوں سے ملا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ بچے کا تعلق تیسری جنس سے ہے۔ غفار اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی سائرہ نے پہلے روز تو اس پر اعتراض کیا کہ ”لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔“

غفار نے یہ کہہ کر سائرہ کا منہ بند کر دیا کہ ”یہ جو کوئی بھی ہے جیسا بھی ہے اسے اللہ نے پیدا کیا ہے میں اسے اولاد کی طرح پالوں گا۔“ وہ اس کے گھر اس کے دوسالہ بیٹے سلمان کے ساتھ پرورش پانے لگا۔ غفار کی ہدایت کے بعد سائرہ نے راجہ کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھا۔ ان کا گھر خانہ خالص اسلامی ماحول کے عین مطابق تھا۔ غفار اس کی بیوی دونوں حافظ قرآن تھے۔

ذرا سا بڑا ہوتے ہی دونوں بچوں کو مدر سے میں داخل کروا دیا گیا۔ راجہ کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے گھر پر تو سب اسے پیار سے پیش آتے باہر اس کا مذاق اڑایا جاتا۔

وہ بچپن سے ہی اپنے اس جرم کی سزا پانے لگا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اس کی دوسری سزا کا آغاز اس وقت ہوا جب اس کی عمر آٹھ سال تھی اسے چاہئے والی اس کی ماں سائرہ تنگ دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی۔ اس روز وہ چھوٹ چھوٹ کر رویا۔ سائرہ تنگ نے اسے جنم تو نہیں دیا تھا لیکن اولاد دہی کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ دونوں بچوں کا ایڈمشن گورنمنٹ اسکول میں کروا دیا گیا۔ وہاں ہر کلاس میں پچاس ساٹھ بچے بھرتہ کر دیے کی طرح ٹھونسنے لگے تھے۔ ایک روز سلمان کی غلطی سے راجہ کا راز کھل گیا۔ اس نے اپنے ایک

کلاس فیلو کو بتا دیا کہ راجہ کا تعلق تیسری جنس سے ہے۔ اس طرح یہ بات پورے اسکول میں پھیل گئی۔ اسکول کے بچوں نے راجہ کا جینا حرام کر دیا۔

غفار کا کہنا تھا کہ پڑھ لکھ کر انسان بڑا آدمی بنتا ہے۔ راجہ نے صرف گیارہ سال کی عمر میں بھی لکھا کیا کہ ”اس معاشرے میں پڑھ لکھ کر نہ تو کوئی بڑا آدمی بنا ہے اور نہ ہی بنے گا۔ یہاں بڑا وہی ہے جو طاقتور ہے۔ سمندر میں بڑی پچھلی چھوٹی پچھلی کو کھاجاتی ہے۔ زمین پر کمزور انسان دوسرے طاقتور انسان کی ٹھوکروں میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے۔“

ایک روز بڑی عمر کے ایک لڑکے نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ غصے میں اس لڑکے سے لڑ پڑا جواباً اس لڑکے نے راجہ کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر دی۔ وہ روتا ہوا گھر گیا تو غفار نے بھی اس کی مرمت کر ڈالی کہ وہ اسکول پڑھنے جاتا ہے یا لڑنے؟

وہ گھر سے بھاگ نکلا اور ایک سڑک کنارے بیٹھ کر رونے لگا۔ اسی کا دم عمر ایک گیارہ سالہ لڑکا گریبان کے بٹن کھٹے سر بیٹ کے کش لگاتا ہوا اس کے برابر آ بیٹھا۔ ”کون ہے رے اس وقت یہاں بیٹھا کیوں رو رہا ہے؟“ اس نے سگریٹ کا دھواں راجہ کے منہ پر چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”اماں، اللہ میاں کے پاس ہے، ابانے مارا ہے۔ سب لڑکے مجھے مارتے ہیں میرا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ میں بھڑا ہوں لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے، مجھے تو اوپر والے نے پیدا کیا ہے۔“

راجہ کی باتیں سن کر وہ لڑکا دنگ رہ گیا۔ ”سن میرا نام ریش ہے، آج سے میری تیری دوستی کچی کل تو مجھے اسی جگہ ملنا، میں تجھے اپنے استاد شکر سے ملواؤں گا۔“

دوسرے روز راجہ اسکول سے بھاگ کر ریش سے ملنے چلا گیا۔ جس نے اسے اپنے استاد شکر سے ملوایا۔ 30 سالہ شکر شکل و صورت سے ہی بدمعاش نظر آتا تھا۔ راجہ کے شب و روز شکر اور ریش کے ساتھ



گزرنے لگے۔ شکر کے کہنے پر وہ سڑک پر گھومنے والے آوارہ لڑکوں سے لڑتا۔ ان سے مار کھاتا اور انہیں مارتا۔ اس نے جیب تراشی سیکھ لی۔ ذرا بڑا ہوا تو ریش کے ساتھ مل کر عورتوں سے پرس جھیننے لگا۔ 18 سال کا ہونے تک وہ ہر قسم کا اسلحہ چلانے میں ماہر ہو چکا تھا۔ اب وہ اور ریش شکر کے گروہ کے دیگر افراد کے ساتھ مل کر لوگوں کو لوٹنے لگے۔ یہ چار افراد پر مشتمل گروہ تھا۔ اڑتیس سالہ شکر، چالیس سالہ اچھے اٹھارہ سالہ ریش اور اٹھارہ سالہ راجہ جلی بڑی واردات بہمنی کے ایک سپراسٹور میں راجہ نے ان کے ساتھ مل کر کی۔ اس کے بعد چیئرمین پمپ لوٹے، بینک ڈکیتی کی۔

ایک بے سامندہ علاقے میں شکر کا قلیف تھا۔ جوان کا مشترکہ ٹھکانہ تھا۔ ایک سال کے عرصے میں راجہ کے پاس لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔ جو اس نے شکر کے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ عموماً دسمبر کے دھندے میں دسمبر کے لوگ ایک دور سے سے دھوکہ نہیں کرتے۔ اس دوران راجہ کا شانتی کارڈ بنوا دیا گیا۔ راجہ نے اکاؤنٹ کھلا کر روپے بینک میں رکھوا دیے۔ ایک روز ایک ڈکیتی کے دوران پولیس سے مقابلہ ہوا پولیس کی گولی سے شکر اور اچھے ہلاک ہو گئے راجہ اور ریش فرار ہو گئے۔ اس کے بعد راجہ نے دسمبر کے کاموں سے توبہ کر لی کچھ عرصہ بعد غفار بستر مرگ پر جا پہنچا۔ اس روز راجہ اور سلمان دونوں گھر پر تھے جب غفار اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا۔

”راجہ بیٹا! اب..... جب..... کہ میں دنیا..... سے جا رہا ہوں۔ ایک سچ تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔“ غفار کی آواز سے نقابت عیاں تھی اسے بے تحاشہ پسینہ آ رہا تھا۔ ”مجھے تمہیں..... پہلے بتا..... دینا چاہئے.....“ غفار نے اس معاملے..... کو نالتا..... رہا۔“ اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔

”آرام سے بات کریں زور سے بولنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ راجہ نے، ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ اس کی

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، یوں لگ رہا تھا جیسے غفار بولنے کے لئے ہمت جمع کر رہا ہو۔

کئی سال پہلے سڑک کے کنارے میری موز سائیکل بچھڑ گئی تھی۔ مجھے جھاڑیوں سے ایک بچے کے رونے اور کہنے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھاڑیوں میں جا گھسا تاکہ اسے نو مولود بچے کو منہ میں دباؤں گھسیٹا ہوا ایک طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے بچے کو کہتے سے بچا دیا، وہ جھاڑیوں میں مجھے کی مہندر تائی کسی شخص کا شناختی کارڈ بھی ملا۔ میں وہ شناختی کارڈ اور بچے کو اپنے گھر لے آیا۔ وہ بچہ تم تھے..... شناختی کارڈ الماری کی دروازے میں خاکی رنگ کے لفافے میں رکھا ہے۔“ غفار نے وردا مکمل کی اس کے ساتھ ہی اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

وہ دونوں غفار سے لپٹ کر رونے لگے غفار کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ راجہ کی حالت ان دنوں کافی ابتر تھی۔ وہ ہر وقت روتار رہتا تھا۔ ایک روز الماری سے خاکی لفافہ نکالا۔ بتائے بغیر گھر سے نکلا اور ادھر ادھر مارا مارا پھرنے لگا اس طرح اسے بھٹکتے ہوئے کئی روز گزر گئے۔ کھانے کو اگر کوئی کچھ دینا تو کھانا نہیں تو بھوکا رہتا۔

بھٹکتے بھٹکتے ایک روز ایک پہاڑی علاقے میں جا نکلا۔ شام کا وقت تھا سورج ڈوب چکا تھا۔ وہ گرنا پڑتا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی نظر پہاڑی کے وسط میں واقع ایک غار کے دہانے پر پڑی تو وہ غار کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ”مجھ جیسے بے مقصد وجود کو اللہ نے پیدا کیوں کیا؟“

اچانک اس کے سامنے ایک بڑا سا سانپ نمودار ہوا۔ سانپ پھن پھیلا کر اس کے سامنے کھرا ہو گیا۔ راجہ نے اسے مارنے کے لئے پتھر اٹھا لیا۔ اچانک اسے ایک ایسا خوفناک منظر دکھائی دیا کہ اس کے رگ و پے میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

پتھر ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا سانپ نے ایک لمبے ترنگے خوف ناک آدی کی شکل اختیار کر لی تھی۔

راجہ اس کے سامنے کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ راجہ جو کہ پہلے ہی بھوک پیاس اور تشنگان سے ٹھہرا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش آیا تو ایک کشادہ غار میں چٹائی پر پڑا تھا۔ وہ ایک دم شکر ہو کر اٹھ بیٹھا۔

راجہ سے کچھ فاصلے پر ایک نورانی چہرے والے بزرگ ہاتھوں میں شیخ لئے بیٹھے تھے۔ ”راجہ بیٹا! اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ اللہ نے کسی کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ وہ بڑا بخورار رحیم ہے۔ تمہاری زندگی کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہے، جو وقت آنے پر تمہارے سامنے آ جائے گا۔“ بزرگ کا دمہ لہجہ اس کی سماعت میں رس گھول رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بزرگ کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ وہ یہ جان کر بھی حیرت و استعجاب کے عالم میں تھا جو باتیں اس نے بے ہوش ہونے سے پیش تر غار سے باہر سوچی تھیں، ان سوچوں تک بابا کی رسائی کیوں کر ہوئی۔

”بابا میں بہت بد نصیب ہوں۔“ راجہ نے اشک بہاتے ہوئے اپنی وردا بیان کر دی۔

”انسان کی زندگی میں سکھ دکھ آتے جاتے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا اپنا وصف بنالو اور ساتھ میں اس کی عبادت کرو، اللہ تمہیں بہترین صلہ دے گا، اللہ نے تمہیں ایک نقص کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن یہی نعمت تو دیکھو تمہیں انعام بھی کتاب بڑا ملا ہے۔ تم ایک مسلمان گھرانے میں پرورش پاتے رہے۔ الحمد للہ تم مسلمان ہو۔ اپنے اعمال اچھے رکھو! انشاء اللہ آخرت میں اس کا تمہیں بہتر اجر ملے گا۔“

راجہ بڑی توجہ اور انہماک سے بزرگ کی باتیں سن رہا تھا۔ ”بابا جی آپ کون ہیں اور غار سے باہر جو کھانا چوڑا خوفناک شخص مجھے ملا وہ کون تھا۔“ راجہ نے بابا سے استفسار کیا۔

”بیٹا میں اللہ کا ایک معمولی سا بندہ ہوں۔“

اور باہر جسے نے تم دیکھا وہ ایک مسلمان جن تھا۔ جو اس پہاڑی علاقے کا گھرانہ ہے۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان جن موجود ہیں جو مجھ سے تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور بہت سے کاموں میں میری مدد بھی کرتے ہیں۔“

”بابا جی آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں میں یہاں سے مرتے دم تک ہلوں گا بھی نہیں۔“ راجہ نے کہا اور بابا نے آنکھیں بند کر لیں پھر چند لمحوں بعد بولے۔ ”اللہ کی مرضی یونہی ہے تو یونہی کما۔ تم زیادہ عرصہ یہاں رہ نہ سکو گے۔“

پھر راجہ کے شب دروز بابا کے آستانے پر گزرنے لگے وہ عبادت گزار ہو گیا ہر وقت بابا کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتا۔ اس دوران اس نے بہت سے حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ سینکڑوں جن بابا کے قہقہے میں تھے بابا دونوں کو بھی حاضر کرنے کا علم جانتے تھے۔ بابا کا نام عبداللہ تھا پر لوگ انہیں بابا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ صبح ہوتے ہی دور دراز سے سینکڑوں لوگ اپنی مرادیں پانے ان کے آستانے پر آتے۔ یہاں آنے والے ہر مذہب کے لوگ تھے بابا جی سب کے کام آتے تھے۔

ایک روز ایک ادھیڑ عمر شخص دور افراد کے ہمراہ ایک آٹھ سالہ لڑکی کو اٹھائے غار میں داخل ہوا اس شخص کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بابا کے اشارے پر انہوں نے بچی کو چٹائی پر لٹا دیا بچی کے ہاتھ پاؤں عجیب سے انداز میں مڑے ہوئے تھے۔ ”بابا جی اسے کافی عرصہ تک بخار رہا ہے علاج نہ ہوا رہا بخار تو ختم ہو گیا، پراس کے ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو گئے ہیں اب یہ چلنے پھرنے سے قاصر ہے۔ جگہ جگہ اسے علاج کے لئے لے گئے۔ مگر ڈاکٹروں نے اسے لا علاج قرار دے دیا ہے۔“ ادھیڑ عمر شخص روتے ہوئے بولا۔

بابا جی نے بچی کے جسم پر کچھ پڑھ کر پھونکا، دوسرا لمحہ حیران کر دینے والا تھا۔ بچی اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی، اس کے ہاتھ پاؤں درست ہو چکے



تھے۔ اس واقعہ کے کچھ روز بعد سہ پہر کے وقت درمیانی عمر کا ایک شخص آیا۔ اس نے پورے جسم پر بڑی سی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں غرض کہ ہاتھوں کے علاوہ جسم کا ہر حصہ چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں ظاہر تھیں اس کی بے تاثر آنکھوں میں عجیب سی دشت تھی اس کے جسم سے اس طرح بو آ رہی تھی جیسے مری ہوئی پھلیوں سے بو آتی ہے۔ وہ بابا سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ”باباجی مجھے اس مصیبت سے مجھے نجات دلائیں، میں بہت تنگ آ چکا ہوں۔“ اس شخص کے لہجے میں لاچارگی تھی۔ اس نے اپنے جسم سے چادر اتار دی۔

رابع بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس شخص کے ہاتھ پیر غرض کہ پورے جسم پر کڑھ کا مرض پھیل چکا تھا۔ اس کی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ اس کے جسم سے بدبو یقیناً ان رنموں سے آرہی تھی۔ ”بابا میرے پورے جسم کا یہ حال ہے مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی مجھے سزا ملی ہے۔ اب آپ میرے لئے دعا کریں۔“ اس نے امید بھری نظروں سے باباجی کو دیکھا۔

”بابا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔“ جھوٹ بولتے ہوئے، یہ چھوٹی سی غلطی کی سزا نہیں، میں ابھی تمہارے کرماتوں کو دکھاتا ہوں۔“ بابا نے غصے سے گرجتے ہوئے انگلی سے غار کی دائیں سمت والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ناقابل یقین منظر تھا۔ غار کی دیوار کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سینا کی اسکرین پر کوئی فلم چل رہی ہو۔

ایک خوفناک قسم کے بت کے سامنے ایک معصوم لڑکی خوف زدہ سی لیٹی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ ایک شخص تیز دھار خنجر سے اسے ذبح کر رہا تھا۔ پھر اس شخص نے ایک بڑے سے پیالے نما برتن میں لڑکی کی گردن سے بہنے والا خون جمع کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد خون سے بھرے پیالے سے تھوڑا سا خون ہاتھوں کے چلو میں لیا اور بت

پر اچھال دیا اس کے بعد پیالے کو منہ سے لگا کر خون پینے لگا وہ خوفناک منظر دیکھ کر لوگ ڈر سے کپکپانے لگے اس خونی شخص کی شکل ہو بہو باباجی کے سامنے موجود کوڑھ زدہ شخص کی طرح تھی۔

بابا نے دیوار کی طرف انگلی سے دوبارہ اشارہ کیا منظر تبدیل ہو گیا۔ اس بار وہ شخص قبرستان میں موجود کدال سے ایک تبر کھود رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کھودی گئی قبر میں جا گھسا اور اپنے کندھے پر ایک چوڑھ چدرہ سالہ لڑکی کی لاش لا کر باہر نکلا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کھنڈر نما مکان میں داخل ہوا اس نے لاش کے جسم سے کفن اتارا اور لڑکی کی بائیں ٹانگ خنجر سے کاٹ کر اس کی ٹانگ سے منہ لگا کر گشت کھانے لگا کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ میں صرف ہڈی تھی۔ اب وہ ہڈی سامنے رکھ کر کچھ پڑھ کر ہڈی پر پھونکتا جا رہا تھا۔

بابا نے ایک بار پھر انگلی سے اشارہ کیا اس بار اس وحشی درندے کو ایک بچے کے سینے سے دل نکالتے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ رابع کی حالت ڈر اور خوف سے غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر بابا نے انگلی سے اشارہ کیا اور دیوار سے خوف ناک مناظر غائب ہو گئے رابع گہری سانسیں لینے لگا۔

”تم نے اپنے اوپر سب دروازے بند کر دیے ہیں، تم نے شیطان کے کہنے پر اسلام چھوڑ کر دولت کی لالچ میں مرند ہو گئے اور بتوں کو پوجتے لگے، کئی بچیوں کو درندگی کا نشانہ بنایا۔ مردوں کی بے حرمتی کی، کئی بچے تمہارے ظلم کا نشانہ بنے۔ کالے جادو کے بل بوتے پر تم نے بہت سے گھر برباد کئے۔ عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ آخر اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”بابا کی بات سن کر اس شخص نے چیخ ماری اور اپنے لباس سے خنجر نکال کر غار سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک چیخ سنائی دی۔ رابع بابا سے اجازت لے کر غار سے باہر نکلا اسے ایک طرف لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ وہ ہجوم میں جا گھسا۔ ایک طرف اس شخص کی لاش

پڑی تھی اس کے سینے میں خنجر جھکست تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے غار سے باہر آ کر خودکشی کر لی تھی۔ وہاں رہتے ہوئے رابع کو پانچ سال بیت گئے۔ بابا سے بہت چاہتے تھے کیونکہ رابع ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک روز رابع بابا کے پاؤں دبا رہا تھا کہ نجانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ بابا سے فرمائش کر ڈالی۔ ”بابا میرے والدین زندہ ہیں کہ نہیں، آپ آج مجھے ان کے بارے میں کچھ بتائیں۔“

بابا نے آنکھیں بند کیں چند لمحوں بعد آنکھیں کھول کر رابع کو دیکھنے لگے کچھ دیر بعد رابع نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔ جواب میں بابا خاموش رہے۔ ”کیا ہوا بابا! کچھ بتائیں۔“ بابا کوشش و جستج میں مبتلا دیکھ کر رابع رسان سے بولا۔

”بیٹا تمہارا باپ زندہ ہے اور تمہاری ماں عرصہ ہوا اس کا انتقال ہو چکا ہے اس سے زیادہ مجھے بتانے کی اجازت نہیں۔“ بابا نے کہا۔

”رابع کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔“ میں صرف ایک بار اپنی ماں کی روح سے ملنا چاہتا ہوں، یہ آپ کیلئے مشکل نہیں۔“

بابا کچھ دیر اسے ٹالتے رہے مگر رابع اپنی ضد پر قائم رہا۔ اتنے عرصے میں پہلی بار رابع نے بابا سے کسی کام کا کہا تھا۔ بابا انکار نہ کر سکے۔ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر وظیفہ پڑھتے رہے تقریباً دس منٹ بعد غار میں ایک ہیولہ سا خوددار ہوا۔ جس نے ایک خوبصورت عورت کا روپ دھار لیا۔ اس عورت کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ رابع ماں کی طرف بڑھا ماں سے ملنا چاہا مگر نام کام رہا۔ وہ ایک غیر مرئی وجود تھا۔ رابع کے ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گئے۔ ”تم مجھے چھو نہیں سکتے روجوں کا غصہ وجود نہیں ہوتا۔“

”ماں مجھے جھڑپوں میں کیوں پھینکا۔ تمہارا انتقال کیسے ہوا میرا باپ کون ہے؟“ رابع نے روتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا میں تمہارے سوالات کے جواب نہیں

دے سکتی۔ مجھے اجازت نہیں ہے۔“ اس کی ماں کی روح بولی۔

”اچھا ماں اپنا نام بتا دو۔“ رابع نے دردمیہ لہجے میں پوچھا۔

”میرا نام رادھا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔“ رابع کے لہجے میں دکھ تھا۔

”ہاں بیٹا تم خوش قسمت ہو جو ہمیں مانگے بنا اسلام کی دولت ملی۔“ رادھا کی روح خست بھرے انداز میں بولی، کچھ دیر بعد روج نے بابا سے جانے کی اجازت طلب کی اور غائب ہو گئی۔ رادھا کی روح سے ملنے کے بعد رابع کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا پھر ایک روز وہ کسی کوتائے بغیر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

ہندوستان کے ایک قدیم مندر کے ایک ہال نما کمرے میں کالی کا خوف ناک بت موجود تھا۔ بت کے قدموں میں ایک سولہ سالہ خوبصورت لڑکی پڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خوف و ہراس کی تاثرات نمایاں تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر لوہے کی ایک انگلیٹھی دبک رہی تھی۔ انگلیٹھی کے قریب ہی لنگوٹ باندھے مکروہ صورت مہا گرو رام پرشاد بیٹھا تھا۔ مہا گرو رام پرشاد آنکھیں بند کئے شلوک پڑھ رہا تھا۔ مہا گرو کے پیچھے ارجن اور اس کے پہلو میں ارجن کا بیٹا ستیش بیٹھا تھا۔ ستیش اپنے باپ ارجن کی طرح قد آور اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ چند بچاری پینٹل کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے رقص کے سے انداز میں جھوم رہے تھے۔ شلوک پڑھتے پڑھتے مہا گرو نے آنکھیں کھولیں اور اپنی سرخ آنکھوں سے لڑکی کو گھورنا شروع کر دیا۔ پھر اس سے نظریں پھیر کر ستیش کو دیکھا۔ ”ماتا کے قدموں میں ملی چڑھا دو سے ہو گیا ہے۔“ مہا گرو کی بھاری آواز ہال نما کمرے میں گونجی۔

ستیش نے ایک طرف پڑا خنجر اٹھایا اور لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی بلند آواز سے چیختی لگی۔ اس کی چیخیں اور فریادیں ہال نما کمرے میں گونج رہی تھیں۔ رات کے اس پہر اندھیرے میں اس کی مدد کے لئے کسی کا آنا مشکل ہی نہیں نامکن بھی تھا۔ ارجن اس وقت چہرے پر سفاک تاثر لئے ستیش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس نے ایک ہاتھ سے لڑکی کے سر کے بال جڑے ہوئے تھے۔ اور دوسرے ہاتھ سے تیز دھار خنجر چلتی ہوئی لڑکی کی شرگ پر چلا رہا تھا قریب کھڑے ایک پجاری نے بڑا سا پیالہ نمائش آگے کیا۔ لڑکی کی گردن سے بہنے والا خون پیالے میں جمع ہونے لگا۔ پجاری نے پیالہ خون سے بھرتے ہی اٹھایا اور بت لی کے قدموں کے پاس ایک چھوٹے سے چپوترے پر رکھ دیا۔ یہاں کئی دے روٹن تھے مہارگرواگے بڑھا اور چلو بھریالے سے خون لیکر بت پڑا اور کچھ بت کے قدموں میں چھڑک دیا۔ اس کے بعد ارجن نے یہ عمل دہرایا۔ پھر ستیش کی باری آئی۔ اس طرح بار بار سب نے بت پر خون اچھالا۔

مہارگرو نے دوبارہ اشلوک پڑھنا شروع کر دیئے بیتش کی گھٹنیاں دوبارہ بیٹھ لگیں جولہ یہ لحد تیز ہوتی گئیں۔ ستیش نے مہارگرو کے اشارے پر ایک طرف رکھا بڑا سا تھال اٹھایا اور خنجر سے لڑکی کا سر دھڑ سے الگ کر کے تھال میں رکھ دیا۔ تھال میں رکھا سرت کے قدموں میں رکھ دیا گیا ہر چہرے پر عجیب قسم کا جوش و خروش تھا۔ کچھ دیر بعد یہ درندگی ختم ہو گئی۔

اب مہارگرو، ارجن اور ستیش ایک دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ مہارگرو ادھیڑ عمر کا بد صورت شخص تھا۔ اس کا کہنا تھا شادی کرنے سے دھرم کی سیوا میں فرق پڑتا ہے اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی دھرم کے نام پر داسیوں کی بربادی کی تھی۔ مہارگرو جب سفلی جذبات سے مغلوب ہوتا تو مندر کی داسیوں کو سیوا کے نام پر برباد کرتا تھا۔

”ارجن تم سے بھگوان ناراض تھا، اسی کارن تمہاری جتنی نے تجھ کو جہنم دیا۔ پھر تم نے ہمارے حکم

پر امداد کی رات کافی کے قدموں میں ایک خوبصورت ناری کی بلی دی اسی کارن ستیش پیدا ہوا، تم نے ہمیشہ کی طرح ہر امداد کی رات ایک خوبصورت ناری کی بلی دی ہے، مانتا تمہاری رکشا کرے گی۔“ مہارگرو نے کہا، کچھ دیر بعد دونوں باپ بیٹا مہارگرو کے چرن چھو کر مندر سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ارجن نے رادھا کو قتل کرنے کے کچھ عرصے بعد شانتی نامی ایک برہمن لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے اس کا بیٹا ستیش اور بیٹی لکشمی تھی جو سبھی کے ایک کالج میں زیر تعلیم تھی۔ چند سال پہلے ارجن کی بیوی شانتی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔

جب وہ اپنی جدید طرز کی عالی شان لکشمی میں داخل ہوئے، رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ لہذا دونوں نے اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔

صبح دیر سے ان کی آنکھ کھلی۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ لکشمی اپنی کلاس فیلو سہیلی مالا کے ساتھ آ پہنچی۔ مالا اور لکشمی نے پرانم کیا۔ ”چلتی مالا کی بڑی بہن کی سگائی ہے اور اس کا اصرار ہے کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چاندنی نگر جاؤں۔“

لکشمی ارجن سے مخاطب تھی۔ ”ٹھیک ہے چلی جانا۔“ ارجن کے اجازت دینے پر دونوں سہیلیاں خوش ہو گئیں دوسرے روز دونوں سہیلیاں چاندنی نگر پہنچ گئیں۔ مالا کے بھگوان واس ان کی چٹی اور گھر کے دیگر افراد لکشمی سے بڑی شفقت سے پیش آئے اس روز دونوں سہیلیاں رات دیر تک باتیں کرتی رہیں۔

صبح سمجھن کی آواز سے ان کی آنکھ کھلی۔ ناشتہ کرنے کے بعد مالا لکشمی کو لے کر گاؤں کی سیر کو نکل گئی۔ ہرے بھرے سرسبز کھیت پھلوں سے لدے درخت نہایت ہی دل کش منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ دونوں گھومتی پھرتی گاؤں کے آخری سرے پر جا پہنچیں۔ وہاں ایک خوبصورت نہر بہہ رہی تھی۔ وہ دونوں نہر کے کنارے بیٹھ گئیں۔ ”لکشمی کیا تمہارے دل پر کسی نے دستک دی ہے؟“

”اب تک تو آنکھوں میں کوئی چٹائی نہیں میرے پنوں کا رعبہ بہت سندر ہے! جب سامنے آئے گا تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔“ لکشمی نفرتی آواز میں کہی۔

اچانک لکشمی کے منہ سے کرہناک چیخ نکلی وہ نہ صرف چیخ بلکہ زمین پر گر کر ترپنے لگی، بھگوان بھگوان وہ دھشت سے بیکاری جا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ مالا گہرا کر چیختی ہوئی لکشمی کی طرف لپکی، تب اس کی نگاہ ایک کالے سے لمبے سانپ پر پڑی جو رینگتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ لکشمی نے اپنی پٹلی دونوں ہاتھوں سے جکڑی ہوئی تھی۔ اور تکلیف کی شدت سے پانی سے ٹپکی پھپکی کی طرح ترپ رہی تھی۔ اس کی صاف و شفاف رنگت میں ہلکی سی ایلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔

”مالا مجھے بچالو، میں مرنا نہیں چاہتی۔“ وہ کراتے ہوئے بولی، سانپ نے اپنے دانت لکشمی کے پاؤں پر گاڑ دیئے تھے متاثرہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ تکلیف اور درد کی شدت سے لکشمی کے حسین چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ زخم کے ارد گرد کی جلد کا رنگ تبدیل ہونا شروع ہو چکا تھا۔ مالا مدد کے لئے چیخ چلا رہی تھی۔ اس کی عزیز جان سہیلی اس کی نگاہوں کے سامنے موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ وہ بے بسی سے چیختے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ”لکشمی ہوش میں آؤ، جیتنے جیتنے بے ہوش ہوتی ہوئی لکشمی کو مالا نے جھنجھوڑا۔

اسی وقت نہر کے دوسرے کنارے پر درمیانی قد و قامت کا ایک نوجوان نمودار ہوا شاید اس نے مالا کی چیخ دیکارن کی تھی۔ نوجوان نے نہر میں چھلانگ لگا دی اور تیزی سے تیر کر ان تک جا پہنچا۔ ”کیا ہوا انیس! اس نے مالا سے پوچھا۔

اسی لمحے اس کی نظر لکشمی کے ٹخنے کے قریب زخم پر پڑی۔ اس نے چونک کر لکشمی کی زہر سے نیلی پڑتی

جلد دیکھی۔“ اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے وہ بڑبڑائی۔ اس نے زخم سے کپڑا سرکایا۔

”کوئی رسی یا کپڑے کا ٹکڑا دینا جلدی۔“ مالا نے اپنے دوپٹے سے ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اسے دیا۔ نوجوان نے کپڑے کا ٹکڑا اس کی زخم سے اوپر باندھا۔ اور پھر اس کے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

وہ پوری قوت سے زہر چوس کر ایک طرف تھوکتا چلا گیا۔ خون سے نوجوان کے ہونٹ تھوڑے پچکے تھے۔ جب زخم سے نکلنے والا زہر ختم ہو گیا تو اس نے نہر کے پانی سے منہ ہاتھ دھو یا کھلی کی اور دوبارہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ لکشمی غنودگی میں تھی، وہ بغور لکشمی کو دیکھنے لگا اس کا سانپے میں ڈھلا جسم قیامت ڈھارہا تھا۔ وہ اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب یہ خطرے سے باہر ہیں، پھر بھی طبی امداد ضروری ہے۔ آئیے آپ لوگوں کو گھر پہنچا دوں۔“

اس نے لکشمی کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ اب وہ دونوں حویلی کی طرف چلنے لگے۔ لکشمی کے جوان جسم سے نوجوان کو تپش محسوس ہو رہی تھی۔ اس تپش سے اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔ مالا چلتی ہوئی اسے راستہ بتاتی جا رہی تھی۔ ”آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہی تھیں؟“ نوجوان نے چلتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس گاؤں کے ٹھاکر بھگوان واس کی بیٹی مالا ہوں۔ اور یہ میری سہیلی لکشمی ہے۔ ہمیں میری بہن کی سگائی میں آئی ہے۔ ہم گاؤں کی سیر کرتے ہوئے اس نہر کے کنارے آئے ہی تھے کہ اسے سانپ نے ڈس لیا وہ تو بھگوان کی کرپاسے آپ پہنچ گئے۔ آپ کون ہیں کیا آپ سپیرا ہیں؟“ مالا نے پوچھا۔

میرا نام سلمان ہے میں نہر کی دوسری طرف والے گاؤں روپ نگر میں رہتا ہوں، میں سپیرا نہیں ڈاکٹر ہوں۔“

”آپ شکل سے دیہاتی نہیں لگتے۔“ مالا بولی۔

”پہلے ہم ہمیں کی ایک ہمساندہ بستی میں رہتے

تھے۔ والدین کے فوت ہونے کے بعد تعلیم مکمل کر کے میں گاؤں آ گیا۔ یہاں میرے ماموں رہتے ہیں۔ بسنی کے ایک ہسپتال میں جاب کرتا ہوں۔ ان دنوں چھٹیوں پر گاؤں آیا ہوا ہوں۔“ باتوں باتوں میں وہ حویلی کے قریب پہنچ گئے۔

لکشی اب ہوش میں آ رہی تھی۔ اس نے کسماسا شروع کر دیا۔ مالا کے اشارے پر سلمان نے لکشی کو نیچے اتارا۔ لکشی ہوش میں آ چکی تھی۔ مالا نے لکشی کو سہارا دیا۔ وہ سہارے کے باوجود لڑکھا کر چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد تینوں حویلی میں تھے۔ لکشی کی حالت دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ فوراً ہی گاؤں کے چھوٹے سے اسپتال سے ڈاکٹر بلوایا گیا۔ طبی امداد کے کچھ گھنٹوں بعد لکشی مکمل ہوش میں آ چکی تھی۔ اس افراقی میں سلمان کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ مالا کے بتانے پر کہ سلمان نے لکشی کی جان بچائی تھی اس کی تلاش شروع ہوئی پھر وہ افراقی میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ لکشی کو اس سے نہ ملنے کا ملال تھا۔ وہ اپنے شخص کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

مالا کی بہن کی رگائی کے بعد لکشی واپس بسنی چلی گئی۔

کچھ روز بعد ایک دن مالا اور لکشی کالج سے لوٹ رہی تھیں۔ گاڑی ان کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اچانک مالا نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ لکشی گاڑی روکتے ہی بولی۔ ”ایک منٹ نیچے تو اترو۔“

مالا لکشی کا ہاتھ پکڑ کر لینڈ کروزر سے نیچے اتری۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر درمیانے قد و قامت کا گندی رنگت کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ مالا لکشی کو لے ہوئے اس کے قریب جا پہنچی۔ ”نستے! سلمان صاحب کیسے ہیں آپ؟“ مالا پہنچی۔

”اوہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ ”آپ کو بتانا تھا کہ ہم بسنی کے ایک کالج میں پڑھتی ہیں، لگتا ہے آپ کی یادداشت میں کوئی بڑا گڑبڑ

گھونٹا ہے۔“ مالا شوخی سے بولی اور سلمان ہنس دیا۔ لکشی پسندیدہ نگاہوں سے سلمان کو دیکھ رہی تھی۔ ”کہیں پرنگا نہیں کہیں پر نشاندہ۔“ مالا بھی تو اس کے ہنسنے سے لکشی جھینپ گئی۔

”اچھا ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ آپ اپنی اس مریضہ کے علاوہ دوسرے مریضوں کا کس ہسپتال میں علاج کرتے ہیں۔“ مالا نے اسے چھیڑا۔

”میں بسیں ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کرتا ہوں۔ اوہ! میری بس آ گئی۔“ سامنے سے اپنے روٹ کی بس آتے دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امداد بھی میسر آ گئی۔ مالا کی شرارتوں نے اسے بولکھلا دیا تھا۔ اس کے بعد تین چار بار لکشی اور سلمان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شاید تقدیر انہیں ایک دوسرے کے قریب لاری تھی۔

چند ہی ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ اگرچہ ان دونوں کے مذہب مختلف تھے مگر عشق وہ مرض ہے جو لاعلاج ہے، یہ نہ مذہب دیکھتا ہے اور نہ ذات پات۔ وہ دونوں ہر دوسرے تیسرے دن ملنے لگے۔ بھی کسی پارک میں ملتے، کبھی ساحل سمندر پر ملتے اور کبھی کسی ہوٹل میں ملتے۔ لکشی نے سلمان کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا بلا خراک دن ان کی ملاقاتیں رنگ لائیں اس دوران دونوں نے ایک ریٹورنٹ میں ملاقات کی۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے ہی باہر نکلے لکشی کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک شاندار گاڑی سے اس کا بھائی ستیش اپنے گاڑی ڈرائیور کے ساتھ اتر رہا تھا۔ لکشی ایک طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی، وہ دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھا کر رہی تھی کہ ستیش کی نظر اس پر نہ پڑے لیکن ستیش اسے دیکھ چکا تھا۔ ایک اجنبی کے ساتھ لکشی کو دیکھ کر اس کے سینے میں آتش اشتیاق بڑھنے لگی۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ اگلے ہی لمحے اس کا زوردار تھپہر لکشی کے چہرے پر پڑا۔ لکشی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھا کر گر گئی۔ لکشی تو سلمان نے اسے تھام لیا۔ ستیش کا پارہ

مزید چڑھ گیا اس نے لکشی کا ہاتھ پکڑا اور زوردار فرنٹ سکس سلمان کے سینے پر ماری تو وہ اچھل کر پشت کے بل گرا۔ ”بھئی یہ سلمان ہے۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔“ لکشی نے چیختے ہوئے کہا۔

”جان بچانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم چھپ کر اس سے ملو، یہ ملے ہوئے ہی ملے ہیں۔ گویا اسے اس کی گستاخی کا سبق سکھاؤ تاکہ یہ پھر بھی کسی ہندو تباری کی طرف دیکھنے کے لائق نہ رہے۔“ ستیش سانپ کی طرح پھنکارا اور لکشی کو گھیسٹ کر گاڑی کے قریب لے آیا۔

گویا لکشی وحشی جانور کی طرح سلمان پر پل بڑا۔ چند ہی منٹ میں سلمان کو اپنے جسم پر بہت سے گھونٹے لگا دیے۔ ساتیس سہنا پڑیں وہ بری طرح گویاں کے ہاتھوں سے مار کھاتا تھا۔

سلمان لڑائی جھڑائی سے ناواقف شریف انسان تھا۔ اس لئے بغیر کسی مزاحمت کے گویاں سے مار کھاتا تھا۔ لکشی چیخ چیخ کر اسے چھوڑ دینے کا کہہ رہی تھی۔ گویاں اس کی چیخ دیکار سے بے نیاز سلمان کی حرمت کر رہا تھا۔ اور گرد و بہت سے لوگ موجود تھے۔ جو خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ گویاں کا ہاتھ روکنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ سب جانتے تھے کہ گویاں ارجن کا غنڈہ ہے۔ اس کے سامنے آنے کا مطلب موت کے منہ میں جانا تھا۔

سلمان کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم چوٹوں کی وجہ سے بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے سینے پر فرنٹ لک لگی تو نیچے گرتے ہی گویاں اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ گویاں نے اپنی پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکالا اور سرے بلند کر دیا۔ سلمان کا دل خوف کی شدت سے زور زور سے دھڑکنے لگا، ڈر کے مارے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور گم بڑھنے لگا۔ اب کسی بھی لمحے گویاں کے خنجر دالے ہاتھ نے نیچے آتا تھا اور اس نے موت کی

واہی میں اتر جاتا تھا خوف سے اس کا پورا جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اور پھر گویاں کا خنجر دالا ہاتھ نیچے آنے لگا۔

☆.....☆.....☆

مہندر اوجیز عمر کا عامی شکل و صورت کا انسان تھا۔ وہ لمبا چوڑا اور گراٹھیل شخص تھا اس کے گھر سے سانولے چہرے پر بڑی بڑی کھٹی موٹھیں اسے اور بھی خوفناک بناتی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر تک گلیوں میں آوارہ گھومتا رہا۔ باپ مر گیا تو اس نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ لہذا اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ارجن کے گروہ میں شامل ہو کر غنڈا گردی شروع کر دی۔ مہندر کے خیالات اپنے پاس ارجن سے ملتے جلتے تھے ان دونوں میں بس اتنا فرق تھا کہ ارجن اب تک دوشادیاں کر چکا تھا جبکہ مہندر ہنوز غیر شادی شدہ تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جو کہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ اس میں صرف دو کمرے تھے۔ چونکہ وہ تنہا رہتا تھا وہ اپارٹمنٹ کافی مینگے اور پرسکون علاقے میں تھا۔ آنے جانے کیلئے اس کے پاس نئے ماڈل کی شاندار کار تھی۔

اس وقت رات کے دس بجے وہ ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگ کر اپنے فلیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مقتول کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے منشیات کے اڈے کے بارے میں اعلیٰ افسران کو اطلاع کر دی تھی بے جا مقتول یہ نہیں جانتا تھا کہ ہر ملک کے محکمہ پولیس میں چند ایسی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں جو رشوت کی ہڈی کھا کر بچرموں کا ساتھ دیتی ہیں ان ہی کالی بھیڑیوں میں ایک ایسی پی پاٹھ، ارجن کا منگ حلال تھا SP پاٹھ نے مقتول کی اس حرکت کی ارجن کو خبر کر دی چنانچہ منشیات کا وہ اڈہ وہاں سے شفٹ کر دیا گیا اور مہندر نے ارجن کے حکم پر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مہندر نے گاڑی پارکنگ میں پارک کی اور سیر ہیاں چڑھ کر اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر جا پہنچا۔ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول کر اندر





درد نے مجھے پیدا ہوتے ہی جھاڑیوں میں پھنکوا دیا تھا۔ جہاں سے سلمان کے والد نے مجھے اٹھایا۔

راجہ اپنی کہانی شروع سے لکشی کو سنائی۔ ”اس کا مطلب ہے آپ سے میرا خون کا رشتہ ہے، آپ میرے بھائی ہیں مگر بتائیے ایسا کیوں کیا؟“ لکشی بولی۔

”وہ اس لئے کہ میرا تعلق تیسری جنس سے ہے، اسی گناہ کی سزا ارجن نے میری ماں کو بھی دی، تم ارجن کی بیٹی ہو؟“ راجہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

”ہاں وہ میرے پتا ہیں اور جس نے آپ پر کوئی چلائی وہ میرے بڑے بھائی ستیش ہیں، اب ہم تینوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں پتا جی اور بھیا کا یہاں پر بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ دونوں بہت ظالم ہیں، ہر اداؤں کی ریت بڑے مندر میں مہا گرو رام پرشاد کے ساتھ مل کر انسانی زندگی کی بلی دیتے ہیں مہا گرو بڑے ہتھی شالی ہیں۔ ان کی نظروں سے بچنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔“ لکشی کے لہجے میں خوف تھا۔

”اللہ سب سے بڑا ہے، نمرود کو ایک کانا چھمر نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ تم دیکھ لیتا ارجن کی موت مجھ جیسے معمولی انسان کے ہاتھوں ہی ہوگی، میں تم دونوں کو بابائی کے آستانے پر چھوڑ آتا ہوں وہاں پہنچنا کسی بھی شیطانی طاقت کے لئے ناممکن ہے۔ اس کے بعد ارجن کے ظلم کا خاتمہ کر دوں گا۔“ راجہ کے لہجے میں چٹانوں کا سائز تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ تینوں فلیٹ سے باہر نکلے۔ لکشی نے برج پہننا ہوا تھا جو راجہ بازار سے خرید لیا تھا۔ جبکہ راجہ دونوں کو بابائی کے آستانے پر پہنچا کر بابا سے اجازت لے کر دوبارہ شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ آج انہیں یہاں آئے ہوئے دوسرا روز تھا وہ غار سے باہر پہاڑ پر گھوم رہے تھے کہ اچانک لکشی کا دم گھٹنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا گلا بادرہا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کے

کانوں میں سرگوشی کی سی صورت میں ایک بھاری آواز گونجنے لگی۔

”لکشی آؤ اپنے اصل کی طرف یہ سب فریب ہے۔“ پھر اس کے کانوں سے سچن کی آواز گرانے لگی۔ وہ یوں جھومتی ہوئی پہاڑ سے نیچے اترنے لگی جیسے نشے میں ہو۔ سلمان جو کہ اس کے قریب موجود تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر چونک پڑا۔ لکشی کی آنکھیں بند تھیں وہ جیسے نیند میں چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ”لکشی رکو سلمان نے لکشی کو پکڑنا چاہا کسی ناویدہ قوت نے اس کو زوردار دھکے دیا۔ وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔ اسی لمحے ان کے سامنے ایک پہیڑ سا نمودار ہوا۔ جس نے کئی فٹ لمبے قوی پہلے خوفناک شخص کی شکل اختیار کر لی۔ وہ یہاں کا ٹران جن تھا جن نے انگلی سے لکشی کی طرف اشارہ کیا تو لکشی لہرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ جن نے آگے بڑھ کر لکشی کو اٹھالیا۔ ”چلو بابا کے غار کی طرف۔“ وہ گونجی آواز میں سلمان سے مخاطب ہوا۔

اگر راجہ اسے یہاں کے بارے میں تفصیل سے نہ بتا چکا ہوتا تو وہ جن کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتا، اب وہ جن کے پیچھے چلا ہوا خوف سے لرز رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ غار میں بابائی کے سامنے موجود تھے۔ بابائی نے کچھ پڑھ کر لکشی پر چھوٹا تو لکشی ہوش میں آ گئی، بابا کے اشارے پر جن غائب ہو گیا۔ ”بابا میں یہاں کیسے آ گئی ہم تو باہر گھوم رہے تھے؟“ لکشی نے پریشانی سے کہا۔ اسی وقت غار میں تیز ہوا کی چلنے لگیوں لگ رہا تھا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ لکشی کی کیفیت دوبارہ بدلنے لگی۔

بابا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، وہ کچھ پڑھنے لگے۔ انہوں نے لکشی اور سلمان کے گرد حصار باندھا۔ ”تو نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی چلا جا اپنا ناپاک وجود لے کر دروازہ جل جائے گا۔“ وہ غصے سے کسی ناویدہ قوت سے مخاطب تھے ہواؤں کے جھکڑ بدستور چل رہے تھے۔

اسی لمحے غار میں ایک بھاری آواز گونجنے لگی

”ابنی بھئی (کچھ عقل) سے کام لے بڑھا۔ اس ناری کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ تیرے اس اپراؤ۔“ سے میرے اور تیرے درمیان ایک یدھ کا آغاز ہوگا۔ میں اب بھی تجھے شکر سکھائوں۔“ بابائی نے اپنے پاس سے ایک پتھر اٹھا کر غار کے دہانے کی طرف پھینکا تو فوراً ہی بہت سی خوفناک چیخیں سنائی دیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

”بابا یہ سب کیا تھا؟“ سلمان نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ رام پرشاد کے پیچھے ہوئے پیر تھے جو مل کر بھسم ہو چکے ہیں۔“ بابا مطمئن لہجے میں بولے۔

کچھ دن میں ہی لکشی کے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی اس نے دین اسلام کی سچائی جان لی تھی، اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تھا اس کا اسلامی نام مریم رکھا گیا۔ بابا نے سلمان اور مریم دونوں کا نکاح بھی پڑھا دیا تھا۔

ارجن کی کونھی کے ایک کمرے میں ارجن، ستیش اور مہا گرو موجود تھے۔ ”بتائیے اگر درمیان میں وہ انجمنی نو جوان نہ آتا تو میں اور گویاں اس لڑکے کی ہتھیا کر ڈالتے مگر وہ اچانک ہمارے درمیان آ گیا تھا، گویاں مارا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ وہ میری غلطی سے لکشی کو لے کر فرار ہو گئے۔“ ستیش نے کہا۔

”تم لوگوں سے پر تو ایک بھول ہو گئی مجھے دیر سے اطلاع دی اس سے تک لکشی تو رانی نکلتی والے تک پہنچ چکی تھی۔ میری خطایہ ہے کہ میں نے اسے معمولی سمجھ کر کم ہمتی والے پیر پیچھے جنہیں اس مسئلے نے جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اب اسے چھوڑوں گا نہیں، ہمارے چچ ایک یدھ کا آغاز ہو چکا ہے۔ تم لوگ ماتا کے چٹوں میں بیٹی چڑھانے کا انتظام کرو تا کہ میں بھر پور داراں بڑھے پر کروں۔“ مہا گرو نے کہا۔

اچانک ارجن کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی ارجن نے کال ریسیو کی، ”ارجن صاحب غضب ہو گیا کسی نے ہماری فیکٹری کو بم سے اڑا دیا ہے۔ اور اناج

## فرمان رب ذوالجلال

اللہ رب العزت نے فرمایا۔۔۔۔۔

اے بنی آدم! میرا حوصلہ تو دیکھ۔۔۔۔۔ جو فرشتے ہر شام میرے پاس تیرے گناہوں کے بنڈل لاتے

جس میں ہر صبح انہی کو تیرے لئے بے شمار رزق دے کر واپس موڑتا ہوں۔ میں تو تجھے ہر گھڑی یاد

رکھتا ہوں کیا تو نے کبھی میرا ذکر کیا۔۔۔۔۔؟

(محمد وارث آصف۔ دال پھراں)

کے کئی گوداموں کو آگ بھی لگا دی ہے۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا کچھ نہیں بچا۔ آج ہفتہ وار جمعی تھی اس لئے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔“ دوسری طرف ارجن کا فیکٹری منجر شرماتا۔

ارجن کے اوسان خطا ہو گئے۔ ”ستیش اپنے ساتھ خاص خاص آدمی لے جاؤ اور پتہ کر دو کہ فیکٹری اور اناج کے گودام کس نے تباہ کئے اور بیٹی کیلئے کسی لڑکی کا انتظام بھی کرو کل امادس کی رات ہے۔“ ارجن نے ستیش کو ہدایات دیں۔ ستیش فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسی وقت ارجن کا موبائل فون دوبارہ بجا۔ ”ہیلو ارجن بول رہا ہوں۔“

”جتنا بولنا ہے بول لو، پھر تمہیں بولنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ کیونکہ تم اس قاتل بھی نہیں رہو گے کہ بول سکو۔ تمہارے سارے جوئے کے اڈے، نشات کا اڈہ، اسلحہ کا اڈہ، تمہارے غٹے بدمعاش اور تمہارا درندہ صفت بیٹا یہ سب ایک جگہ میں ختم ہو جائیں گے اس کے بعد تمہاری باری ہے۔“ دوسری طرف سے انجمنی آواز سنائی دی۔

”کون ہو تم؟“ ارجن نے پوچھا۔

”میرا نام راجہ ہے، تمہاری فیکٹری اور اناج کے گودام میں نے تباہ کئے ہیں۔“ راجہ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون کا ریسیور نیچے رکھ دیا۔

”یہ میرا ایسا کون دمن پیدا ہوا ہے؟ جسے میں نہیں جانتا۔“ ارجن مہارک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اچانک ارجن کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ارجن نے حشیش کا نمبر ملایا۔ ”بھئی مجھے کسی راجہ نامی بندے کا فون آیا ہے جس نے دھمکی دینے کے ساتھ ساتھ فیکٹری اور گودام تباہ کرنے کا اعتراف کیا ہے جس ٹیلیفون نمبر سے کال آئی ہے وہ نمبر بتا رہا ہوں پتہ کرو یہ نمبر کس کا ہے اور کہاں کا ہے؟ اور فوراً ایک کرو۔“ راجہ کا ٹیلی فون نمبر بتانے کے بعد ارجن نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ٹریس ہونے والے فون نمبر کا انڈریس ملتے ہی ارجن کی ہدایت کے بعد راجہ کے ٹھکانے کی طرف وہ لوگ جا رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سائنڈ فلور کے کمرہ نمبر ستر کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ راجہ نے یہیں سے فون کیا تھا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ انہوں نے اپنے ہولسٹرز سے پھل نکال لئے تھے۔ جو گنڈرنے دروازے پر دستک دی۔ قدموں کی چپ دروازے کی طرف آنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولودرند؟“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ جواب میں خاموشی چھائی رہی وہ دوبارہ دستک دینے لگا۔

”کون؟“ اندر سے سنوائی آواز سنائی دی۔ جو گنڈرنے گالیاں بکتے ہوئے دوبارہ دستک دی۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والی لڑکی کو دھکیلتے ہوئے وہ اندر گھس گئے۔ ”کہاں ہے وہ؟“ جو گنڈرنے سامنے کھڑی لڑکی سے سخت لہجے میں پوچھا۔

”آپ کس کا پوچھ رہے ہیں؟“ لڑکی نے اپنے چہرے پر درد پٹیٹ رکھا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں ظاہر تھیں۔ سرخ کلر کا سکی جاپانی سوٹ اس کی کھلتی ہوئی رنگت پر بہت بیچ رہا تھا جو گنڈر اس کی طرف حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے

بولا۔ ”جس نے اس اپارٹمنٹ سے کچھ گھنٹے پہلے فون کیا تھا اس کا پوچھ رہا ہوں۔“

”اُدھم گولی کی بات کر رہے ہو وہ ساتھ والے فلیٹ میں رہتا ہے اس نے میرا فون استعمال کیا تھا وہ کہہ رہا تھا اس کا فون خراب ہے کسی رشتہ دار کو فون کرنا ہے بات کیا ہے کوئی لٹو اٹھو نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔

”چلو باہر ساتھ والے اپارٹمنٹ کی طرف۔“ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ وہ چاروں دروازے کی طرف مڑے اسی لمحے لگا رہن فائر ہوئے اس کے تینوں ساتھی چپختے ہوئے گرے۔ جو گنڈرنے پلٹ کر فائر کرنا چاہا مگر اپنی یہ حسرت دل میں لئے واصل جہنم ہو گیا۔ لڑکی کے پستول سے نکلی ہوئی گولی اس کی پیشانی میں جا گئی تھی۔ ”ریش باہر آ جاؤ راست صاف ہو گیا ہے۔“ راجہ نے آواز لگائی اور پھر پتے سے لباس تبدیل کرنے لگا۔ شکر ہے دروازے پر دستک ہوتے ہی تم نے سمجھ لیا کہ دشمن سر پہنچ چکے ہیں اور مجھے ہاتھ روم میں چھپا کر رہا ہے۔ کپڑے پہن لئے۔ اور یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ ردپا کے چند جوڑے میری الماری میں پڑے تھے۔ ریش ہاتھ روم سے باہر آتے ہی ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

”جلدی سے بھاگو کسی بھی لمحے پولیس یا ان کے ساتھی یہاں آ سکتے ہیں۔“ راجہ نے کہا اور وہ دونوں تیزی سے باہر نکلے۔ فلیٹ مکین اپنے اپنے دروازوں سے سر نکال کر جائزہ لے رہے تھے کہ فائرنگ کا سبب کیا ہے۔ ڈر کے مارے باہر آنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ وہ دونوں میڑھیاں اترتے ہوئے باہر جا پہنچے باہر بھی چند افراد خوف زدہ کھڑے تھے۔

راجہ نے جواب دیا اور ریش کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اچانک ایک لینڈ کرڈز ران کے قریب آ کر رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے تین راقفل بردار ان کی طرف راکٹیں تان چکے تھے۔ ”بغیر کوئی حرکت کئے چپ چاپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔“ ان میں سے ایک سرد لہجے میں بولا۔ راجہ نے اندازہ لگایا کہ

حراست کا کوئی فائدہ نہیں۔ تینوں راقفل بردار چونکا تھے ڈرامی غلط حرکت انہیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ وہ دونوں لینڈ کرڈز کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ اندر بیٹھے ہی انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ڈرائیور کے برابر اگلی سیٹ پر حشیش بیٹھا تھا۔ راقفل بردار ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی حشیش نے راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”آج میڈر پھنس ہی گیا آخر، تو کیا سمجھتا تھا کہ ہم تیرا کھوج نہیں لگا سکتے۔“

راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان دونوں کی تلاشی نہیں کی گئی تھی اس کا رپوالور اس کے لباس میں موجود تھا راجہ کسی ایسے موقع کی تلاش تھی جب وہ بساط کا رخ پلٹ سکے۔

”میڈر کی اولاد تیرے جرموں میں جو گنڈر اور اس کے ساتھیوں کی ہتھیابھی شامل ہوگئی ہے۔ اب بزدلوں کی طرح خاموش کیوں بیٹھا ہے۔“ پیچھے بیٹھے ایک راقفل بردار نے حقارت سے کہا۔ راجہ چپ رہا۔ آدھا گھنٹہ تیز رفتاری سے چلنے کے بعد گاڑی کی رفتار دم ہوئی۔ پرسیدھے ہاتھ پر مڑنے کے بعد ایک شاندار قسم کی کوٹھی کے گیٹ پر جا کر، کوٹھی کا گیٹ کھلا اور لینڈ کرڈز کے اندر داخل ہونے کے بعد دوبارہ بند کر دیا گیا، لینڈ کرڈز کے رکتے ہی ان دونوں کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکالا گیا۔ ”انہیں اندر لے جانے سے پیشتر ان کی تلاشی لے لو۔“ حشیش نے کہا۔ اس کے حکم تعمیل کی گئی۔ راجہ کے لباس سے رپوالور نکلا جو ایک راقفل بردار نے اپنے قبضے میں لے لیا وہ راقفلوں کی زد میں کو ریڈر سے ہوتے ہوئے ایک شاندار قسم کے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ یہاں ہر چیز پیش قیامت اور ایپورنڈ تھی۔ قالین پر دے فانوس ڈیکوریشن نہیں سب کچھ بہترین تھا۔ ایک طرف قیمتی صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ جس پر ارجن تن کر بیٹھا تھا۔ پتائی یہی ہمارا دشمن ہے جس نے آپ کو فون کیا تھا۔“ حشیش بولا۔

”لکشمی اور سامان کہاں ہیں اور تیری ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ ارجن صوفے سے اٹھتے ہوئے غصے سے بولا۔

”یہ سب اپنے مہارگ سے پوچھو بقول تم لوگوں کے وہ بہت بڑا ہتھی شالی ہے۔“ راجہ طنز سے بولا۔

”یہ جو تمہاری زبان راکٹ کی طرح چل رہی ہے کچھ دیر بعد بلا بھی نہ سکوں گے۔ یہاں ہم بہت ہیں اور تم صرف دو۔“ ارجن سخت لہجے میں بولا۔

”سوکتے مل کر بھی ایک شیر کا شکار نہیں کر سکتے۔“ راجہ ہنسا۔

”انہیں کمرہ نقیشت میں لے چلو۔“ ارجن غرایا۔ وہ انہیں دھکیلتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں سوائے لوہے کی ایک کرسی کے اور کوئی سامان نہیں تھا۔ لیکن دیواروں پر اذیت رسانی کے آلات نظر آ رہے تھے۔ ریش کلوہے کی کرسی پر بیٹھا کر مضبوطی سے رسی سے باندھ دیا گیا۔ لوہے کی وہ کرسی زمین میں فکس تھی چھت پر دو زنجیریں لگ رہی تھیں۔ جن کے آخری سرے پر لوہے کے مضبوط کڑے جھول رہے تھے۔ راجہ کوان زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ حشیش نے دیوار سے لٹکا مضبوط چمڑے کا بیلٹ اتارا اور راجہ پر برساتا شروع کر دیا۔ راجہ کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بیلٹ کی ہر ضرب پر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے بدن سے کھال اتر رہی ہے وہ دانت کھینچتے برداشت کرتا رہا۔ زندگی نے اسے اتنے ذمہ اور غم دیئے تھے کہ ہر ذمہ اسے چھوٹا لگتا تھا۔ ”بول کون ہے تو؟“ تیری ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ حشیش اسے مارتے ہوئے ایک ہی سوال کئے جا رہا تھا۔

راجہ کے زخموں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا تکلیف کی شدت سے اس کا پورا بدن دکھ رہا تھا۔ بہت سخت جان ہے یہ۔“ حشیش جھک کر پیچھے ہٹا۔ اب اسے مارنے کا فریضہ ارجن ادا کر رہا تھا۔ اس کی لائیں اور گھونے راجہ کے جسم پر برس رہے تھے اور راجہ سینڈ بیگ کی طرح ادھر ادھر جھول رہا تھا کچھ دیر بعد



ہو گیا تھا۔

اسی لئے ارجن کا موبائل فون بجاس اس نے کال ریسیو کی۔ ”ارجن آج اماں کی رات ہے اس سے پہلے کہ سے بیت جائے دہلی کا انتقام کر کے جلدی آؤ۔“ دوسری طرف مہاگر دھما۔

”مہاراج لڑکی دم نے پرسوں ہی اغوا کر لی تھی۔ ضروری کام میں مصروف تھے ابھی آرہے ہیں۔“ ارجن بولا۔ ”لڑکی کو تہہ خانے سے نکالو اور راجہ کو نیچے اتار کر باندھ دو واپس آ کر اس کا ریشم سے بھی بدتر حشر کریں گے جگ جیت سے کہو ریشم کی لاش کو برقی بجھتی میں جلا دے۔“ ارجن نے ہدایات دیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

راجہ کو ہوش آیا تو وہ فرش پر بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ ریشم کی لاش غائب تھی۔ راجہ نے سوچا کہ اب تک تو وہ زندہ بچا ہے مگر نہ جانے کب وہ درندے اس کے موت کے گھاٹ اتار دیں بے بسی سے مرنے سے بہتر ہے کوشش کر کے بھاگ نکلے یا مرنے سے پہلے وہ زور لگا کر ہاتھوں کی بندش ڈھیل کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی کوشش سے رسی ڈھیل پڑنے لگی۔ یہ اور بات ہے اس کی کلائی پھل کر ڈھبی ہو چکی تھی اس نے اپنے ہاتھ آزاد کئے۔ اس کے بعد پاؤں پر بندھی رسی کھولی۔ اسی سے آزاد ہوئے ہی اٹھنے کی کوشش کی اور بمشکل کھڑا ہوا یا اس کے زخموں سے درد کی غمیں اٹھ رہی تھیں۔ غلاموں نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا تھا۔ چند منٹ تک وہ کمرے میں ٹھہرا رہا۔

اچانک دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس نے دروازے کے ساتھ دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور کندھے سے رائفل نکلتے ایک شخص اندر داخل ہوا اس کے انداز میں لاپرواہی تھی اس کے دیم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بری طرح زخمی بندھا ہوا ان کا قیدی آزاد ہو چکا ہے اندر آتے ہی اس کی نظر کمرے کے خالی فرش پر پڑی تو وہ بوکھلا گیا

مارکھاتے کھاتے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بدن پر پانی پھینک کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ ”راجہ اب تیرے دوست کی باری ہے۔ اسے مارکھاتا دیکھ کر ادر تو جتے ہوئے مرنا دیکھ کر تیرا دل تڑپے گا۔“

ستیش نے کہا اور ریشم کی طرف بڑھا۔ اس نے ریشم کے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے پلاس کی مدد سے ناخن جڑ سے اکھاڑ دیا۔ کمرہ ریشم کی پچیوں سے گونج اٹھا۔ ”کیسے چھوڑ دے اسے۔“ راجہ چلایا۔ فوراً ہی ریشم کا دوسرا ناخن بھی جڑ سے اکھاڑ لیا گیا۔ ریشم ایک بار پھر چیخا اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ”کتے چھوڑ دے اسے تیری دشمنی مجھ سے ہے جو کرنا ہے میرے ساتھ کر۔“ راجہ چیختے ہوئے بولا۔

”تکلیف ہو رہی ہے نا، میرے آدمیوں کے مرنے سے مجھے بھی تکلیف ہو گئی تھی میرا سب کچھ تو نے تباہ کر ڈالا۔ یہ سالا ہندو ہو کر بھی مسلمان کا ساتھ دیتا ہے۔ اسے تو عبرتناک موت ماروں گا۔“ ارجن کے لہجے میں درندگی تھی۔

ستیش نے خنجر اٹھایا اگلے لمحہ بہت ہی بھیاں کھتا تھا اس نے خنجر دھار خنجر کی نوک سے ریشم کی بائیں آنکھ کا ڈھیلا نکل دیا۔ ریشم ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح چیختے لگا ادر راجہ چیختے ہوئے انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کے بعد ستیش نے ریشم کا پایاں کان جڑ سے کاٹ ڈالا ریشم چیختے ہوئے وردکی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ ارجن دیوار کی طرف بڑھا اور ہتھوڑا اٹھا کر ستیش کو تھما دیا۔ ستیش کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور ہتھوڑا ریشم کے دائیں گھٹنے پر پوری قوت سے پڑا۔ ریشم بہت زور سے چیخا اب اس پر جانکی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ یہی عمل اس کے دائیں گھٹنے پر دہرایا گیا۔ ستیش وحشیوں کی طرح ہتھوڑے سے ریشم کی ہڈیاں توڑتا رہا۔ ریشم کی گروں ڈھلک چکی تھی۔ اس کے مرنے کے باوجود ستیش ہتھوڑے برساتا رہا۔ ادر ارجن نے دوبارہ راجہ کو پٹینا شروع کر دیا کچھ دیر بعد راجہ مارکھاتے کھاتے بے ہوش

اور کندھے پر موجود رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا اس کی کٹپٹی برزور دار گھونٹہ لگا اس کا دماغ چکرانے لگا راجہ وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑا کچھ ہی دیر میں وہ فرش پر پڑا کر ادر ہاتھ۔ اور رائفل راجہ کے ہاتھ میں تھی۔ جس کی نال کا رخ اس کی طرف اور رائفل ٹریگر پر تھی۔ ”میرے پاس وقت بالکل نہیں میرے چند سوالوں کا بج جج جواب دو میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا ورنہ بتانا خیر کئے کوئی مار دوں گا۔“ ارجن اور ستیش کہاں ہیں؟ ”راجہ سانس کی طرح بھکا رہا اس شخص نے راجہ کی طرف دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اگر راجہ کی بات نہ مانی تو وہ اپنے کبے پر فوری عمل کرے گا۔

”ارجن صاحب ستیش کے ساتھ بلی چڑھانے گئے ہیں۔“ ”کونسی میں اس وقت کتنے آدی ہیں؟“ راجہ نے پوچھا۔

”مجھ سمیت دس افراد ہیں۔“ وہ شخص بولا۔ ”ارجن کے اسلحہ کا گودام کس کونسی کے تہہ خانے میں ہے جھوٹ مت بولنا میں مہندر سے سب معلوم کر چکا ہوں۔ دم سے صرف تصدیق کر رہا ہوں۔“ راجہ نے کہا۔

اسی کونسی کے تہہ خانے میں گودام ہے۔“ وہ تھوک نکلے ہوئے خوف سے بولا۔ ”چلو آج مجھے تہہ خانے تک لے چلو۔“ راجہ نے اسے دھکیلا۔ رائفل کی نال اس کی پشت سے لگی تھی۔ وہ کوریڈور میں چلتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے راجہ اس کی طرف سے محتاط تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر ارجن کے غنڈے نے ایک طرف رکھی الماری کا پت کھولا۔ یہ دیوار گیر الماری تھی۔ الماری کے دائیں طرف ایک جگہ ابھری ہوئی تھی اس نے ابھری ہوئی جگہ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو الماری دیوار سمیت سرک گئی اب وہاں میز حیاں موجود تھیں میز حیاں اتر کر نیچے جانے لگے۔ راجہ اس کی پشت سے رائفل کی نال لگاتے چوکنے انداز میں چل رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جس میں

جگہ جگہ بڑی بڑی لکڑی کی بیٹیاں رکھی تھیں جن کی تعداد سینکڑوں میں تھی اچانک راجہ نے رائفل کا دستہ اس کے سر پر مارا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

راجہ نے ایک بیٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا رائفل کی نال سے زور لگا کر بیٹی کھول اس بیٹی میں جدید قسم کی مشین گنیں تھیں راجہ نے آٹھ دس بیٹیاں کھولی کر دیکھیں وہاں ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا مشین گنیں جدید طرز کی رائفلیں، پیسٹل، دناٹم بم، راجہ نے ایک بیٹی سے دو دناٹم بم نکالے پندرہ منٹ کا وقت فکس کیا۔ اور تہہ خانے سے باہر نکلا آیا داب اس کا رخ کونسی کی عقبی سمت کی طرف تھا رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی ایک طرف دو افراد کرسیوں پر بیٹھے اگٹھ رہے تھے راجہ کی طرف ان کی پشت تھی راجہ دھیرے دھیرے دے قدموں چلتا ہوا عقبی دیوار کے قریب پہنچا ادر ادر دیکھا کوئی نہیں تھا وہ دیوار پھلانگ کر کونسی سے باہر نکلا اور تیزی سے چلتے ہوئے کونسی سے دور جانے لگا پھر کچھ دیر بعد پے در پے دھاکوں کی آواز سے زمین لرز اٹھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”ہمیں پہاڑی والے بابا سے ملنا ہے۔“ وہ پانچ افراد تھے جن میں سے دو افراد کا ہیرا شانسل اور باڈی لینکونج اور ان کے یو نیفارم واضح طور پر اعلان کر رہے تھے کہ انکا تعلق قانون نافذ کرنے والے ادارے سے ہے۔ ایک SP ریک کا افرٹیل اور دوسرا ڈی ایس پی ورا تھا۔ ان کے ساتھ ارجن ستیش اور کالی کا پجاری تھے عمار کے دہانے پر مگر اب شخص کھڑا تھا۔ ایس پی اس سے مخاطب تھا۔ سہہ پیر کا وقت تھا پہاڑ پر سینکڑوں کی تعداد میں عقیدت مند جمع تھے۔ باباجی کی عقیدت مندوں میں ہر مذہب کے ماننے والے شامل تھے وہ کسی سے کسی قسم کا نذرانہ نہیں لینے تھے اگر کوئی اس معاملے میں ضد کرتا تو باباجی ناراض ہو جاتے تھے۔

باباجی کے پاس اس وقت ایک مریض ہے۔ جیسے ہی وہ باہر آتا ہے میں اجازت لے کر آپ

کو اندر بھیجتا ہوں۔ مگر اس شخص بولا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کن رسیدہ شخص غار سے باہر نکلا۔ اس کے باہر آتے ہی مگر اس شخص غار کے اندر گیا تھوڑی دیر بعد باہر نکلا۔ ”آپ میں سے تین افراد اندر چلے جائیں دو باہر رک جائیں۔ امید ہے آپ میری بات کا برا نہیں منائیں گے۔“ مگر اس شخص بولا۔ SP ٹیکل اس کے اخلاق سے متاثر ہوا اور اثبات میں سر ہلا کر ارجن اور سٹیش کے ہمراہ غار میں داخل ہوا۔ SP ٹیکل اگرچہ راشی پولیس افسر تھا اس کے باوجود بزرگوں اور علماء کرام کا احترام کرتا تھا غار میں ایک طرف چٹائی پر بابائی بیٹھے تھے ان کے ہاتھ میں تسبیح اور چہرے پر نور تھا۔

”ارجن صاحب کا کہنا ہے کہ کوئی مسلمان نای نوجوان ان کی بیٹی کشمی کو اغوا کر کے آپ کے آستانے پر لایا ہے۔ آپ ہم سے تعاون کرتے ہوئے ملزم مسلمان اور کشمی کو ہمارے حوالے کر دیں۔ دوسری صورت میں ہم قانونی کارروائی پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ علاقہ اس وقت پولیس کی بھاری نفری کے گھیرے میں ہے۔ امید ہے آپ قانون سے تعاون کریں گے۔“ ایس پی ٹیکل دھمکے لہجے میں نظریں جھکا کر بات کر رہا تھا۔

”ایس پی ہم قانون کا احترام کرتے ہیں، تم چاہو تو اس پہاڑ کے چپے چپے کی تلاشی لے سکتے ہو کشمی نام کی کوئی بھی لڑکی یہاں موجود نہیں تھا۔“ بابا مسکراتے ہوئے بولے وہ تینوں دیکھ چکے تھے کہ غار میں بابا کے علاوہ کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہیں ہے۔ غار سے باہر آ کر ایس پی نے تلاشی کا حکم دیا۔ پولیس کے جوان پہاڑ پر پھیل گئے وہ تقریباً دو گھنٹوں تک پہاڑ کی تلاشی لیتے رہے مگر کام نہ رہا۔ پولیس کی تلاشی کی وجہ سے عقیدت مندوں میں کافی اشتعال پھیل چکا تھا۔ مگر وہ بابا کے حکم پر خاموش تھے۔ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ تینوں غار میں دوبارہ داخل ہوئے۔ ”بابا ہمارے مطلوبہ افراد یہاں نہیں ملے آپ کو جو ذہنی تکلیف پہنچی اس کی معذرت چاہتا ہوں۔“ ایس پی شائستہ لہجے میں بولا۔

”ایس پی اپنی چونچ بند کر کے تو کھاتا ہمارا ہے اور اس بڑھے کے گاتا ہے۔ بڑھے شرافت سے جتا کشمی کہاں ہے؟ ورنہ میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا۔“ سٹیش نفارت آمیز لہجے میں بولا اور اپنے ہوسٹر سے ہتھول نکال کر بابا پر تان لیا۔

”اگر ہمت ہے تو چلا کوئی۔“ بابا نے غصے سے سٹیش کی طرف دیکھا۔ سٹیش نے ٹریگر دبانے کا بابا۔ مگر سٹیش ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانے سے قاصر تھا۔ اس نے یوں لپکا یا مگر ناکام رہا۔ وہ اپنی جگہ پر پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی پلکیں تنک جھپکنی بند ہو چکی تھیں۔ وہ پتھر کا بت بن چکا تھا۔

اس کا صرف دماغ کام کر رہا تھا۔ باقی جسم پتھر کا بن چکا تھا۔ ارجن کو احساس ہو گیا کہ سٹیش کے ساتھ انہونی ہو چکی ہے۔ اس نے سٹیش کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا سٹیش کا جسم پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا ارجن امداد طلب نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھنے لگا۔ ایس پی نے سٹیش کے بدن کو چھوا تو اس کے مساموں سے پسینہ بہنے لگا۔ سٹیش کو بابا کی شان میں گستاخی کی بہت سخت سزا ملی تھی۔ ایس پی نے بابا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بابا جی اسے شکرا دیجیے یہ آپ کا مقام نہیں جانتا، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آج کے بعد یہاں قدم بھی نہیں رکھیں گے۔“ ایس پی کے معافی مانگنے ہی بابا نے کچھ پڑھ کر سٹیش پر پھونکا تو سٹیش اپنی اصل حالت میں لوٹ آیا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف تھا وہ تینوں خوف زدہ ہو کر تیزی سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس فورس وہاں سے روانہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بابائی نے کچھ پڑھ کر دس سمت پھونک ماری تو مرم اور سلمان ظاہر ہو گئے۔

دوسری طرف راجہ ارجن کی کٹھنی کی عقبی سمت موجود تھا۔ مہندر سے حاصل کی گئی معلومات اس کے بہت کام آ رہی تھیں۔ اپنی پہلے والی کٹھنی کی تباہی کے بعد ارجن اب اس کٹھنی میں رہائش پذیر تھا۔ مہندر سے

حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس کٹھنی کے تہہ خانے میں ارجن نے بھاری مقدار میں نشیات چھپا رکھی تھی راجہ نے اپنے کندھے سے لنگے بیک سے نائیلون کی رسی نکالی اور جھلا کر اونچی دیوار کی سمت پھینکی رسی کے سرے پر موجود آٹکڑا دیوار کے اوپر باندھ گئی خاردار تاریں پھنس گیا وہ رسی کی مدد سے اوپر چڑھ گیا اب وہ خاردار تاروں کے قریب تھا۔ راجہ نے ہاتھوں میں دستانے پہن کر رکھے تھے۔ اس نے احتیاط سے اپنا ایک ہاتھ خاردار تار پر ڈالا۔ دوسرا ہاتھ دیوار پر رکھ کر اوپر ہوا، دیوار پر چڑھنے کے بعد اس نے چند منٹ توقف کیا۔

رات کے دو بج رہے تھے کٹھنی کے گارڈز شاید گیٹ کی سمت کہیں دیکھے ہوئے تھے تمام تاریک احاطے میں کوئی بھی ذی نفس موجود نہ تھا۔ راجہ اطمینان سے بیٹوں کے بل اندر گویا۔ جچی تلی چھلانگ کے نتیجے میں بہت ہی مدھم آواز پیدا ہوئی۔ وہ دبے پاؤں چلا ہوا آگے بڑھا یہاں کمرڈ کی کھڑکیاں جو کہ سلائیڈنگ ونڈوز تھیں۔ راجہ کھڑکیاں چیک کرنے لگا پہلی دوسری اور تیسری تینوں کھڑکیاں اندر سے لاک تھیں آخری چوتھی کھڑکی چیک کرنے پر اس کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا، یہ اندر سے لاک نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے شیشہ ایک طرف سرکایا اور کمرے میں جھانک کر یہ کمرہ تاریک تھا۔ راجہ نے ٹیکل نارنج نکال کر روشن کرنی اور کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ خالی تھا۔ کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا کمرے میں ایک طرف ڈبل بینڈ پڑا تھا کمرے کا دروازہ بند تھا شاید باہر سے لاک تھا راجہ نے اپنی پشت پر موجود بیک اتار ایک کھول کر اس میں سے ایک انتہائی طاقتور ٹائم بم نکالا تیس منٹ کا وقت سیٹ کیا اور ٹائم بم بینڈ کے نیچے رکھے کے بعد بیک دوبارہ پشت سے لٹکا کر کھڑکی کے راستے باہر نکلا۔ اور دبے قدموں عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ کٹھنی سے باہر تھا۔ وہ ایک طرف چل دیا۔ کٹھنی سے کچھ دور جانے کے بعد اس نے کٹھنی پر بندگی کھڑکی پر وقت دیکھا، ہم پھٹنے میں پندرہ منٹ تھے

راجہ نے جیب سے موبائل فون نکالا اور ارجن کا نمبر لایا۔

”کون ہے؟“ دوسری طرف سے ارجن کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ”جاگ ارجن جاگ ورنہ ہمیشہ کی نیند سو جائے گا، جلدی کٹھنی سے بھاگ تیری کٹھنی میں ٹائم بم ہے جو ٹھیک آٹھ منٹ بعد پھٹ جائے گا۔“ راجہ بولا۔

”کک کون ہوں؟“ ارجن گھبرا گیا۔

”میں راجہ ہوں، باتوں میں وقت ضائع مت کر، اب چھ منٹ رہ گئے ہیں۔“ دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا۔ پانچ منٹ بعد بم پھٹ گیا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ راجہ جہاں کھڑا تھا وہاں کی زمین بھی لرز اٹھی۔

سٹیش اس وقت اپنی گرل فرینڈ شیلہ کے اپارٹمنٹ میں موجود تھا وہ ان دنوں ذہنی طور پر بری طرح اپ سیٹ تھا۔ راجہ نے ان کے جوئے کے اڈے نشیات کے اڈے اسلحہ کے گودام فیکٹری بلکہ مہم کچھ ہوں سے اڑا دیا تھا ان کے گروہ کے اہم ترین افراد راجہ کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ ان کا ہر قسم کا غیر قانونی کاروبار ختم ہو چکا تھا، اب ان کے گروہ میں کتنی کے چند افراد باقی بچے تھے۔

”کیا بات ہے سٹیش ڈارلنگ کافی پریشان نظر آ رہے ہو۔“ شیلہ کے گلابی ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی۔ شیلہ نے اس وقت چست لباس پہن رکھا تھا اس کے جسمانی ثقیب و فرار چست لباس سے سر کشی کرتے نظر آ رہے تھے سٹیش کی حریص نظریں شیلہ کے جسم پر پھسلنے لگیں۔ ”کیا الجھن ہے مجھے بھی بتاؤ؟“ وہ چلتی ہوئی سٹیش کے قریب آ گئی۔ ”کچھ نہیں ایک چھوٹی سی پرائیم ہے جو جلد دور ہو جائے گی۔“ شیلہ کے بدن سے اٹھنے والی مہک نے اس کے ذہن سے راجہ کے خوف کو بھگا دیا۔

”براہنڈی کا پیگ تو بتلاؤ۔“ وہ شیلہ سے مخاطب ہوا تو شیلہ گلاس میں براہنڈی لائی اور گلاس اس کے



ہاتھوں میں تھما دیا۔ ستیش چسکیاں لے کر برائٹی پہنے لگا۔ شیلانے اپنی بانٹیں اس کی گردن میں جمائیں کر دیں۔ ستیش نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر کھینچا تو وہ اس کی آغوش میں آگئی۔ ستیش کے ہاتھ اس کے جسمانی نشیب و فراز پر بیٹھ گئے۔ شیلانے خود سپردگی کے جذباتی انداز سے ستیش کو دیوانہ کر دیا طوفان کا زور کچھ دیر بعد تھما تو دونوں ہی ہلکان ہو چکے تھے۔

اجا تک ستیش کا موبائل فون بجے لگا۔ ستیش شیلانے کو ایک طرف ہٹا کر کمرے کے کونے میں چلا گیا اور دونوں پر انگلی رکھ کر شیلانے کو چپ رہنے کا کہہ کر کال ریسیو کی۔ "ستیش۔" راجہ بول رہا ہوں۔ "جس اپارٹمنٹ میں اپنی گرل فرینڈ شیلانے کے ساتھ تم موجود ہو، وہاں ناٹم بم ہے اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو بھاگو اور سوناپنے اکا وکافوظ کسی ٹھکانے پر مت جانا کیونکہ وہ سب ٹھکانے میرے نشانے پر ہیں جلدی بھاگو۔" دوسری طرف سے راجہ کی سرد آواز سنائی دی۔ تو ستیش موبائل فون جب میں ڈال کر باہر بھاگنے لگا۔ "ارے روکو تو کسی کیا ہوا؟" شیلانے اسے آواز دی وہی رہی۔

ستیش کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ہر ظالم اپنی زندگی سے بہت پیار کرتا ہے۔ دوسروں کی زندگیوں سے ہنس کر کھیلتا ہے۔ جب اپنی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے تو گیدڑ کی طرح بھاگتا ہے وہ بھی جان بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا اس کا رخ آبادی سے باہر شہر سے کافی دور آنے پر ایک طرف ایک ریسٹورنٹ دیکھ کر گاڑی روکی اور باہر نکل کر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا سیرے کو چائے کا آرڈر دیا چائے اس نے ہونٹوں سے لگائی تھی کسی کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اسکرین پر نظر آنے والے نمبر کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ راجہ کا نمبر تھا۔ "ہیلو" کال ریسیو کر کے وہ گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

"چائے پی رہے ہو۔ بھاگو تم میرے نشانے پر ہو۔" دوسری طرف سے راجہ کی آواز سن کر اس کے ہاتھوں سے چائے سے بھرا کپ چھوٹ کر گر کر گرم چائے کے چھینٹے اس کے کپڑوں پر گرے وہ ادھر ادھر گر پڑا دیکھنے لگا ریسٹورنٹ میں موجود تمام افراد اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ ان میں راجہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس کی گاڑی سمیت ریسٹورنٹ کے باہر پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی خالی سیٹیں دور سے نظر آ رہی تھیں وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھا کہ راجہ اسے کہاں سے اور کیسے دیکھ رہا ہے جانتا تھا گھبراہٹ بھی ٹھیک نہیں؟ "ستیش یہ کیا لوگوں طرح ویدے پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہے ہو بھاگو جلدی ورنہ کوئی چلا دوں گا۔" دوسری طرف سے راجہ کی آواز سنائی دی وہ موبائل فون جیب میں ڈال کر اپنی کار کی طرف بول بھاگا جیسے اس کے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں بلائیں لگی ہوں۔ راجہ اس کے اعصاب پر بھوت کی طرح سوار ہو چکا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا مگر اس سنان سڑک پر دوڑ کر تک کوئی گاڑی نہ تھی۔

اجا تک ایک ایک خیال کے تحت اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا اور ارجن کو کال کرنے لگا۔ "پتا چلی مجھے بچائیں۔" راجہ پھر میرے پیچھے پڑا ہے۔" دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی ستیش چلا یا اور ارجن کو بتانے لگا کہ راجہ نے اسے کیسے ہراساں کر رکھا ہے۔ "گھبراؤ مت گاڑی چلا تے رہو۔ میں جلدی تم تک پہنچتا ہوں۔ تمہاری جدید ترین گاڑی میں ٹریک نصب ہے تم اس گاڑی میں جہاں بھی جاؤ گے یہ ٹریک تمہاری نشاندہی کر رہا ہے گا۔ اپنا موبائل فون جیب میں رکھ لیا اس کی گاڑی اب میدانی علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی چلا تے چلا تے تھک چکا تھا اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور نیچے اترا جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا یہی تھا کہ اس کا موبائل فون بج

اٹھا۔ موبائل فون جیب سے نکالنے میں اس کا دل خوف سے تیزی سے دھڑکنے لگا اسکرین پر راجہ کا نمبر تھا اس نے کال ریسیو کی۔ "کلی نفا میں سگریٹ پی رہے ہو۔" دوسری طرف سے راجہ کی بات سنتے ہی خوف سے لرز اٹھا سگریٹ اس کے ہونٹوں سے چھوٹ کر گر گیا وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا راجہ کہیں بھی نہ تھا۔ "ادھر ادھر مت دیکھو اپنی آنکھیں بند کر لو، میں تمہیں نظر آ جاؤں گا۔" ستیش نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ ابھی پسلیاں تو ڈک رہا ہے آجائے گا۔ اس کے خوف زدہ ہونے کی وجہ گردن کی پشت پر محسوس ہونے والے لوہے کی ٹھنڈک تھی اسے پسلی کی نال پیچانے میں مغالطہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ساری زندگی ان کھلونوں سے کھیلتے ہوئے گزری تھی۔

"اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" راجہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر آدھ مہرے ہوئے راجہ کے حکم کی تعمیل کی۔ "اپنے ہولسر سے پستول نکال کر پھینک دو۔" راجہ نے دوسرا حکم دیا۔ ستیش نے اپنے ہولسر سے پستول نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ ستیش ابھی تک حیرت و استعجاب کے عالم میں تھا کہ راجہ اچانک یہاں کیسے پہنچ گیا؟ "اب میری طرف گھوم جاؤ۔" راجہ چند قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ستیش راجہ کی طرف مڑا۔ راجہ کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ اس کی طرف تھا۔

"تم یہاں تک کیسے پہنچے؟ میں پورے مقام تھا کوئی بھی گاڑی میرے تعاقب میں نہ تھی۔" ستیش نے حیرت سے پوچھا۔

"جب تم اپنی گرل فرینڈ کے اپارٹمنٹ میں تھے۔ میں تمہاری گاڑی کی عقبی نشست کے پاس سمٹ کر لیٹا ہوا تھا چونکہ تم گھبرائے ہوئے تھے اس لئے اس طرف توجہ نہ دے سکے آج میں نے کہیں بھی بم فٹ نہیں کیا تھا۔ یہ دھوک صرف تمہیں شیلانے کے اپارٹمنٹ سے باہر لانے کے لئے دیا تھا۔" راجہ بولا۔

"مخرم ہو کون اور تم سے کیا چاہتے

ہو؟" ستیش نے پوچھا۔

"میں تمہارے باپ ارجن کی پہلی بیوی راوہا سے ہوں، ارجن نے پیدا ہوتے ہی مجھے جھاڑیوں میں پھنکوا دیا تھا۔ میری ماں کا قتل بھی ارجن نے کیا تھا۔ تم دونوں باپ بیٹے نے کئی معصوم لڑکیوں کو بلی کے نام پر قتل کیا۔ کتنے لوگوں کے گھر اجاڑے اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس جگہ کو غور سے دیکھو یہاں سے کچھ فاصلے پر بابا جی کا آستانہ ہے اسی آستانے میں تمہاری بہن مریم اور سلمان رہتے ہیں۔" راجہ نے کہا۔

"زیادہ بولنے سے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھ لو۔" راجہ نے پوچھا کون ہے؟" ستیش بولا اور راجہ نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ ستیش کی چال تھی جو کامیاب رہی اس کے پاؤں کی ٹھوکر راجہ کے پستول والے ہاتھ پر پڑی پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس کے سینے پر ستیش کی فرنیٹ کک لگی۔ راجہ پشت کے بل گر گیا۔ اور گرتے ہی اٹھا اس پر ستیش کے گھونٹنے نے راجہ کی مزاج چربی کی۔ گھونٹنے اس کی پستانی پر لگا راجہ لڑکھڑایا۔ ستیش جسمانی طور پر راجہ سے طاقتور تھا اس کے علاوہ مارشل آرٹ میں راجہ سے زیادہ ماہر تھا۔ راجہ کے سینے پر سائڈ کک لگی۔ وہ گر گیا اور ستیش اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ستیش نے راجہ کو گھونٹوں کی زد پر رکھ لیا۔ راجہ کا ذہن پکڑنے لگا۔ اس نے پکڑتے ہوئے ذہن کے ساتھ مزاحمت کی اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی ستیش کی دائیں آنکھ میں جا گئی۔ ستیش نے چیخے ہوئے زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی آنکھ پھوٹ چکی تھی۔ راجہ نے درد سے بے حال ستیش کو اپنی ٹانگوں سے اچھالا وہ ایک طرف جا کر اتر کر لڑکھڑکے ہوئے اٹھا اور تڑپتے ہوئے ستیش کو اپنے پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ستیش چند بار مار کھا تار ہا۔

اجا تک نیچے پڑا پستول ستیش کے ہاتھ میں آ گیا ستیش نے فریگر دیا، گولی راجہ کے بازو کو چھوئی ہوئی گزر گئی۔ راجہ کے بازو سے خون بہنے لگا۔ ستیش پستول ہاتھ میں تھا سے کھڑا ہو گیا۔ اور فریگر دیا دیا۔ راجہ نے



ایک طرف چھلانگ لگائی تیش کا نشانہ خطا ہو گیا۔ ویسے بھی ضائع ہوئے والی آنکھ کی وجہ سے تیش کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ چھوٹ جانے والی آنکھ کا گڑھا تیش کو بھانک بنا رہا تھا۔ اس نے راجہ کا نشانہ لے کر دوبارہ ٹرگر دیا۔ راجہ نے اس پر چھلانگ لگادی۔ گولی چھلانگ لگاتے ہوئے راجہ کے شانے پر لگی تو راجا چپٹا ہوا تیش کے اوپر گرا۔ اس نے ایک ہاتھ سے تیش کا پھل دالا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ کا زور دار گھونسہ تیش کی زخمی آنکھ پر مارا تو تیش کے حلق سے نکلنے والی چیخ بہت بھیاںک تھی پھل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا راجہ نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور نیچے گرے تیش کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور دوسرے ہاتھ سے تیز دھار خنجر اس کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ ”دور دروں کو جانوروں کی طرح ذبح کرنے والا آج خود ذبح ہو چکا تھا۔“

راجہ تیش کے اوپر سے اٹھ گیا چند لمحوں تک تیش کا جسم پھڑپھڑتا رہا پھر سارکت ہو گیا۔ تیش کے خون سے راجہ کے کپڑے رنگین ہو چکے تھے۔ راجہ کے زخمی شانے سے خون بہہ رہا تھا وہ خنجر ہاتھ میں تھامے ایک طرف چلے گئے کچھ دور چلنے کے بعد اسے پہاڑی نظر آنے لگی۔

اچانک اپنے پیچھے گاڑی کی آواز سن کر مڑا ایک لینڈ کروزر اس کے قریب رک گیا، راجن، مہاگر اور ایک گرائڈ مل شخص باہر نکلے مہاگر اور راجن خالی ہاتھ تھے جبکہ اس شخص نے رائل تھامس کی تھی راجہ نے نکلی کی سی تیزی سے خنجر رائل بردار شخص کی طرف پھینکا خنجر رائل بردار کے سینے میں دل کے مقام پر پوسٹ ہو گیا اس کے منہ سے آواز نکل نکلی۔ وہ مردہ چھٹکی کی طرح پٹ سے گرا۔ مہاگر نے زمین سے مٹی اٹھا کر کچھ پڑھ کر راجہ پر پھینک دی راجہ اپنی جگہ پر سارکت ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ راجہ نے آگے بڑھنا چاہا مگر مل بھی نہ سکتا اسے

یوں لگا کہ جیسے وہ خنجر کا بن چکا ہے۔“ راجہ میری مرضی کے بغیر اب تو مل بھی نہیں سکتا صرف بول سکتا ہے محسوس کر سکتے ہو۔“ خنجر اور چلا سکتے ہو وہ بھی اس لئے کہ تیری چیخ پکار سے ہمیں شافی ملے گی۔“ مہاگر وشیطانا تو قبہہ لگاتے ہوئے بولا۔

ارجن آگے بڑھا اور راجہ کے زخمی شانے پر گھونسہ رسید کیا تو راجہ کے جسم میں تکلیف کی شدید لہر اٹھی وہ چیخ پڑا۔ ”اور دوسرے چیخ نیچے تیری چیخوں سے شافی ملے گی، تو نے مجھے تباہ و برباد کر دیا تو میرے بیٹے کا ہتھیار ہے۔“ ارجن چلا یا۔

”اور تم کون ہو کچھ پتہ ہے تمہیں اپنے ہر ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔“ نیچے میری ماں کی گود سے چھین کر مرنے کے لئے جہاز یوں میں پھینک دیا میری ماں کو زندگی سے محروم کر دیا۔ اور نہ جانے کتنے ہی گھر ختم نے اجاڑے ہیں۔ آج تمہارا یوم حساب ہے۔“ راجہ غصے سے بھناتے ہوئے بولا۔

”راجہ اب تو کچھ نہیں کر سکتا، یہاں سے ہلنا بھی تیرے بس سے باہر ہے، اب جو کچھ کریں گے ہم کریں گے۔“ ارجن غصے سے پھنکارتے ہوئے بولا اور راجہ کے پیٹ پر زور دار لات ماری، وہ چیخا ہوا زمین پر گرا اب ارجن راجہ کے جسم پر ٹھوکریں مار رہا تھا ہر ٹھوکر پر راجہ کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ ہلنے چلنے اور حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔

”راجہ تیرے بعد اس پہاڑی والے بڑھے کی باری ہے۔ اب کون تجھے بجائے گا، کس میں ہمت ہے جو آج تجھے بجائے۔“ مہاگر کے لہجے میں غرور تھا۔

”مہاگر زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میرا اللہ مجھے بجائے گا۔“ راجہ تکلیف کی شدت سے دانت بھینچتے ہوئے بولا۔ ارجن نے نیچے پڑے شخص کے سینے سے خنجر نکالا اور راجہ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ”راجہ اس خنجر کو پچان اسی خنجر سے تو نے تیش کی ہتھیار کی تھی اب یہی خنجر تیری موت کا کارن بنے گا۔“ ارجن کا خنجر دالا ہاتھ بلند ہوا۔ ارجن کی نظریں راجہ کے

سینے پر جم گئیں۔

”راجہ بلا اپنے خدا کو آج، جو تجھے بچائے۔“ ارجن خنجر دالا ہاتھ بلند کئے کیواس کے جا رہا تھا۔ راجہ کی نظریں ارجن کے ہاتھ میں موجود خنجر پر جمی تھیں اس نے سوچا۔ ”کیا میں اپنی ماں کا انتقام لئے بغیر اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔“

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ موت اس کے سر پر کھڑی تھی۔

اچانک بابا کی آواز سنائی دی۔ ”ظالمو اب بھی وقت ہے ظلم سے ہاتھ روک لو۔“ راجہ نے آواز کی سمت دیکھا کچھ بابا یہ جان کر اسے خوش ہوئی کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتا ہے، اس نے با آسانی گردن موڑ کر بابا کو دیکھا۔ بابا ان سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، راجہ نے ارجن کو لینے لینے لات رسید کر دی ارجن الٹ کر گرا، راجا گمگماتے قدموں سے کھڑا ہو گیا، مہاگر کے جادو کا اثر راجہ پر سے ختم ہو چکا تھا، یہ بابا کا کمال تھا، بابا کے قریب مریم اور سلمان اور بہت سے عقیدت مند کھڑے تھے، راجہ کے زخموں سے ٹھیس اٹھ رہی تھیں خاص کر شانے میں لگنے والی گولی کی تکلیف بہت زیادہ تھی، راجہ اب تک اپنی قوت ارادی کے سبب ہوش میں تھا۔ ارجن بابا کو دیکھ کر خوف کے مارے مہاگر کے پہلو میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”اچھا ہوا تو خود ہی آ گیا اب مرنے کیلئے تو بھی تیار ہو جا۔“ مہاگر نے کہا۔

”دیکھ بھاری ہمارا ہاتھ سے کوئی جھکنا نہیں، کوئی بھی مذہب بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آئندہ کیلئے ظلم سے توبہ کر لے اور یہاں سے چلا جا۔“ بابا نے اسے صہیکی۔

”ابھی سے ڈر گئے دراصل تمہیں پتہ ہے یہاں سب کے سامنے تمہارا کیا حشر ہونے والا ہے۔“ مہاگر بولا۔

”اللہ گواہ ہے میں نے تو بہت چاہا کہ ہمارے درمیان تصادم نہ ہو مگر تیری سمجھ میں میری بات نہیں آئی اب تو اپنے دل کی حسرتیں پوری کر لے۔“ بابا نے کہا۔

”یہ دیکھ میری طاقت۔“ مہاگر نے کچھ پڑھ کر میدان میں پھونک ماری تو کئی خوناک صورت مخلوق میدان میں ایک طرف کھڑی تھیں اس مخلوق میں پڑیل، ڈھانچے اور دیگر کربہ صورت مخلوق تھی۔

سلمان، مریم اور دیگر عقیدت مند اس خوناک مخلوق کو دیکھ کر کانپنے لگے۔ مہاگر نے دوبارہ پھونک ماری تو وہ مخلوق غائب ہو گئی۔ اب بھی وقت ہے تو نے میری طاقت دیکھی کہ میں کتنا کشتی شانی ہوں میرے آگے گھٹنے یک دے میں تجھے معاف کر دوں گا۔“ مہاگر دیکر بھرے لہجے میں بولا۔

بابا نے مسکرا کر اپنی شہادت کی انگلی سے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا تو بے قوی جھیل جنوں سے پوری پہاڑی بھر گئی وہ جن اتنے لمبے چوڑے تھے کہ میدان سے دور پہاڑ میں صاف دکھائی دے رہے تھے بابا نے اشارہ کیا تو جن غائب ہو گئے۔

یہ دیکھ کر مہاگر کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا اس کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ اس کی پریشانی ظاہر کر رہا تھا کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا پھر کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو بڑے بڑے چٹائی پتھر جو گیند کی طرح گول تھے لڑھکتے ہوئے بابا کی طرف بڑھنے لگے تو بابا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو لڑھکتے ہوئے پتھر غائب ہو گئے۔

مہاگر کے تمام ہیر بابا کے ہاتھوں ختم ہو چکے تھے۔ بابا نے اس کی برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا اب اس کے پاس بھاگنے کے لئے بھی کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی مثال اس کے سامنے تھی۔

یہ آخری اور خطرناک وار تھا۔ مہاگر نے خنجر سے اپنی گردن پر ہلکا سا ٹک لگا یا اور پتے ہوئے خون سے خنجر کو بھگونے لگا۔ اس کی گردن سے نکلنے والا خون خنجر کو بھگو چکا تھا۔ مہاگر نے منتر پڑھ کر خنجر پر پھونک ماری اور بابا کی طرف پھینک دیا۔ وہ انتہائی خطرناک ترین وار تھا کسی صورت خالی نہ لونا تھا۔ مخالف کی جان لینے کی ہی چھوڑا تھا۔ اگر کسی وجہ سے مخالف خنجر

جاتا تو عامل کی خبر نہ ہوتی اس عمل کی ناکامی کی قیامت  
عامل کو اپنی جان دے کر چکانی پڑتی تھی۔

وہ ایک خنجر نصف درجن خنجروں میں تبدیل  
ہو چکا تھا اور وہ نصف درجن خنجر بکلی کی سی تیزی سے بابا  
کی طرف لپکے۔ بابا نے فوراً اپنی جیب سے تیغ کے  
چند دانے نکالے اور وہ دانے تیزی سے خنجروں کی سمت  
پھینک دیئے تیغ کے دانے جیسے ہی نصف درجن خنجروں  
سے ٹکرائے خنجر پلٹے اور تیزی سے مہارگو کی طرف  
لپکے۔ مہارگو نے دار ناکام ہوتا دیکھ کر اپنے بچاؤ کے  
لئے کوئی متر بڑھنا چاہا مگر اس کا ٹھیکل ختم ہو چکا تھا۔  
نصف درجن خنجر مہارگو کے جسم میں پیوست ہو گئے  
۔ مہارگو چیخا ہوا جہنم رسید ہو گیا۔

مہارگو کو خنجر نکلنے دیکھ کر راجن نے اپنے ہاتھ  
میں موجود خنجر بڑی مہارت سے راجہ کی طرف پھینکا،  
خنجر اڑتا ہوا آیا اور راجہ کے سینے میں پیوست ہو گیا، راجہ  
کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑایا مگر گرائیں ہیبت  
کر کے خنجر کا دستہ پکڑا اور کھینچ کر باہر نکال لیا راجہ نے  
اپنے ذہن پر چھانے والے اند میرے کو جھٹکا۔ اللہ اکبر  
کا نعرہ بلند کر کے خنجر پوری طاقت سے راجن کی طرف  
پھینک دیا۔ خنجر اڑتا ہوا راجن کے ٹھیک دل کے مقام  
پر پیوست ہو گیا، راجن کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ ساکت  
ہو گیا۔ اسے مرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگا تھا۔

راجہ جواب تک قوت ارادی کے سبب کھڑا تھا  
لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر گیا اس کے سینے سے خون تیزی  
سے بہہ رہا تھا۔ بابا سلمان اور مریم راجہ کی طرف لپکے  
مریم نے راجہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”یہ کیا ہو گیا راجہ؟“ مریم بلک بلک کر زور ہی تھی  
اور سلمان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے راجہ کا چہرہ بلدی  
کی طرح زرد پڑ رہا تھا ہونٹ ایک دم نیلے پڑ رہے تھے  
آنکھوں کے آگے اندھیرا آ رہا تھا ”راجہ..... راجہ ہوش  
میں آؤ جہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ مریم روتی ہوئی چلائی۔  
راجہ نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، اس کی آنکھوں  
کے باہری گوشے نم ہوئے پھر اس میں دد موٹے موٹے

آنسو نکل کر اس کے گال پر ریگ گئے، مریم نے روتے  
ہوئے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”نہیں میرے بھائی  
روتے نہیں۔“

”میں موت کے ڈر سے..... نہیں رورہا۔۔۔ یہ تو  
خوشی کے..... آنسو ہیں۔۔۔ کہ میرے اپنے میرے  
قریب موجود ہیں۔۔۔ دنیائے تو مجھے ٹھکرایا تھا  
میں سب کے لئے قابلِ نفرت تھا۔ لیکن تم نے سلمان  
اور بابا نے مجھے محبت کا احساس دلایا ہے۔“ وہ تھوڑی  
دیر خاموش رہا اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے ایک  
دوسرے کے اوپر بچایا ہوا تھا شاید تکلیف ضبط کرنے کی  
کوشش کر رہا تھا، اس نے اپنے ایک ہاتھ میں مریم اور  
دوسرے میں سلمان کا ہاتھ تھا، ان دونوں کے ہاتھوں  
کو باہم ملا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ”میں تم دونوں کو خوش  
دیکھنا چاہتا ہوں۔ سلمان مریم کا خیال رکھنا، دین حق پر  
ثابت قدم رہنا۔ یہ زندگی اللہ کی امانت ہے اسے اللہ کی  
عبادت، میں گزار دیتا۔“ راجہ بولتے بولتے تھک  
کر رک گیا۔

”راجہ بیٹے! صرف ہم تینوں ہی نہیں اور بہت  
سے بھی تمہارے لئے اداس ہیں، اپنے دائیں سمت  
سر گھما کر دیکھو۔“ بابا نے کہا تو بابا نے آہستگی سے دائیں  
طرف سر گھمایا، پہاڑی کے سینکڑوں جن ایک طرف  
اداس کھڑے تھے۔ ”سنو راجہ سو سال زندہ رہنے سے  
بہتر ہے کہ ایک دن میں ایسا کام کر جاؤ کہ دنیا ہمیشہ  
تمہیں یاد رکھے اور تم نے ایسا ہی کیا ہے۔“ بابا جی بولے  
تو۔ راجہ مسکرایا۔

”مریم وہ دیکھو۔ دور۔۔۔۔۔ آسمانوں۔۔۔  
میں میری ماں پائیں دا۔۔۔۔۔ کئے میرا۔۔۔۔۔ انتظار۔۔۔  
کر رہی ہے۔ اللہ حافظ“ پھر راجہ نے نکلے پڑھا اور اس کی  
گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مریم اور سلمان اس سے  
لپٹ کر رونے لگے وہاں موجود تمام افراد اور تو اور جنوں  
کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

